اقبال اور مشاہیر کشمیر

کلیم اختر

اقبال
اور
مشاہیر کشمیر

کلیم اختر

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
ناظم،
اقبال اکادمی پاکستان
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

طبع اول : ۱۹۹۷ء
تعداد : ۵۰۰
مطبع : طیب اقبال پرنٹرز، لاہور
قیمت : ۱۵۰

محل فروخت : ۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ لاہور فون : ۷۳۵۷۲۱۴

انتساب

اپنی اہلیہ —

فرحت

اور بچوں — حفیظ، نگہت اور نزہت

کے نام

ترتیب

صفحہ

دیباچہ	۷
ضرب کلیم	۱۱
۱۔ اقبال اور شاہ ہمدان	۱۳
۲۔ اقبال اور شیخ نورالدین رشی ولی	۲۷
۳۔ اقبال اور سلطان شہاب الدین	۳۹
۴۔ علامہ محمد اقبال اور سلسلہ رینشیت	۴۵
۵۔ اقبال اور غنی کاشمیری	۵۷
۶۔ علامہ محمد اقبال اور میاں محمد بخش	۷۳
۷۔ مولوی سید چراغ شاہ اور علامہ اقبال کے والد ماجد	۸۱
۸۔ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیری	۸۷
۹۔ علامہ محمد اسد اور علامہ اقبال	۱۰۳
۱۰۔ علامہ محمد اقبال اور مجدد الکشامرہ فوق	۱۱۵
۱۱۔ مہجور کاشمیری اور اقبال	۱۲۵
۱۲۔ علامہ محمد اقبال اور چودھری خوشی محمد ناظر	۱۳۵
۱۳۔ اقبال اور خواجہ عبدالصمد ککرو	۱۴۷
۱۴۔ علامہ اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور کشمیر	۱۵۷

۱۵۔	علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین	۱۶۷
۱۶۔	علامہ اقبال، ڈاکٹر تاثیر اور کشمیر	۱۷۹
۱۷۔	علامہ محمد اقبال اور صاحبزادہ محمد عمر (نور الٰہی)	۱۸۹
۱۸۔	اقبال اور خاں صاحب منشی سراج الدین احمد	۲۰۵
۱۹۔	علامہ محمد اقبال اور خاں صاحب خورشید احمد	۲۱۵
۲۰۔	علامہ اقبال اور میاں امیر الدین	۲۲۷
۲۱۔	اقبال اور سید محسن شاہ	۲۳۷
۲۲۔	کشمیر اور اقبال	۲۴۳
۲۳۔	علامہ محمد اقبال کا سفر کشمیر	۲۵۱
۲۴۔	اقبال اور آزادی کشمیر	۲۶۷
۲۵۔	علامہ محمد اقبال اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی ۱۹۳۱ء	۲۸۱
۲۶۔	علامہ محمد اقبال اور دوسری گول میز کانفرنس و تحریک کشمیر	۲۹۳
۲۷۔	علامہ محمد اقبال کے خطوط۔ کشمیری مشاہیر کے نام	۳۰۵
۲۸۔	علامہ محمد اقبال اور شیخ عبداللہ	۳۲۱
۲۹۔	اقبالیات کا کشمیری مترجم۔۔ سید غلام قادر اندرابی	۳۳۹
۳۰۔	شعرائے مقبوضہ کشمیر کا علامہ اقبال کو خراج عقیدت	۳۴۷

دیباچہ

جناب کلیم اختر کی کتاب اقبال اور مشاہیر کشمیر ان شخصیات کے تفصیلی تعارف پر مشتمل ہے جن کا تعلق اقبال اور کشمیر دونوں سے گہرا رہا ہے اور جنہوں نے کشمیر کی تاریخ و ثقافت اور آزادی کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شاہ ہمدان، نور الدین رشی، سلطان شہاب الدین، میاں محمد بخش اور غنی کاشمیری کا تعلق کشمیر کے اس نوع کے بزرگوں سے ہے جنہوں نے کشمیر میں مذہب اسلام کے فروغ، تصوف کے پھیلاؤ اور شعر و ادب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا انور شاہ کشمیری ہمارے ان علماء میں سے ہیں جنہیں اقبال نے خود دعوت دی کہ وہ تدوین فقہ کے سلسلے میں ان کے ساتھ مل کر کام کریں جو قرآن و حدیث کے عالم بے بدل تھے اسی طرح کچھ ماہرین تعلیم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر رفیع الدین جن کا کشمیر اور اقبالیات کے ثقہ شارح ہونے کے حوالے سے بڑا مقام ہے اس کتاب میں شامل ہیں یوں یہ کتاب رجال اقبال اور کشمیر کا معلومات افزا مرقع ہے۔ اس وقت جب کہ تحریک آزادی کشمیر اپنی کامیابی کے آخری مراحل میں داخل ہو گئی ہے۔ تحریک آزادی کشمیر کے ایک عظیم داعی علامہ محمد اقبال اور کشمیر سے متعلق شخصیات کا مطالعہ کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور آزادی کشمیر کے پس منظر کو سمجھنے میں ممد و معاون ہو گا کیونکہ اس میں ایسے افراد کا بھی تذکرہ ہے جو اقبال کے ہم عصر اور تحریک آزادی کشمیر میں اقبال ہمرکاب تھے۔

جناب کلیم اختر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کشمیریات سے ان کا تعلق نہایت گہرا ہے۔ آپ شعبہ کشمیریات پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وزٹنگ پروفیسر اور بورڈ آف سٹڈیز

کے رکن ہیں۔ اقبال کی طرح آپ بھی کشمیری نژاد ہیں اور مرے کالج سیالکوٹ کے فارغ التحصیل ہیں۔ اسلام، اقبال، قائداعظم اور کشمیر کے موضوعات پر جس محنت اور لگن سے انہوں نے سالہا سال سے لکھا ہے کوئی بھی ان کا مدمقابل نہیں۔ کلیم اختر ایک ادیب، صحافی اور مورخ ہیں۔ آپ طویل عرصہ تک نیشنل پریس ٹرسٹ کے جنرل مینجر رہے ہیں، یوں انہیں صحافت اور انتظامی امور دونوں پر دسترس حاصل ہے۔

کلیم اختر جموں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد میاں غلام علی مرحوم ریاست کے برگزیدہ افراد میں شمار ہوتے تھے اور اُن کا ریاست جموں و کشمیر کی تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ کلیم اختر نے ابتدائی تعلیم جموں اور سری نگر میں حاصل کی اور ترک وطن کے بعد سیالکوٹ کے مرے کالج میں داخلہ لیا۔ مرے کالج سیالکوٹ میں ان کے اساتذہ ڈاکٹر پروفیسر جمشید علی راٹھور اور پروفیسر محمد الدین بھی تھے جو علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن کے شاگرد تھے۔ کلیم اختر نے ڈاکٹر جمشید علی راٹھور کی یادداشتوں کو قلم بند بھی کیا۔ جن سے سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب دانائے راز میں استفادہ کیا ہے۔

جناب کلیم اختر کے اقبال کے ہم جلیسوں سے گہرے مراسم رہے ہیں۔ سید نذیر نیازی، میاں امیر الدین اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام ان میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، میاں امیر الدین سے ان کے تعلقات زیادہ تھے۔ چنانچہ میاں صاحب کی بزم احباب میں آپ باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے جن میں معروف ماہر اقبالیات اور اقبال اکادمی پاکستان کے سابق ڈائریکٹر محترم پروفیسر مرزا محمد منور بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر وحید قریشی، ڈائریکٹر اقبال اکادمی سے بھی ان کے قریبی تعلقات ہیں۔ آپ کے دوستوں میں خان صاحب خورشید احمد اور ڈاکٹر رفیع الدین کے فرزندان، طالب خورشید میر اور صلاح الدین محمود کے نام بھی شامل ہیں۔ تحریک آزادی کشمیر کے بعض نامور قائدین چودھری غلام عباس، میر واعظ محمد یوسف شاہ سردار گوہر رحمن اور مسٹر کے ایچ خورشید بھی کلیم اختر صاحب کو تحریک آزادی کشمیر کا اہم کارکن تصور کرتے تھے۔ پروفیسر محمد عثمان مرحوم تو کلیم اختر کے ہم وطن اور عزیز دوست تھے۔ اقبالیات دونوں کا خاص مضمون رہا۔

کلیم اختر کو اقبال اور کشمیر سے جو عشق ہے یہ کتاب اس کا خوبصورت عکس ہے۔

آپ آج کل روزنامہ نوائے وقت لاہور سے منسلک ہیں۔ ضرب کلیم کے نام سے کالم لکھ رہے ہیں۔ جناب مجید نظامی مدیر نوائے وقت کے مداح ہی نہیں اُن کے ہم قدم اور ہم آواز ہیں۔ امید ہے اقبال اور مشاہیر کشمیر کا مطالعہ قارئین کو تحریک آزادی کشمیر کے بعض پہلوؤں سے آگاہی کا سبب بنے گا اور قارئین اس محققانہ کاوش سے اس تپش کو بھی محسوس کر سکیں گے جو اقبال اور کشمیر سے ہمارے دوست جناب کلیم اختر سچے جذبے اور لگن کے ساتھ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید عشرت

لاہور

ضربِ کلیم

"اقبال اور مشاہیر کشمیر" میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے ریاست جموں و کشمیر کی ان شخصیتوں پر لکھے جنہیں علامہ محمد اقبال کی قربت کا شرف حاصل رہا اور ان کشمیری نژاد عاشقانِ اقبال پر بھی خامہ فرسائی کی جن کی علامہ محمد اقبال سے عقیدت و ارادت کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ان میں ایسے مضامین بھی ہیں جنہیں رجالِ اقبال کہا جاتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو تحریکِ حریتِ کشمیر میں علامہ محمد اقبال کے کردار اور خدماتِ جلیلہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے جن کشمیری مشاہیر کو خطوط لکھے اور ان کی ادبی، علمی اور سیاسی رہنمائی فرمائی ان کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور علامہ محمد اقبال کے مکاتیب بھی شامل کئے گئے ہیں۔ علامہ محمد اقبال کو کشمیر اور اہلِ کشمیر سے جو خلوص اور لگاؤ تھا وہ ان کا ایک فطری جذبہ اخوت تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کا مسکن کشمیر تھا اور ان کا خمیر اس ارضِ وطن سے اٹھا تھا اور وہ اس بات پر نازاں تھے

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر

علامہ محمد اقبال نے کشمیری عوام کی آزادی اور حرمت کے لیے جس جذبہ اور جوشِ عمل سے کام لیا وہ ہر اعتبار سے مثالی ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہے۔ اس کتاب کے باب تحریکِ حریتِ کشمیر میں علامہ کے فعال اور موثر کردار کے کئی پوشیدہ گوشوں کو وا کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں آپ پہلی اور آخری بار کشمیر آئے اور چند ہفتے قیام فرمایا ــــ اس سفر اور قیام کی خوشگوار یادیں اور دلنواز محفلوں اور عدلیہ میں مصروفیات کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

یہ مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ان سب کا مرکزی کردار علامہ محمد اقبال کی ذات گرامی ہے جو بین الاقوامی انسانیت کے علمبردار بھی تھے۔ کشمیری قوم کے محسن و مربی بھی!

"اقبال اور مشاہیر کشمیر" — کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ ایک تاریخی، سیاسی، ادبی اور علمی دستاویز بن گئی ہے اور وہ لوگ جو تحریک آزادی کشمیر کو سمجھنے یا جاننے کے خواہاں ہیں انہیں ایک ایسا حوالہ مل جائے گا جو ان کے فکر و نظر میں ممد و معاون بن سکے گا — اس میں کئی کشمیری شخصیات رہ گئی ہیں جن کے کوائف اور محمد اقبال سے تعلق کے حوالے حاصل کئے جا رہے ہیں جو آئندہ اشاعت میں شامل ہوں گے۔ (ان شاء اللہ)

جب میں نے ان مضامین کا خاکہ تیار کیا تو اسی وقت ماہر اقبالیات سید نذیر نیازی، پروفیسر محمد سرور جامعی اور پروفیسر محمد عثمان بقید حیات تھے۔ ان سب اہل علم و دانش نے ان موضوعات کو پسند فرمایا اور انہیں جلد مکمل کرنے کی ہدایت کی تھی —

اب یہ تینوں اس کارگہ حیات میں موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے (آمین) والد ماجد میاں غلام علی مرحوم نے بھی ان میں سے کئی مضامین کو پڑھا اور کئی مقامات پر اپنے مشوروں سے نوازا تھا — افسوس یہ کتاب ان سب بزرگوں کی زندگی میں نہ چھپ سکی!

میں ممنون ہوں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وحید عشرت کا جن کی پرخلوص معاونت سے یہ مضامین یکجا ہوئے اور عشق اقبال کا وسیلہ بنے — خدا تعالیٰ ان کو اجر عظیم دے (آمین ثم آمین)

کلیم اختر

اقبال اور شاہ ہمدانؒ

علامہ اقبالؒ ان صوفیائے کرام اور علمائے عظام سے والہانہ عقیدت و ارادت رکھتے تھے جنہوں نے ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں روح محمدی پھونکی اور نامساعد حالات میں دین مبین کی تبلیغ کے لئے صعوبتیں برداشت کیں اور عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے ...!

... چنانچہ علامہ اقبالؒ کے کلام و پیام میں جن بزرگان دین کے لئے کلمائے عقیدت ملتے ہیں ان میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی (شاہ ہمدان) بھی شامل ہیں جو ہمدان (ایران) سے کشمیر تشریف لائے اور اپنی غیر معمولی شخصیت اور دینی و علمی فضیلت سے کشمیر میں اسلام کی شمع روشن کی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کشمیر اُن کو اپنا محسن اور رہبر تسلیم کرتے ہیں۔

دست من گیر یا امیر کبیر
یا امیر کبیر دستم گیر

... آپ کی ذات گرامی قدر میں جلالی اور جمالی دونوں شانیں موجود تھیں۔ آپ عالم باعمل اور اعلیٰ درجہ کے مصنف و محدث بھی تھے اور صوفی، درویش اور شاعر بھی ...! آپ کا پورا نام میر سید علی ہمدانی تھا مگر اہل خطہ آپ کو امیر کبیر۔ شاہ ہمدان۔ اور علی ثانی کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ آپ ۱۲۔ رجب المرجب ۷۱۴ ہجری بمطابق ۱۳۱۴ عیسوی ہمدان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ۔

"... شیخ ابو سعید نے رویائے صادقہ میں حضور سرور کائنات کی زیارت کی تھی۔

اسی خواب میں حضور سرور کائنات ؐ نے شیخ کو بشارت دی کہ وہ بہت جلد علی ہمدانی سے ملیں گے پھر موصوف سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا

"... وہ (علی ہمدانی) میری اولاد میں سے ہو گا۔ پھر ارشاد کیا اگر میں موجود نہ ہوا تو علی بن ابی طالب ہوں گے اور اگر وہ بھی نہ ہوئے تو مشار الیہ ہو گا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! پس وہ کب ہو گا؟

فرمایا... میری ہجرت کے ۷۱۳ سال بعد عراق کے شہر ہمدان میں وہ ستارہ طلوع ہو گا۔ میں نے گزارش کی یا رسول اللہ! میری آنکھوں کے نور، اللہ کے نبی، اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا... علی ہمدانی"[۱]

... حضرت میر سید علی ہمدانی... حضرت علی کرم اللہ وجہ شیر خدا کی اولاد میں سے تھے آپ کے والد بزرگوار کا نام سید شہاب الدین تھا اور سلسلہ نسب سولہ پشتوں سے حضرت علی ابن ابی طالب ؑ کے ساتھ ملتا ہے۔ سید علی ہمدانی کے ماموں علاؤالدولہ سمنانی (م ۷۳۶ ھ) ہمدان کے حاکم تھے اور یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میر سید علی ہمدانی ؒ کی والدہ ماجدہ کا سلسلہ سترہ واسطوں سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتا ہے۔

... میر سید علی ہمدانی ؒ ایک نہایت ہی ذہین و فطین انسان تھے۔ صغر سنی ہی سے رشد و ہدایت کے نشان چہرے سے ہویدا تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت میں آپ کے ماموں حضرت علاؤالدولہ سمنانی کو خاص دخل تھا۔ چنانچہ ابتدائی عمر میں ہی قرآن حکیم حفظ کر لیا اور سلوک کی کئی منزلیں طے کر لیں۔ نہ صرف سلوک کی منازل طے کیں بلکہ غیر ممالک کے طویل سفر بھی کیے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے مرشد شیخ محمود مزدقانی نے حکم دیا کہ تمام دنیا کی سیر کرو اور اولیاء اللہ کی زیارت کر کے اِن سے استفادہ کرو۔ چنانچہ آپ ۲۰ یا ۲۱ برس تک سفر و حضر میں رہے اور تین بار ربع مسکون کی زیارت کی...!

... رسالہ "مستورات" میں سرزمین پاک و ہند کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتا ہے "قوام الدین شاہ ہمدان" کے ہمراہ تھا۔ اور اصحاب کے طعام سے فارغ ہونے کے بعد (جو دور دراز سے آئے تھے) جناب سیادت مآب پر کشف و حضور کی کیفیت طاری ہوئی۔ آنجناب سفر و حضر میں ہمیشہ روبہ قبلہ بیٹھتے تھے۔ آپ نے عالم واقعہ میں دیکھا کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے تھے...!

"... اے فرزند! کشمیر جاؤ اور وہاں کے رہنے والوں کو مسلمان کرو۔ اگرچہ بعض کشمیری مشرف بہ اسلام ہیں مگر کافروں سے بدتر اور مشرک ہیں۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے...

... جب صبح ہوئی تو سیادت مآب نے زبان مبارک سے فرمایا

"ہم کشمیر جائیں گے" قوام الدین کا کہنا ہے کہ جب ہم کشمیر گئے تو دیکھا کہ اِس سرزمین میں ایمان و اسلام ذرہ بھر نہیں، شہر میں پہنچے تو مسجد کی بجائے ہر جگہ بت خانہ نظر آیا۔" (۲)

... آپ کے کشمیر وارد ہونے پر مشہور شاعر سید محمد خاوری نے تاریخ کہی۔ وہ ۷۸۱ ہجری کا زمانہ تھا۔

میر سید علی شہ ہمدان... سیر اقلیم سبعہ کردہ نکو
شد مشرف زمقدمش کشمیر... اہل آں شہر از ہدایت جو
سال تاریخ مقدم اورا... یابی از مقدم شریف او

... آپ نے کشمیر میں محلہ علاؤالدین پورہ میں سید حسین سمنانی کے مکان پر قیام کیا۔ اِس سفر میں آپ کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور وعظ و تبلیغ کے دوران سخت باتیں بھی سننا پڑیں جن میں جابر و ظالم حکمران بھی تھے اور علمائے سو بھی۔ خود فرماتے ہیں۔

"... ہمیں سفر و حضر میں بے شمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ اِن میں سے بعض علماء اور فقہا کے ہاتھوں اور بعض ملوک اور اُمرا کے باعث تھیں اور بعض ہو سکتا ہے کہ ہمارے نفس کی برائیوں کی وجہ سے ہوں اور یہ بلائیں ذات احدیت کی جانب سے ہمارے لئے عطا تھیں۔ اگرچہ بلا کی صورت میں نازل ہوئی...(۳)

... ۷۷۳ ہجری تک آپ ایک عظیم مبلغ اور ممتاز و مقبول مصلح دین کی حیثیت سے ایران سے لے کر کشمیر تک ہر دل عزیز تھے۔ یہ مقبولیت امیر تیمور کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ہمدان نے امیر تیمور کے انسانیت کش مظالم کے خلاف صدائے حق بلند کی تھی اور فرمایا تھا کہ امیر تیمور قرآن کے احکام پر عمل پیرا نہیں۔ چنانچہ امیر تیمور سے اِن کی ٹھن گئی اور نوبت ترک وطن تک آن پہنچی... امیر تیمور یہ چاہتا تھا کہ شاہ ہمدان بھی دوسرے علماء اور صوفیاء کی مانند اس کی اطاعت کریں اور اس کی ہاں

میں ہاں ملائیں مگر اس حق شناس نے جابر و ظالم حکمران کے سامنے سر خم نہ کیا اور وطن کو چھوڑنا گوارا کر لیا کیونکہ اِس میں حکمت الٰہی پوشیدہ تھی۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی اپنی مشہور "نزھتہ الخواطر" میں لکھتے ہیں۔ "ان کے اور امیر تیمور گورگان کے درمیان معنی حکمت پر اختلاف ہوا اور وہ کشمیر چلے گئے۔"

آقائے علی اصغر حکمت "اپنے مقالہ" ذخیرۃ الملوک" میں لکھتے ہیں۔

تیموری کی خونچکاں تلوار کے مقابلے میں مولد اور مسکن کو خیرباد کہا"

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ علامہ اقبالؒ کے ایک دوسرے ممدوح حضرت مجدد الف ثانی سرہندی نے بھی مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے انکار کر دیا تھا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر لی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اُن دو بزرگوں سے اپنی عقیدت و ارادت کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ اُن کی زیارت گاہ عزم و ہمت کے نشانوں پر حاضری بھی دی۔ یہ درست ہے کہ علامہ اقبال ختلان میں حضرت شاہ ہمدان کے روضہ پر نہ جا سکے اور سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دی لیکن علامہ اقبال سری نگر میں اپنے قیام ۱۹۲۱ء میں خانقاہ معلی میں گئے جو حضرت شاہ ہمدان کی یادگار اور ریاست جموں و کشمیر میں تحریک آزادی کی اولین منزل مانی جاتی ہے۔

خانقاہ معلی سری نگر جہاں حضرت شاہ ہمدان درس دیتے تھے محلہ مہاراج گنج میں واقع ہے جسے سلطان قطب الدین نے آپ کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ دراصل یہ وہی جگہ ہے جو شاہ ہمدانؒ کی چلہ گاہ تھی... یہاں پر چند تبرکات بھی موجود ہیں۔ ایک ستون آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمہ کا ہے اور ایک علم اور ایک عصا ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

بعد ازاں مسجد شاہ ہمدان (۷۹۶ - ۸۱۷ھ) کی سلطان سکندر نے توسیع کی۔ اُس عظیم روحانی مرکز پر آیات اور فارسی اشعار کندہ ہیں اور ایک رباعی بزبان اردو بھی درج ہے ؎

شہر کے قلب میں ہے مسجد شاہ ہمدان
جس سے ہر دیدہ مسلم میں ہے نُورِ عرفان
کہ درخشاں ہے ہر اک سمت کلام یزداں
خانہ دل کو ضیاء بخش چراغ ایماں

... سری نگر کے جس محلّہ میں حضرت شاہ ہمدان نے قیام فرمایا اُس جگہ ایک جادوگر برہمن رہتا تھا جس کے قبضہ میں ایک بہت بڑا صنم خانہ تھا جسے راجہ پور ستین نے چھ لاکھ اشرفیاں خرچ کر کے تعمیر کرایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی آمد سے قبل اِس برہمن جادوگر نے پیشن گوئی کر دی تھی کہ وادی میں کوئی بزرگ آنے والا ہے جس سے شرک اور کفر ختم ہو جائے گا چنانچہ جب امیر کبیر شاہ ہمدانیؒ وارد کشمیر ہوئے تو اُس جادوگر کو پتہ چل گیا اور اُس نے آپ کو پیغام بھجوایا کہ براہ کرم یہاں سے چلے جایئے اور میری روزی پر لات نہ ماریں۔ شاہ ہمدانؒ نے اِس کو اپنے لئے ایک چیلنج تصور کیا اور اُس سے مناظرہ اور مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس پر جب مقابلہ ہوا تو جادوگر برہمن اتنا اُونچا اُڑا کہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ برہمن جادوگر کے اِس کمال پر سلطان کشمیر اور عوام ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ اِس پر شاہ ہمدان نے اپنے مرید سید کبیر الدین کو پاس بلایا اور جوتے قریب کرنے کو کہا۔ آپ نے جوتوں کو اشارا کیا جو تیزی سے فضاء میں بلند ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ برہمن جادوگر زمین کی طرف آ رہا ہے اور جوتیاں... اُس کے سر پر پڑ رہی ہیں۔ اِس پر برہمن پریشان ہو گیا اور اُس نے صنم خانہ شاہ ہمدانؒ کی تحویل میں دے دیا جنہوں نے وہاں سے بتوں کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ برہمن جادوگر نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ بت خانے کا سب سے بڑا بت جب اُکھاڑا گیا تو اندر سے دھاگے میں لپٹا ہوا ایک تعویز نکلا جو بھوج پتر پر لکھا ہوا تھا۔ جب وہ تعویز کھولا گیا تو اُس پر بخط جلی کلمہ طیبہ لکھا ہوا پایا گیا... یہ کرامت دیکھ کر برہمن جادوگر نے کلمہ پڑھا اور اُس کے سب حواری بھی مسلمان ہو گئے۔ اُس روز بہ یک وقت ہزاروں انسانوں نے دین اسلام کو قبول کر لیا... !

... برہمن جادوگر سے مقابلہ کا واقعہ تینوں ریشی ناموں کے علاوہ بابا حاجی ادہم کی

کتاب "در حالات اولیائے کشمیر" خواجہ اسحاق کی کتاب "درجات الساوات" میں، اور بہاؤ الدین متو نے ریشی نامہ میں اور بابا نصیب الدین غازی نے نور نامہ میں لکھا ہے۔

بہرنوع جب شاہ ہمدانؒ نے کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھا تو یہاں جہالت و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر سو تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کفر و شرک نے لوگوں کو توہم پرست بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ کی کاوشوں اور مساعی جمیلہ سے نہ صرف کشمیر کے بسنے والے اسلام کے اعلیٰ و ارفع اُصولوں سے روشناس ہوئے بلکہ حکمران خاندان بھی شدید متاثر ہوا چنانچہ آپ ہی کی تحریک و ایماء پر سلطان شہاب الدین نے متعدد مقامات پر قرآنی تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے۔ علامہ اقبال سلطان شہاب الدین کے متعلق فرماتے ہیں۔

عمر ہا گل رخت بر بست و کشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد

حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہ ہمدان کے مواعظ وارشادات ہی کا اثر و ثمر تھا کہ حاکمان کشمیر اُن کے حلقہ درس و ارشاد میں شریک ہوتے اور فیض یاب ہوتے۔ صاحب "تاریخ کبیر" کی روایت کے مطابق آپ نے ایک سو ستر تصانیف باقی چھوڑیں اور یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ کشمیر کے کئی عالموں اور بزرگوں کو آپ کی کئی کتابیں حفظ تھیں۔ اوراد فتحیہ تو کشمیر کے بچے بچے کو حفظ ہے جسے بعد از نماز حلقہ بگوش ہو کر پڑھتے ہیں۔ آپ کی کتابوں میں ایک کتاب "ذخیرۃ الملوک" ہے جو کہ جہاں بانی اور حکمرانی کے اُصولوں پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبالؒ اِس کتاب کے بارے میں منشی محمد الدین فوق کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"... ذخیرۃ الملوک" کے دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ کوئی شخص کشمیر میں اُس کا ترجمہ اُردو زبان میں کر رہا ہے۔ "...

حضرت شاہ ہمدان نے جہاں اسلامیان کشمیر کی روحانی اور باطنی اصلاح کی طرف توجہ دی وہاں اُن کے سماجی۔ معاشی اور عمرانی حالات کو بھی سنوارنے کے لئے کوششیں کیں۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں میں تعلیم و تربیت اور صنعت و حرفت کا شوق پیدا ہوا۔ خاص طور پر دینی مذہبی علوم کو سمجھنے کے لئے مدارس قائم کئے۔ صنعت کے میدان میں شال بافی۔ کلاہ بافی اور دوسری صنعتوں کو شروع کیا جس سے لوگوں میں کام کرنے کی لگن پیدا ہوئی۔ حضرت امیر کبیر کے ساتھ ایران سے جو سادات اور رفیق کشمیر آئے تھے وہ

سب کسی نہ کسی صنعت و حرفت سے آگاہ تھے۔ اُنہوں نے ہی کشمیریوں کو اُن صنعتوں سے روشناس کرایا۔ حضرت امیر کبیر شاہ ہمدان پہلی بار ۷۷۴ھ میں کشمیر آئے۔ دوسری بار ۷۸۱ھ میں آئے اور ۷۸۳ھ تک قیام پذیر رہے۔ تیسری بار ۷۸۵ھ میں تشریف فرما ہوئے اور ۷۸۶ھ کے اواخر میں عمرہ ادا کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ یہ سفر زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ آپ وادی کشمیر میں بحیثیت مجموعی ۶ سال تک رہے اور اِس مدت میں آپ کشمیر میں زبردست اسلامی اور معاشی انقلاب لائے۔ وہ خطہ جو کفر و الحاد کا مرکز تھا توحید کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ "بابر نامہ" میں بابر نے لکھا ہے کہ آپ نے کنر سے دو میل اُس طرف وفات پائی اور ختلان میں دفن کئے گئے۔ اور اُس نے اُس علاقہ کو فتح کیا تو جہاں میر علی سید ہمدانیؒ نے وفات پائی تھی وہاں پہنچ کر طواف کیا۔ ۵؎ (بابر نامہ)

علامہ اقبالؒ کو شاہ ہمدانؒ سے بے پناہ عقیدت وارادت تھی۔ آپ کے انہیں "معمار تقدیر اُمم" "سید السادات" "سالار عجم" "مرشد آن کشور مینو نظیر" اور "میر و درویش" اور "مشیر سلاطین" کے ناموں سے یاد کیا ہے اور اُن کی مساعی جمیلہ کو سراہا ہے جو اُنہوں نے کشمیری قوم کی داخلی اور خارجی حالتوں کو سنوارنے کے لئے سرانجام دیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

خطہ را آں شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب دیں
آفرید آن مرد ایران صغیر
باہنر ہائے غریب و دل پذیر

"جاوید نامہ" جو کہ علامہ اقبالؒ کی عظیم ترین تصنیف ہے اور ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی، میں اقبال نے جس عقیدت سے شاہ ہمدانؒ کا ذکر کیا وہ نظم کے عنوان ہی سے عیاں ہے۔ لکھتے ہیں۔ "زیارت امیر کبیر اور در حضور شاہ ہمدانؒ"

اِس باب میں علامہ اقبالؒ نے شاہ ہمدان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور وہ جب آں سوئے افلاک سیر کو پہنچتے ہیں تو شاہ ہمدانؒ کے حضور پہنچ کر پکار اُٹھتے ہیں۔

مرشد معنی نگاہاں بودہ ای
محرم اسرار شاہاں بودہ ای

اقبال یہ جانتے تھے کہ آپ ہی نے کشمیر کو نئے ہنر اور دل پذیر فن سے ایران صغیر بنایا تھا۔ بقول اقبال" آپ کی ایک نگاہ سے صد گرہیں کھل جاتی تھیں۔ شاعر مشرق قوم کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اُٹھو اِس مرد مومن کی نگاہ سے اپنے روح و قلب کو گرما دو کیونکہ

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں (۲)

شاہ ہمدان" سیدوں کے سردار۔ عجمیوں کے سالار اور اُمتوں کی تقدیر کے معمار تھے۔ امام غزالی" جیسے بزرگوں نے اُنہی کے خاندان سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ اُنہوں نے کشمیر کے باشندوں کو راہ حق دکھا کر مسلمان کیا۔ وہ سردار بھی تھے اور درویش بھی اور بادشاہوں کے مشیر و صلاح کار بھی۔ اُنہوں نے کشمیر کو علم صنعت۔ تہذیب اور دین کی نعمت سے مالا مال کیا۔"

علامہ اقبال" نے "جاوید نامہ" میں اپنی شاہ ہمدان سے عالم بالا میں گفتگو کو قلمبند کیا ہے جس میں اُنہوں نے شاہ ہمدان سے استفسار کیا کہ اگر خدا کی مرضی یہ تھی کہ بندے اِس کی اطاعت کریں تو اُس نے شیطان کیوں پیدا کیا۔؟ جب اُسے معلوم تھا کہ شیطان اُس دنیا میں بدی اور برائی ایسی خوبصورت شکل میں پیش کرے گا کہ بندے خود بخود اُس کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ برائی بڑی دل کش ہوتی ہے اُس لئے کمزور انسان کس طرح اُس سے بچ کر اچھے کام کر سکتے ہیں۔

... شاہ ہمدان نے فرمایا۔ "اے اقبال! تیرے دل میں یہ خیال اِس لئے پیدا ہوا کہ تو انسان کی اُن قوتوں سے واقف نہیں جو پوشیدہ ہیں اور نظر نہیں آتیں۔ بات یہ ہے کہ جو شخص اُن قوتوں سے واقف ہو جاتا ہے جو اللہ تعالٰی نے اُس کی ذات میں چھپا رکھی ہیں تو وہ برائی سے بھی اپنے لئے بھلائی پیدا کر لیتا ہے۔ اللہ تعالٰی نے شیطان کو پیدا کیا ہے اور دیکھنے میں یہ برائی ہے مگر اِس لئے نہیں کہ انسان اُس سے دوستی کرے بلکہ اِس لئے کہ وہ اُس سے جنگ کرے۔ اگر اُس نے ایک طرف شیطان کو پیدا کیا ہے تو دوسرے طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو چیز انسان کے حق میں بری ہے وہ شیطان سے نہیں بلکہ اُس سے دوستی ہے۔ اگر انسان اُس سے لڑے تو یہی برائی اُس کے لئے بھلائی بن سکتی ہے۔ شائد اِس مثال سے یہ بات تیری سمجھ میں آ جائے تو انسان کو تلوار سمجھو اور شیطان کو سان کا پتھر۔ انسان جس قدر اُس کی مخالفت کرے گا، اُس قدر اُس کی پوشیدہ قوتیں چمکیں گی۔ کبھی تو

نے اِس شخص کو دیکھا ہے جو تلوار کو سان پر چڑھاتا ہے۔ اگر وہ تلوار کو سان کا دوست بنا دے یعنی تلوار کو سان کی حرکت کے ساتھ حرکت دے تو قیامت تک تلوار میں دھار نہیں آ سکتی۔ وہ اُس کے خلاف عمل کرتا ہے۔ تلوار کو سان کی حرکت کے خلاف حرکت دیتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تلوار میں دھار پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس لئے جس طرح تلوار سان سے جنگ کرتی ہے اور اُس جنگ ہی کی بدولت کاٹ کرنے والی شمشیر بن جاتی ہے' اِس طرح انسان شیطان سے جنگ کر کے خدا کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے۔ اے اقبال! میں اب تجھے ایک نکتہ سمجھاتا ہوں پوری توجہ سے سن۔ اگر مسلمان دنیا میں دوبارہ عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اُنہیں اِس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انسان دو چیزوں سے مل کر بنتا ہے ایک روح دوسرے تن۔ تن سراسر مٹی ہے اور جان ایک قیمتی جوہر۔ اِس لئے کہ جان کی حفاظت کے لئے جسم کو قربان کرنا زندہ رہنے کی پہلی شرط ہے۔ اگر تو جسم کے کسی حصے کو جسم سے جدا کر دے گا تو وہ تیرے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ یعنی ضائع ہو جائے گا لیکن اگر تو اپنی جان کو اپنے سے جدا کر دے گا تو وہ تجھے پھر حاصل ہو جائے گی۔

علامہ اقبالؒ نے شاہ ہمدانؒ کے حضور جو کچھ عرض کیا اِس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی خود شناسی شر کے ساتھ بر سرپیکار رہنا۔ اور خودی کا استحکام ہے۔

حضرت شاہ ہمدان علامہ اقبالؒ کو حقیقت جسم و روح بتلاتے ہیں کہ روح کا جوہر بے مثل ہے لیکن اِس کی جلا' نمو اور فروغ کے لئے حق پرداختن کی ضرورت ہے کہ کبھی جان دے دنیا بھی زندگی ہے۔ وگرنہ انسانی زندگی خود بھی بڑی پائیدار ہے۔ بقول ڈاکٹر سید اشرف ظفر۔ "مرشد معنی نگاہاں"۔ بہت ہی خوبصورت اصطلاح ہے۔ علامہ اقبال کے افکار میں نگاہ کی خاص اہمیت ہے۔ بالخصوص جب کوئی میر کارواں ہو

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

... نگاہ کے تمام تر جلوے آپ کو سید علی ہمدانیؒ کی جامع اوصاف شخصیت میں نظر آئے۔ علامہ اقبال کے اِس سوال کے جواب میں کہ ہم تو بے نوا و بے سرو ساماں ہیں شاہ صاحبؒ نے اِس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ مشرق و مغرب میں بادشاہی یا تو رضائے

ملت سے حاصل ہوتی ہے۔ یا قوت و طاقت کے بل بوتے پر۔ اُن کے خیال میں دو قسم کے لوگوں کے سوا اور کسی کو باج دینا حرام ہے۔

(۱) ایسا حاکم جو از روئے نص کلام پاک "اولوالامر" ہو۔

(۲) یا تند و تیز صرصر کی مانند جرات آفریں فاتح "خویش باز" بھی ہو... نیز وہ جنگ میں قاہری اور صلح و آشتی میں دلیری کا مظاہرہ کر سکتا ہو۔ اگر یہ صفات حاصل ہو جائیں تو کشمیر کیا چیز ہے برصغیر پاک و ہند اور ایران جیسے ملک بھی خریدے جا سکتے ہیں۔

اسی سیر افلاک کے دوران پیر رومی علامہ اقبالؒ کی ملاقات ایک ایسی شخصیت کے ساتھ کراتے ہیں، جن کے بارے میں فرمایا،

شاعر رنگین نوا طاہر غنی
فقر و باطن غنی ظاہر غنی

یہاں پر ہی علامہ اقبالؒ حضرت شاہ ہمدانؒ سے قصہ درد چھیڑتے ہیں اور فرماتے ہیں ۔

زیر گردوں آدم آدم را خورد
ملتے بر ملتے دیگر چرد
جاں ز اہل خطہ سوزد چوں سپند
خیزد از دل نالہ ہائے درد مند
زیرک و دراک و خوش گل ملتے است
در جہاں تردستی او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خون اوست
در نے من نالہ از مضمون اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است
در دیار خود غریب افتادہ است
دست مزد او بدست دیگراں
ماہی رودش بشست دیگراں
کاروانہا سوئے منزل گام گام

کار او ناخوب و بے اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد
آتشے اندر رگ تاکش فسرد
در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پُردم بودہ است

"... آسمان کے نیچے انسان انسان کو کھا رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو اِس طرح چرتی ہے جس طرح چوپایہ گھاس کو۔ اہل خطۂ کشمیر کے حالات دیکھ کر جان اِس طرح جلتی ہے جس طرح ہرمل کے بیج آگ سے۔ ہمارے دل سے دردناک آہیں اُٹھتی ہیں۔ کشمیریوں کی قوم زیرک اور خوش گلو قوم ہے۔ اِس کی تندرستی اور چابک دستی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ لیکن اِس وقت قوم کا پیالہ اِس کے خون میں لڑھک رہا ہے۔ میری نے میں اِسی کے مضمون کا نالہ ہے۔ چونکہ یہ قوم خودی سے محروم ہے لہٰذا اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہو گئی ہے۔ اُس کے ہاتھ کی کمائی دوسرے کھا جاتے ہیں۔ اِس کے دریا کی مچھلی دوسروں کے جال میں پھنستی ہے اور قوموں کے کارواں قدم قدم منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن اِس کا کام غلط اور کچا ہے۔ اِس کا جذبہ غلامی سے مرچکا ہے۔ اِس کی انگور کی بیل کی رگوں کی آگ بجھ چکی ہے۔ آپ یہ نہ خیال کریں کہ یہ قوم ہمیشہ ایسی ہی تھی اور وہ ہمیشہ ماتھے کو ایسے ہی رگڑتی رہی۔ یہ قوم ایک زمانے میں صف شکن بھی رہی ہے۔ سخت، جانباز اور باہمت بھی رہی ہے۔

حضرت شاہ ہمدانؒ علامہ اقبالؒ (زندہ رود) کو فرماتے ہیں ۔

باتو گویم رمز باریک اے پسر
تن ہمہ خاک است و جاں والا گہر

یعنی حق و صداقت کے لئے انسان کو جان کی بازی لگانی چاہئے۔ وہی جان انسان کی اپنی ہے جو حق و صداقت کے لئے کھیل جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کشمیریوں کی آزادی کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے حضرت شاہ ہمدان اور غنی کاشمیریؒ کے حوالہ سے جو باتیں کہیں وہ آج بھی حرف بہ حرف پوری درست ثابت ہو رہی ہیں۔ کشمیریوں کی آزادی کا مسئلہ اُس مقام پر پہنچا ہے جہاں اُن کے اپنے عمل اور کردار کے علاوہ اور دوسرا راستہ نظر

نہیں آتا۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک ریاست جموں و کشمیر ایک اسلامی ریاست ہے اور وہ اس کے تشخص کی حفاظت اور آزادی کو ضروری جانتے ہیں۔ آپ نے ایک بار فرمایا۔

"... شمال مغربی سرحدی صوبہ کو مستثنٰی کرتے ہوئے حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ حصہ ہے جو مذہبی اور کلچرل حیثیت سے خالصتاً اسلامی ہے اور ایسا اسلامی کہ اسلام نے وہاں خدانخواستہ جبرواکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا بلکہ یہ بارور پودا حضرت شاہ ہمدانؒ جیسے نیک و کامل بزرگان دین کے پاک ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے اور انہیں کی مساعی تبلیغ دین کا نتیجہ ہے جنہوں نے گھر بار اور وطن محض اس لئے ترک کئے کہ رسول اللہ کے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار و ممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمدللہ کہ وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے۔" (۱۷)

علامہ اقبال نے حضرت شاہ ہمدانؒ کے حوالہ سے خیر و شر کے فلسفہ امت اسلامیہ میں اتحاد و اشتراک اور کشمیریوں کی آزادی کے لئے جذبہ عمل کی تلقین کی ہے۔ اور یہ بات واضح طور پر بیان کی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر مذہبی اور کلچرل حیثیت سے ایک اسلامی ریاست ہے جہاں کے عوام اپنے حق خود ارادیت کے حصول کے لئے جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔ علامہ اقبال نے کشمیریوں کو شاہ ہمدان کی زبانی یہ درس عمل دیا۔

فاش گویم باتو اے والا مقام
باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اولی الامرے کہ "منکم" شان اوست
آیہ حق حجت و برہان اوست
یا جوانمردے چو صرصر تند خیز
شہر گیر و خویش باز اندر ستیز

(ترجمہ)

صاف کہہ دوں تجھ سے اے عالی خیال
باج دنیا ہے فقط دو کو حلال
یا وہ صاحب امر ہو جس کا وجود
دہر میں ہے مظہر انصاف وجود

یا وہ باہمت جو ہو مرد ستیز
مثل صرصر تند رو اور تند خیز

... علامہ اقبال نے شاہ ہمدان" کے ذکر جمیل میں جس چیز کو سب سے زیادہ اُجاگر کیا ہے وہ ہے کہ فقیری و شاہی اور تخت و تاج کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور ان اسرار کو جاننے کے لئے شاہ ہمدان" کے افکار و نظریات سے کماحقہ آگاہی ضروری ہے کیونکہ شاہ ہمدان" ایک ایسے اسلامی مبلغ تھے جو دین کی اصل روح سے واقف تھے اور جو انسان کی ظاہری و باطنی دونوں زندگیوں کا رہنما قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ کو قرار دیتے ہیں... جو کہ خود اقبال" کے فکر و نظر کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

حواشی

۱۔ سیدہ اشرف ظفر امیر کبیر سید علی ہمدانی۔ ص ۱۲
۲۔ رسالہ مستورات برگ ۲۱۹۔ بحوالہ امیر کبیر علی ہمدانی۔ ص ۷۰
۳۔ خلاصۃ المناقب برگ ۹۵ ب بحوالہ امیر کبیر علی ہمدانی۔ ص ۵۹
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً
۶۔ سیدہ اشرف ظفر۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی۔ ص ۱۴۸
۷۔ ایضاً

اقبال اور شیخ نور الدین (رشی) ولیؒ

سری نگر سے اٹھائیس میل دور جنوب مغرب کی سمت بے برگ و گیاہ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں چرار شریف کی بستی ہے جہاں کشمیر کی ایک جلیل القدر ہستی کی آخری آرام گاہ ہے جو صدیاں گذر جانے کے بعد مرجع خاص و عام ہے۔ ہماری مراد شیخ نور الدین (رشی) ولیؒ کی ذاتِ اقدس سے ہے جنہیں کشمیری مسلمان "علمدار کشمیر" اور ہندو "نندہ رشی" کے ناموں سے یاد کرتے ہیں — شیخ نور الدین (رشی) ولیؒ کا شمار نہ صرف کشمیر کے عظیم صوفیائے عظام میں ہوتا ہے بلکہ کشمیری شاعری کے دورِ اولین کے شعرائے کرام میں بھی آپ کا نام سرفہرست ہے۔ تاریخ تصوف کشمیر میں آپ کو رشی سلسلہ تصوف کا بانی مانا گیا ہے اور اس سلسلے سے منسلک لوگوں کو بقول صاحب "آب کوثر" بابا یا مسلمان رشی (یا ریش) کہتے ہیں جو نہایت سادہ زندگی بسر کرتے اور ہندو اور مسلمان دونوں انہیں نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت شیخ نور الدینؒ نے پائی جنہیں ہندو "نند رشی" کہتے ہیں اور جن کی نسبت — بابا داؤد خاکیؒ نے لکھا ہے۔

> شیخ نور الدین ریشی پیر جمع ریشیاں زاہدے خوش بود، باحق داشت بسیار اشتغال بود با تجرید و تفرید اہل صوم و دہر پرہیز تارک لحم و عسل، سیر و بصل بسیار سال صاحب کشف و کرامت بود و نطق خوب داشت ہم اویسی بود گفت ایں راوی صاحب مقال۔ (منقول از رشی نامہ قصیدہ لامیہ) ریشی نامہ قصیدۂ لامیہ۔

شیخ نور الدین کے والد یا سمن رشی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ وہ خود ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے اور سلطان زین العابدین کے عہد حکومت میں ۱۴۳۸ء میں وفات پا گئے۔ آپ کشمیر کے سب سے بڑے ولی سمجھے جاتے ہیں۔ جب انیسویں صدی کے آغاز میں کچھ عرصہ کے لیے کشمیر میں افغانوں کی حکومت قائم ہوئی تو کشمیر کے گورنر عطا محمد خاں نے ان کی وفات کے کوئی چار سو سال بعد ان کے نام کے سکے بنوائے۔ (۱)

شیخ نور الدین (رشی) ولیؒ کے آباؤاجداد کشتواڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں مورخ کشمیر منشی محمد الدین فوق "تاریخ اقوام کشمیر" میں لکھتے ہیں کہ شیخ نور الدین ولیؒ کے والد کا اسلامی نام شیخ سالار دین تھا۔ ان کے متعلق تاریخوں میں لکھا ہے کہ وہ تیا نزکی چوتھی پشت میں تھے۔ تیانزر "از احفاد راجہ ہائے کشتواڑ است"۔ شیخ سالار دین کے قبول اسلام کے بعد طبقہ ریشیاں کا مال مویشی چرایا کرتے تھے۔ یا سمن رشی نے ان کی شادی سدرہ ماجی ایک بیوہ عورت سے کرادی۔ سدرہ ماجی بھی ایک خاندانی لڑکی تھی۔ بلکہ لکھا ہے کہ "ایں دختر از قوم راجہ ہاست"۔ اس شادی کی وجہ سے شیخ سالار دین کیموہ (بیج بہاڑہ) میں رہنے لگے۔ ۷۵۷ھ میں شیخ نور الدین پیدا ہوئے۔ ان کے سال انتقال بلکہ پیدائش کے سال میں بھی مورخین کا اتفاق نہیں ہے۔ تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ (۲)

یہاں یہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ شیخ نور الدین ولیؒ کے پردادا کشتواڑ کے راجہ اور ہندو مت کے پیروکار تھے جنہیں جب ایک جنگ میں شکست ہوئی تو ترکِ سکونت کر کے وادی میں آن بسے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ نور الدین (رشی) ولیؒ کے والد ماجد نے میر سید حسین سمنانیؒ کی تعلیمات اور رشد و ہدایت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور ان کے ساتھ ہی ان کی اہلیہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ میر سید حسین سمنانی یا سامانیؒ حضرت میر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے والد ماجد شہاب الدین کے بھتیجے سید محمد کے بیٹے تھے جنہیں میر سید علی ہمدانی نے ایران سے کشمیر میں بغرضِ تبلیغ دین بھیجا تھا۔ انہوں نے کشمیر میں کولہ گام کے باشندوں کو ظاہری و باطنی فیوض سے مستفیض کیا۔ چنانچہ آپ سے متعدد کرامات بھی مشہور ہیں۔

جہاں تک شیخ نور الدین رشی ولیؒ کے سید حسین سمنانیؒ سے مستفیض ہونے کا

تعلق ہے ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر اپنی کتاب "امیر کبیر سید علی ہمدانی" میں لکھتی ہیں کہ موضع کمبوہ سے شیخ نور الدین آپ سے کسب فیض کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ اتفاق سے سید" آرام فرما رہے تھے۔ شیخ نے ان کی خواب گاہ کی طرف دیکھا اور اپنے سوال کا جواب پالیا۔ جس کے بعد واپس چلے گئے۔"(۳)

پیشتر اس کے کہ ہم شیخ نور الدین رشی ولی" کی شخصیت اور مسلک کے بارے میں کچھ بیان کریں، ضروری ہے کہ پہلے لفظ رشی "بابا اور شیخ کی وضاحت کر دی جائے جہاں تک لفظ رشی کا تعلق ہے اس کے بارے میں منشی محمد الدین فوق "تاریخ کبیر" کے مصنف حاجی محی الدین مسکین سرائے بلی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"رشی نامہ اور کشمیر کی مختلف تواریخ سے معلوم ہوتا ہے رشی اصل لفظ "رکھی" ہے کہ در اصطلاح سنسکرت تارک الدنیا مشغول بہ یادِ خدا گویند بجائے رکھی لفظ رشی در زبان کشمیری مستعمل است۔"(۴)

شیخ نور الدین رشی ولی" کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ وہ جب پیدا ہوئے تو دودھ نہیں پیتے تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ ان کو کشمیر کی ایک عابدہ اور صوفیہ خاتون للہ عارفہ (لل دیوی) کے پاس لے گئیں۔ للہ عارفہ نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

اینہ مندہ چھوک نہ چینہ چھکہ مندہ چھان (کشمیری)

(ترجمہ) دنیا میں آنے سے نہیں شرمائے اور اب دودھ پینے سے شرما رہے ہو۔

اس پر بچے نے للہ عارفہ کی گود میں دودھ پینا شروع کیا۔ شیخ نور الدین رشی ولی" اوائل عمر سے ہی نیک سیرت اور صاحب کردار تھے۔ البتہ ان کے دونوں بھائیوں کے چال چلن مشکوک تھے۔ ایک دن دونوں بھائی شیخ صاحب کو بھی اپنے ہمراہ چوری کی واردات میں لے گئے۔ سردیوں کا موسم تھا اور یہ سب تاریکی میں ایک غریب کے گھر جا پہنچے۔ شیخ صاحب" نے جب ان کی غربت اور مفلسی دیکھی تو اپنی لوئی (کمبل) ان غریبوں کے ٹھٹھرتے جسموں پر ڈال دی۔ بھائیوں نے پوچھا لوئی کہاں ہے؟ تو شیخ نے کہا "میں اسے غریبوں کے عریاں بدنوں پر ڈال آیا ہوں۔"

شیخ نور الدین ولی ہر وقت غور و فکر میں مستغرق رہتے اور کوئی کام کاج نہ کرتے۔ ان کے والد نے چاہا کہ کوئی دھندا کریں مگر جنگلوں کی طرف نکل گئے اور گھر بار تیاگ دیا

اور ایک غار میں بسیرا کر لیا۔ انہوں نے وہاں پہ لکڑی کی ایک روٹی تیار کی جب بھوک لگتی، اس کو دانتوں تلے دبا لیتے۔ شیخ نور الدین ولیؒ کے دو بچے تھے۔ لڑکے کا نام حیدر اور لڑکی کا نام ژون تھا۔ کہتے ہیں جب شیخؒ نے غار میں سکونت اختیار کر لی تو ان کی اہلیہ بی بی ژون دیدی اپنے دونوں بچوں کو لے کر غار کے دروازے پہ پہنچی۔ شیخؒ نے استقبال کرتے ہوئے کانوں کا ایک گٹھا باندھا اور اسے غار کے اندر لے جا کر فرش پہ بکھیر کر اس پہ بیٹھ گئے اور اہلیہ سے کہا آپ بھی آرام فرمائیں۔ اہلیہ نے گریہ کناں ہو کر کہا "میں نے آپ سے قطع امید کر لی ہے۔ اب آپ اپنے دونوں بچے بابا حیدر اور ژون دیدی کو سنبھالیں اور مجھے اجازت دیں" یہ کہہ کر وہ دونوں بچے وہاں چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ دونوں بچے چند دنوں کے بعد فوت ہو گئے۔

شیخ نور الدین رشی ولیؒ نے دونوں بچوں کو غار سے باہر لا کر دفن کر دیا۔ کیفیت کچھ یوں تھی۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند

(تاریخ کبیر از غلام محی الدین مسکین ص ۹۹-۱۰۰)

کشمیری تصوف

شیخ نور الدین رشی ولیؒ کے مسلک و عقیدہ کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے کشمیر میں تصوف کی تاریخ کا مختصراً جائزہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ آسانی کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ کشمیری تصوف تین بڑے ادوار سے گزرا ہے۔ پہلا دور "ناگ مت" "برہمن مت" "بدھ مت" اور "شیو مت" کے عقائد و نظریات کا ملغوبہ ہے۔ ان سب نظریات نے کشمریوں کو تضادات کا شکار بنا دیا۔ پھر دوسری جگہ شیو مت نے لی جو بظاہر برہمن مت کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ پھر بدھ مت کا زور شور شروع ہوا اور بالآخر یہ بھی رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا اور کشمیریوں کے ذہنی، قلبی اور روحانی خلفشار اور انتشار کا

موجب بنا۔ چنانچہ جب کشمیر میں اسلام کی روشنی پہنچی تو بدھ مت کے پیرو والی کشمیر رنچن شاہ نے سید شرف الدین عبدالرحمن بلبل شاہؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور یوں وہ سلطان صدر الدین بن کر دین مبین کے نظام حیات کی ترویج اور اشاعت کا موجب بنا اور یہیں سے کشمیر میں اسلامی تصوف کا بھی دور شروع ہوا جس نے کشمیریوں کے اذہان و قلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کشمیر میں اسلام حاکموں یا بادشاہوں کی فتوحات سے نہیں بلکہ درویشوں اور صوفیوں کی وساطت سے پھیلا جن میں سید شرف الدین عبدالرحمن بلبل شاہ سرفہرست ہیں۔

"کشمیری تصوف کا تیسرا دور شیخ نور الدین رشی ولیؒ سے ہوتا ہے جو سلسلہ رشی کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے مکتب فکر میں اسلامی تصوف کے صحت مند افکار بھی ہیں اور بدھ مت کی رہبانیت کے ساتھ برہمن مت کی عزت پسندی اور شیومت کی تصوریت بھی موجود ہے اس ضمن میں مقبول احمد سید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں "وہ لوگ جو شیو ازم کے حامی تھے انہوں نے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اسلام اور شیو ازم دونوں کے امتزاج سے ایک نیا جاندار اخلاقی نظام بنایا ہے جس کی زندہ مثال للہ عارفہ کے ہم عصر شیخ نور الدین ولیؒ ہیں۔ شیخ نور الدین ولیؒ پر چونکہ للہ عارفہ کا خاصا اثر ہے اس لیے شیو ازم اور اسلام کے امتزاج سے پیدا شدہ نئے فکر، نئے نظام اخلاق اور نئے فلسفے کی بابت اجمالی طور پر یہ باتیں کہنا پڑیں۔ (۵)

حقیقت یہ ہے کہ شیخ نور الدین رشی ولیؒ کی شخصیت اور نظریات پر للہ عارفہ کی ذات و نظریہ کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔

بابا کمال الدین رشی "نور الدین نامہ" میں لکھتے ہیں شیخ نور الدین ولی نے کشمیری زبان میں ایک نہایت دلگداز مناجات لکھی ہے جس میں چند خدا رسیدہ بزرگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں خدا تعالیٰ سے ان کی ہمسری کی التجا کی ہے۔ اس مناجات میں للہ عارفہ کی تعریف اس انداز میں کرتے ہیں۔

> "پانپور کی للہ عارفہ نے شراب محبت نوش کی۔ اس کا ثانی تمام روئے زمین پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ ظاہر میں اگرچہ دیوانی تھی مگر اس کا دل صحیح معنوں میں فرزانہ تھا۔"

۸۱ء۷ھ میں جب امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر تشریف لائے تو للہ عارفہ سے پانپور کے قصبہ میں آمنا سامنا ہوا۔ ان کی باطنی نظر نے للہ عارفہ کی حیثیت اور منصب کو پہچان لیا۔ ادھر جب للہ عارفہ نے امیر کبیر کو اپنی جانب آتے دیکھا تو برہنگی کے احساس سے ستر پوشی کی فکر ہوئی اور بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگی اور آخر ایک جلتے ہوئے تنور میں کود پڑی تاکہ ستر پوشی ہو جائے۔ اسی اثناء میں امیر کبیر قریب پہنچ گئے اور تنور کے کنارے کھڑے ہو کر آواز دی "للہ باہر نکل آؤ۔" آواز سنتے ہی وہ فوراً باہر نکلی اور سب دیکھ کر یہ حیران رہ گئے کہ اس نے خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ اس پر امیر کبیر نے اپنی رداء اس پر پھینک دی اور للہ عارفہ مشرف بہ اسلام ہوئی۔ اسی طرح جب امیر کبیر سید علی ہمدانی کو یہ علم ہوا کہ شیخ نورالدین ولی بھی گھر بار چھوڑ کر جنگل میں جا بسے ہیں تو آپ نے انہیں پیغام بھجوایا کہ واپس آؤ۔ اس کے بعد ہی شیخ نور الدین رشی ولی چرار شریف میں لوگوں سے ملنے لگے اور اُن کی روحانی تربیت شروع کر دی۔ خود فرماتے ہیں:

> جنگلوں میں گھومنا پھرنا میری کمزوری تھی۔ میرا خیال تھا یہ عبادت ہے۔ اس سے خوامخواہ مجھے بدنامی ہوئی کہ شیخ نور الدین بہت بڑا پرہیزگار ہے۔ دراصل مجھے تو ایک ہی بات معلوم کرنا تھی کہ میں کون ہوں اور میرا پیدا کرنے والا کون ہے؟

شیخ نور الدین رشی ولی کو نام نہاد ملاؤں سے سخت نفرت تھی اور وہ ان کی ظاہر پرستی کے خلاف تھے۔ اپنے ایک شلوک میں کہتے ہیں:

> "سات کورس کا تم نے کھانا کھایا۔ تمہارا پیٹ مرغن غذاؤں سے پر ہے اور اب تو بھینس کی مانند ڈکار رہا ہے۔ تمہیں ملا (علامہ) سمجھوں تو راہزن کسے کہوں؟"

> "تو اپنے جسم کو ظاہر پرستی کے صابن سے رگڑ رہا ہے۔ اس سے تو تیرے باطن کی میل نہیں اُترے گی تو جبہ و عمامہ سے آراستہ ہے لیکن اس طرح تو خدا کا عرفان تجھے حاصل نہ ہو گا۔"

ایک بار اُن سے پوچھا گیا کہ ملاؤں کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

"ملا (علامہ) تو مولانا رومی ہے۔ یہ ملا۔ ان ملاؤں سے توبہ۔"

علامہ اقبالؒ سے تعلق

علامہ اقبال کے جد اعلیٰ بابا لول حج تھے جنہوں نے شیخ نور الدین رشی ولی کے چوتھے خلیفہ بابا نصر الدین کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا تھا۔ بابا نصر الدین کے والدین صاحبان دولت و حشمت تھے اور ہندو مذہب کو مانتے تھے۔ مگر آپ نے ہندو مت کو ترک کر دیا اور شیخ نور الدین رشی ولی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ آپ کا شمار شیخ نور الدین رشی ولی کے خلفاء میں ہوتا ہے۔ بابا بام الدین خلیفہ اول تھے۔ شیخ زین الدین خلیفہ دوم اور بابا لطیف الدین خلیفہ سوم تھے۔ جب کہ بابا نصر الدین خلیفہ چہارم تھے۔

علامہ اقبالؒ اپنے آباؤاجداد کے سلسلہ نسب اور سلسلہ ارادت دونوں سے بخوبی واقف تھے بلکہ انہوں نے ہی اپنی کاوش اور جستجو سے اپنے جد اعلیٰ بابا لول حج کا سراغ لگایا جو بابا نصر الدین کے خلیفہ تھے۔ کشمیر میں سینکڑوں لوگ آپ کے مرید تھے۔ بابا رکن الدین رشی جو کشمیر کے ایک بڑے عالم فاضل بزرگ گزرے ہیں۔ بابا لول حج کے خلیفہ تھے۔ بابا لول حج کے بارے میں علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں۔

"آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیت مجموعی درست ہے ان کا اصل گاؤں پوجر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ آدرن تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس واسطے ترکِ دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین کے مرید ہوئے جو حضرت نور الدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انہوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گذاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔ اب امید ہے کہ مزید حالات معلوم ہو جائیں گے۔ خواجہ اعظم کا تذکرہ مختصر ہے مگر یہ مختصر نشان غالباً مزید انکشافات کا باعث ہو گا۔ ان حالات کے معلوم ہونے کا سبب بھی عجیب و غریب ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری

حاصل کرنے کے لیے ایک کتاب کشمیری تہذیب و تمدن پر لکھ رہے ہیں۔ میں ان ممتحنین میں سے ہوں۔ باقی دو ممتحن انگلستان اور آئرلینڈ کے پروفیسر ہیں۔ اتفاق سے رجسٹرار صاحب کل آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے۔ وہ شخص قلمی نسخہ تاریخ مذکور کا لایا۔ میں اس وقت فارغ بیٹھا تھا۔ یہی کتاب دیکھنی شروع کردی۔ دو چار ورق ہی اُلٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ غالبا بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہوگی۔ ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سارا سلسلہ موجود ہو۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ (۶)

(خط ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

کیا اقبالؒ رشی تھے

تواریخ کشمیر میں بابا لول جی یا ان کے معروف مرشد بابا نصر الدین کا ذکر زمرۂ ریشیاں میں ملتا ہے۔ ریشی دراصل کوئی ذات یا گوت نہیں تھی بلکہ یہ زہاد کا طبقہ تھا جسے اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ جن رشی حضرات کا ذکر تواریخ کشمیر میں محفوظ ہے ان میں کچھ لوگ راجپوت بھی تھے۔ چند میر بٹ اور زمیندار تھے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ کے جد اعلیٰ اگر ریشی کہلائے تو اُس سے اُن کی گوت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ ریشیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے غلام محی الدین مسکین لکھتا ہے۔ "ریشی از لفظ رکھی کہ در اصطلاح سنسکرت تارک الدنیا و مشغول بیادِ خدا را گویند و آنکہ ایں لفظ را عربی یا فارسی قرار دادہ است در آن تاویلات نمودہ وپی باصلیت ایں لفظ بزہ است۔"

یہ درست ہے کہ علامہ اقبالؒ کی گوت سپرو تھی مگر وہ روحانی رشتہ سے کشمیر کے رشیوں سے بھی منسلک تھے اور شیخ نور الدین رشی ولیؒ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مقبول احمد سید اپنے مضمون شیخ نور الدین ولیؒ میں لکھتے ہیں:

"شیخ نور الدین ولیؒ کے کلام پر جب تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو اس کی تعلیمات بغیر

کی الجھاؤ کے واضح ہو جاتی ہیں۔ شیخ نور الدین ولیؒ محبت کو زندگی کی اساس سمجھتے ہیں اور کائنات میں اس ارفع جذبہ کو ایک زندہ قوت کی حیثیت سے جاری و ساری پاتے ہیں۔ چنانچہ وہ رفعت و عظمت کے حصول کے لیے محبت کو ایک زینہ تصور کرتے ہیں۔ کچھ اس طرح کا نظریہ تکمیل خودی کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے بھی پیش کیا ہے اور موجودہ دور میں کشمیری شاعری میں آزاد نے بھی اس طرح کا نظریہ پیش کیا ہے۔ لیکن تینوں نظریات کا سماجی متن مختلف ہے۔ اس لیے ان کی نوعیت مختلف ہے، ہرچند کہ ان کی ماہیت یا غایت ایک ہی ہے۔ شیخ نور الدین ولیؒ ایک شروک (شلوک) میں فرماتے ہیں:

"عظیم وہ ہے جو محبت کی آگ میں جلتا رہے۔ اس سونے کی طرح جو بھٹی میں تپتا رہتا ہے جب ہی تو وہ کندن بنتا ہے۔ محبت میں جل کے ہی عظمت، رفعت اور ابدیت حاصل ہوتی ہے۔" اپنے خلیفہ نصرو کو کہتے ہیں:

"نصرو! آج یہ جسم سرو بخ بستہ ہواؤں کی زد میں ہے اور زرد پتوں اور نیم اُبلی سبزیوں پر زندہ ہے۔ یہی طریقہ ہے طہارتِ نفس کا۔" (۷)

یہ کہنا کہ علامہ اقبالؒ شیخ نور الدین رشی ولیؒ کے نظریات سے کسی حد تک متاثر تھے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کشمیری تصوف محض سوادِ خانقاہی بن کر رہ گیا تھا اور علامہ اقبالؒ اس مکتب کے مخالف تھے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اہل کشامرہ کو ان کی قبر پرستی نے ہی بزدل اور خوفزدہ بنا رکھا ہے۔ پھر علامہ اقبالؒ دنیا سے بیزاری، کنارہ کشی اور لذت و آرام ترک کر دینے کے بھی خلاف تھے۔ البتہ یہ درست ہے کہ وہ بھی شیخ نور الدین ولیؒ کی مانند نام نہاد ملاؤں کے سخت خلاف تھے اور ترکِ دنیا کو غیر اسلامی اور غیر فطری عمل قرار دیتے تھے۔ فرماتے ہیں:

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

شیخ نور الدین رشی ولیؒ فرماتے ہیں کہ اصل ملا تو مولانا رومی ہی ہے لہٰذا اگر یہ کہا

جائے کہ شیخ نور الدین ولیؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں کا مثالی عالم رومی تھے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ علامہ اقبالؒ نے مرشد رومی ہی کی رفاقت میں ہفت افلاک کی سیر کی تھی اور امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سے ملاقات کی تھی۔ جنھوں نے للہ عارفہ اور شیخ نور الدین ولیؒ کی رہنمائی کی اور انہیں حق و صداقت کا راستہ دکھایا۔ اقبالؒ نے سچ فرمایا ہے کہ:

سید السادات سالارِ عجم
دست او معمار تقدیر امم
یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ

یہ دلچسپ بات ہے کہ شیخ نور الدین ولیؒ اور علامہ اقبالؒ کے کئی شعروں میں مناسبت ہے اور دونوں نے ایک ہی موضوع اور مضمون پر اشعار کہے ہیں مثلاً شیخ نور الدین رشی ولیؒ فرماتے ہیں

زاغ کی صحبت میں دے بیٹھا سبھی کچھ راج ہنس
جہل کی محفل میں پنڈت علم سے خالی ہوا

علامہ اقبال

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

یا

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

شیخ نور الدین رشی ولیؒ

کھو گیا چشمہ پہاڑوں کی چٹانوں میں اُدھر
گھر کے چوروں میں ادھر صوفی کا ایمان چھن گیا

علامہ اقبالؒ

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

شیخ نورالدین رشی ولیؒ

عاشق وہ ہے جس کو عشق کی آگ جلا کر بھسم کرے
عشق کی آگ میں جل جائے تو تن من جیسے کندن ہو

علامہ اقبالؒ

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

یا

یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں
عاشق ہے تو کس کا یہ داغِ آرزو ہے!

شیخ نورالدین رشی ولیؒ

چاہنے والا روحِ ابد سے واصل ہو سکتا ہے مگر
اس لمحے جب اس کا سینہ عشق کے نور سے روشن ہو

علامہ اقبالؒ

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

یا

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسمان چیر گیا نالہ بے باک مرا

یا

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

شیخ نورالدین رشی ولیؒ

مفلسی کی تلخیوں کو بھی سمجھ شہد و شکر

اور ہیں تیرے لیے کونین میں عزت کے ڈھیر

یا

اس کے تیروں سے نہ گھبرا، اس کے تیروں سے نہ بھاگ
اس کی تیغ بے اماں سے بھول کر بھی منہ نہ پھیر

علامہ اقبالؒ

غریبی میں ہوں محسود امیری
کہ غیرتمند ہے میری فقیری

یا

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

یہ عجیب اتفاق ہے کہ شیخ نور الدین ولیؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں نے ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

حواشی

۱۔ آبِ کوثر، صفحہ ۳۸۲-۳۸۱
۲۔ تاریخ اقوام کشمیر ۱، ۳۵۳-۳۵۴
۳۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی۔ ص ۱۱۱
۴۔ تاریخ اقوام کشمیر۔ ۱، ۳۵۴
۵۔ کشمیر ۲ مارچ ۱۹۶۷ء
۶۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ ۲: ۶۰۷-۶۰۹
۷۔ کشمیر۔ ۱۳ مارچ ۱۹۶۳ء

اقبالؒ اور سلطان شہاب الدین

کشمیر کے جن سلاطین نے اسلامی تعلیم و تبلیغ اور تہذیب و ثقافت کو رواج اور فروغ دیا، ان میں سر فہرس خاندانِ شہ میری کا سلطان شہاب الدین تھا جو نہ صرف دین مبین کا شیدا تھا بلکہ ایک عظیم مجاہد اور بہادر انسان بھی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خطہ کشمیر میں مذہب و ثقافت اور تہذیب و تمدن میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدان کے دم قدم سے انقلاب رونما ہوا تو یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ سلطان شہاب الدین کی جرات و شجاعت سے ریاست کی جغرافیائی حدود میں بے پناہ اضافہ اور توسیع ہوئی اور اس کی سرحدیں تبت اور کابل کو چھونے لگیں۔

علامہ محمد اقبالؒ نے جہاں شاہ ہمدانؒ کی دینی و علمی عظمت و فضیلت کا یہ کہہ کر اعتراف کیا ہے کہ

سید السادات، سالارِ عجم
دست او معمارِ تقدیرِ امم

وہاں سلطان شہاب الدین کی بہادری جرات آفرینی اور عدل پروری کی بھی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

عمر ہا گل رخت بر بست و کشاد
خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

سلطان شہاب الدین ۱۳۵۴ء میں اپنے والد سلطان علاؤالدین کی وفات کے بعد تخت نشیں ہوا۔ اس کا تعلق خاندان شہ میر سے تھا جنہیں کشمیر میں اسلامی سلطنت کا بانی کہا

جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ کشمیر کے پہلے مسلمان حکمران ہونے کی سعادت رنچن شاہ کو حاصل ہوئی جس نے مبلغ اسلام حضرت شرف الدین عبدالرحمن المعروف بلبل شاہ کے دست مبارک پر اسلام قبول کر کے سلطان صدر الدین کے نام سے اسلامی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا اور خطہ کشمیر کو دین محمدیؐ سے منور کیا۔

سلطان صدر الدین کی وفات کے بعد اس کی اہلیہ کوٹا رانی نے اپنے نوعمر بیٹے حیدر خان کو تخت نشین نہ ہونے دیا اور خود امور سلطنت سنبھال لیے۔ وہ ایک متعصب اور کینہ پرور خاتون تھی جس نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ سلطان صدر الدین کی خوشنودی کے لیے مسلمان ہوئی تھی لیکن جونہی سلطان صدر الدین نے آنکھیں بند کیں وہ دین اسلام سے برگشتہ ہو گئی اور اپنے سابقہ شوہر راجہ سہادیو کے بھائی راجہ ادیان دیو سے شادی کر لی۔ مگر راجہ ادیان دیو حکومت کا انتظام و انصرام نہ سنبھال سکا اور جب اردل کشمیر پر حملہ آور ہوا تو اس نے راہ فرار اختیار کی اور لداخ کی طرف جا نکلا۔ اس سے قبل بھی وہ ایک بار اس وقت بھاگا تھا جب زلچو نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ بہرحال جب شہ میر جو مہارانی کا مشیر تھا اور سوات کا رہنے والا تھا، نے اردل کے حملہ کو ناکام بنایا تو ادیان دیو پھر واپس آ گیا مگر اس وقت تک ریاست کے حالات بالخصوص داخلی معاملات بگڑ چکے تھے اور نوبت خانہ جنگی تک آن پہنچی تھی۔ مگر شہ میر نے حالات کو سنبھال لیا اور کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ اس نے سلطان شمس الدین کے لقب سے تخت و تاج سنبھال لیا اور یوں ۱۳۳۹ء میں ریاست میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ سلطان شمس الدین شہ میر کی وفات کے بعد سلطان جمشید اور سلطان علاؤالدین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ مگر اس خاندان کا نامور بادشاہ سلطان شہاب الدین ہی ہوا۔ یوں تو حضرت شاہ ہمدانؒ کئی بار کشمیر تشریف لائے۔ آپ کی پہلی سیاحت ۷۴۰ یا ۷۴۱ ہجری بمطابق ۱۳۴۰ء ہے پھر ۷۶۰ ہجری میں اپنے دو خاص نمائندوں تاج الدین اور سید حسین سمنانی کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ یہ بزرگ سلطان شہاب الدین (۷۵۲ھ-۷۷۱ھ/ ۱۳۵۴ء-۱۳۷۰ء) کے دور حکومت میں کشمیر میں وارد ہوئے۔ "واقعاتِ کشمیر" میں محمد اعظم لکھتے ہیں:

> "وہ تمام فیوض و برکات جو سلطان شہاب الدین کے عہد میں کشمیر کے لیے باعث شرف ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی کے مقرب اور

عارف حضرت سید حسین سمنانی سادات کرام کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ حضرت علی ہمدانی (شاہ ہمدان) کے فرمان سے کشمیر کے بادشاہ اور لوگوں کے حالات جانچنے کے لیے کشمیر آئے۔"[۱۱]

انہی ماہ و سال میں یعنی ۷۸۴ ہجری میں ممتاز عارف مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جہاں گشت" کشمیر میں تشریف لائے اور کچھ عرصہ رہنے کے بعد واپس تشریف لے گئے۔ حضرت شاہ ہمدان" کی ہدایت پر سلطان شہاب الدین نے ۷۷۴ ہجری میں "دی ہند" کے بادشاہ فیروز شاہ تغلق کے ساتھ اٹک کے قریب اپنی جنگ بندی کی اور ہندوانہ لباس ترک کر کے ترک شاہاں کی طرح لمبا چغہ پہننا شروع کیا۔ سلطان نے دو حقیقی بہنوں سے شادی کر رکھی تھی۔ حضرت شاہ ہمدان" کے ارشاد پر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے ایک کو آزاد کر دیا۔ سلطان شہاب الدین اور فیروز شاہ تغلق کی جنگ شاہ ہمدان نے بند کرائی تھی۔ سلطان شہاب الدین نے ریاست میں پہلا دینی مدرسہ بنوایا اور اسلامی تعلیمات کا آغاز کیا۔

سلطان شہاب الدین بڑا بہادر جرنیل تھا۔ اس نے ریاست کے باہر کے علاقے بھی فتح کر لیے تھے۔ پروفیسر محب الحسن لکھتے ہیں:

"شہاب الدین نے لداخ سے نگر کوٹ (کانگڑہ) کی طرف کوچ کیا اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد ستلج کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں ۱۳۶۱ء میں نگر کوٹ کے راجہ اوک پتی سے اس کی جنگ ہوئی جو حال ہی میں فیروز شاہ تغلق کی مملکت پر حملہ کر کے کثیر مالِ غنیمت لے کر لوٹا تھا۔ شہاب الدین نے اس کو شکست دی اور اس کو مالِ غنیمت سپرد اور اس کی حکومت تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ۵۰ ہزار سوار اور ۵۰ ہزار پیدل سپاہ لے کر وہ دہلی کو فتح کرنے کے لیے چل پڑا۔

فیروز شاہ تغلق نے ستلج کے کنارے اس کا مقابلہ کیا لیکن یہ جنگ فیصلہ کن ثابت نہ ہوئی۔ اس لیے ان کو صلح کرنی پڑی۔ اس صلح سے سرہند سے لے کر کشمیر تک کا علاقہ شہاب الدین کو ملا اور بقیہ علاقہ فیروز شاہ کی مملکت میں رہا۔ اس سے فیروز شاہ کی دو لڑکیاں شہاب الدین اور اس کے بھائی قطب الدین سے منسوب ہوئیں اور شہاب الدین کی لڑکی کی شادی فیروز شاہ سے ہوئی۔ یہ شہاب الدین کی آخری فوج کشی تھی اس کے بعد وہ کشمیر

واپس آیا اور اپنی حکومت کے بقیہ ۹ سال ملک میں اصلاح کے کام میں مشغول رہا۔"(۲)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سلطان شہاب الدین نے کشمیر میں اسلام کے فروغ اور عروج کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ وہ ایک نیک نفس اور تعصب سے پاک شخصیت کا مالک تھا اور عدل و انصاف کا پورا پورا خیال کرتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں شرپسندوں اور غیر مسلموں نے فسادات کی آگ بھڑکائی مگر سلطان نے نہایت حلم و تدبر سے حالات پر قابو پالیا اور ان تخریبی مراکز کو خالی کرا لیا جہاں سے سازشیں اٹھتی تھیں۔ وہ نہ صرف مساوات کا علمبردار تھا بلکہ فرقہ بندی کے بھی خلاف تھا اور کسی سے امتیازی سلوک نہیں کرتا تھا۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ دینی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ جنگ و جدل میں بھی مصروف رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد حکومت میں بے حد فتوحات ہوئیں۔ اس نے اپنے فوجیوں کو انعامات اور خطابات سے نوازا تھا۔ اور اس کے صف شکن مجاہدوں نے دہلی کے دروازے عبور کر لیے تھے اور جب فیروز شاہ تغلق سے صلح ہوئی تو یہ علاقہ پھر شاہ دہلی کی سپردگی میں دے دیا گیا۔

سلطان شہاب الدین ایک ماہر تعمیرات بھی تھا۔ اُس نے سری نگر میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں اور شہاب الدین پور کے نام سے ایک بڑا قصبہ آباد کیا اور جب صدیوں بعد مغل شہنشاہ اکبر اعظم کشمیر آیا تو اس نے شہاب الدین پورہ جسے شادی پورہ بھی کہتے ہیں، کی سیر کی اور اس کے فن تعمیر کی داد دی۔

سلطان شہاب الدین کی انہی خوبیوں کی وجہ سے علامہ محمد اقبالؒ نے کہا کہ اب کشمیر کی مٹی نے شہاب الدین ایسے ذہین اور بہادر انسانوں کو جنم دینا ترک کر دیا ہے چونکہ کشمیری عوام صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے آ رہے ہیں۔ اس لیے علامہ محمد اقبال جو کہ خود اہل کشمیر کے لیے اپنے سینے میں بے پناہ درد رکھتے تھے، سلطان شہاب الدین کی عظمت و رفعت کو سراہا ہے۔ نہ صرف سراہا ہے بلکہ کشمیریوں کو اس عظیم مجاہد اور مرد مسلمان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین بھی کی ہے۔

علامہ محمد اقبال اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ کشمیری عوام کی سیاسی محکومی اور معاشی پسماندگی میں جہاں حکمران طبقہ کی چیرہ دستیاں شامل ہیں وہاں خود کشمیریوں کی خوئے غلامی اور ایذا رسائی بھی شامل ہے۔ علامہ محمد اقبال جانتے تھے کہ کشمیری قوم چرب دست و

تر دماغ ہے اور گئے گزرے دور میں انہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور کارکردگیوں کا بہترین مظاہرہ کیا ہے مگر حالات نے ان کے قویٰ مضمحل اور مفلوج بنا دیئے ہیں۔ علامہ محمد اقبال یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ کشمیری عوام کی محکومی و مظلومی کا دور عارضی ہے اور اپنے اس احساس یا اُمید کا اظہار "جاوید نامہ" میں سلطان شہاب الدین کے حوالے سے یوں کرتے ہیں۔

زیرک و دراک و خوش گل ملتے است
در جہاں تر دستی او آیتے است

(ترجمہ) کشمیری ایک ذہین، ہوشیار اور حسین قوم ہے دنیا میں اس کا ہنر معجزہ سے کم نہیں۔

ساغرش غلطندہ اندر خونِ اُوست
در نے من نالہ از مضمونِ اُوست

(ترجمہ) اس کا پیالہ اپنے ہی لہو سے بھرا ہوا ہے۔ میری بانسری کے گریہ کا موضوع یہی قوم ہے۔

از خودی تا بے نصیب افتادہ است
در دیارِ خود غریب افتادہ است

(ترجمہ) کشمیری جب اپنی خودی سے بے نصیب و محروم ہوا تب سے وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی ہو کر رہ گیا ہے۔

تا نہ پنداری کہ بود است ایں چنین
جبہ را ہموارہ سود است ایں چنین

(ترجمہ) پھر یہ نہ سمجھنا کہ یہ قوم ہمیشہ سے اس طرح تھی۔ غلام ہو کر اغیار کے آگے ماتھا رگڑتی تھی۔

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بودہ است

(ترجمہ) کسی زمانے میں یہ صف شکن اور فاتح بھی تھی۔ غالب، جانباز اور بہادر و دلیر تھی۔

اور ایسی بہادر قوم کا قائد و رہنما سلطان شہاب الدین تھا جس کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا۔

عمر ہا گل رخت بر بست و کشاد
خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

(ترجمہ) صدیوں سے پھول کھلتے اور مرجھاتے رہے لیکن ہماری خاک سے کوئی دوسرا سلطان شہاب الدین پیدا نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے کشمیری عوام کی محکومی و مظلومی کو ایک عارضی شے سے تصور کیا کیونکہ انہیں اس صداقت کا بخوبی علم تھا کہ کشمیری عوام اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے ضرور اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر عالم انسانیت کی خدمت اور راہنمائی کے لیے دوسری اقوام کے ساتھ ہم قدم اور ہم آواز بنیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے "جاوید نامہ" میں حضرت شاہ ہمدانؒ غنی کاشمیری کے ساتھ سلطان شہاب الدین کے کردار و گفتار اور اعمال و افعال کے حوالہ سے کشمیریوں کو درس حریت دیا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ خداوند کریم ان کی آبائی سرزمین کو پھر سے سلطان شہاب الدین ایسے مرد مجاہد سے نوازے جو کشمیریوں کی غلامی کی آہنی زنجیروں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان شہاب الدین جس کی اسلام دوستی اخوت و مساوات اور بہادری اور شجاعت کو اوپر بیان کیا گیا ہے، علامہ محمد اقبالؒ کے پسندیدہ اور محبوب کرداروں میں سے ایک تھے اور علامہ محمد اقبال ایسے ہی کرداروں کے تذکرۂ جمیل سے دلِ مسلم میں زندہ تمنا پیدا کرتے تھے۔

علامہ اقبال اور سلسلۂ ریشیت

علامہ اقبال نے سلسلۂ قادریہ میں بیعت اپنے والد محترم شیخ نور محمد صاحب مرحوم جو کہ نہایت نیک سیرت، متقی اور پرہیزگار انسان تھے کے ایما اور مشورہ سے کی تھی کیونکہ علامہ اقبال نے ہمیشہ اِس بات کا اعتراف کیا کہ اُن میں علوم دینیہ کا جذب و شوق اور عشق رسول مقبول ﷺ کا جذبہ اپنے والد محترم کی صحبت و تربیت سے پیدا ہوا۔ شیخ نور محمد صاحب نہ صرف صوفیائے کرام کی محفلوں میں حاضری دیتے تھے بلکہ اُن سے مسائل تصوف پر گفتگو بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم و دانش اُنھیں "اَن پڑھ فلسفی" بھی کہتے تھے۔ خود علامہ اقبال نے اپنے والد ماجد کی باطنی سیرت اور روحانی کمالات کا ذکر کیا ہے اور یہاں تک بتایا ہے کہ اُن کے والد محترم یہ کہا کرتے تھے کہ "قرآن حکیم اِس طرح پڑھا کرو گویا وہ تم پر نازل ہو رہا ہے یا خدا تم سے ہم کلام ہے۔" چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے فکر و نظر کا سرچشمہ قرآن کریم ہی کو بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے کہ "اقبالؒ قرآن کا شاعر ہے اور شاعر کا قرآن ہے" چنانچہ اپنے والد مکرم کی وفات پر علامہ اقبالؒ نے لکھا۔

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہرواں منزل ما ملک ابد
ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آوازۂ "اثر رحمت" و "آغوش لحد"

یہ درست ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے والد محترم کو اپنا مرشد بھی قرار دیا ہے مگر

واقعات اِس امر کے شاہد ہیں کہ آپ نے بیعت قاضی سلطان محمودؒ کے دست مبارک پر کی جس کا ذکر آپ نے اپنے ایک خط بنام سید سلیمان ندویؒ میں بھی کیا ہے۔ اِس ضمن میں مولوی محمد عبداللہ قریشی اپنے ایک مضمون میں بعنوان "اقبال کا خاندان اور صوفیانہ نظریات" میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کے والد شیخ نور محمد اور خود اقبال نے بھی قادری سلسلے کے ایک بزرگ حضرت قاضی سلطان محمودؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔" (۲)

اور جب مولوی عبداللہ قریشی سے سید نور محمد قادری نے اِس روایت کی تفصیلات کے بارے میں استفسار کیا تو اُنھوں نے فرمایا۔

"اِس کے راوی میرے محترم بزرگ حکیم محمد روح اللہ قادری ہیں چونکہ مولانا "روح اللہ نہایت ہی ثقہ اور متدین بزرگ تھے اِس لئے روایت کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں" (۳)

اِس ضمن میں سردار علی احمد خان اپنے ایک مضمون "سلسلۂ قادریہ" میں علامہ اقبال کی بیعت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"علامہ اقبال کے والد محترم قاضی صاحب کے مرید تھے۔ اپنے فرزند کو لے کر آستانہ عالیہ (اعوان شریف) پر حاضر ہوئے اور دعائے خیر کے لئے معروض ہوئے۔ قاضی صاحب نے ننھے اقبال کے لئے دعا فرمائی کہ یہ لڑکا حضرت رسالت مآب صلی اللہ وسلم کا سچا پیرو ہو گا۔ محمد اقبال سن شعور کو پہنچے تو اُن کے والد نے قاضی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کرائی۔" (۴)

علی احمد خان نے مزید لکھا کہ اِنہیں یہ بات پروفیسر سید عبدالقادر نے جن سے اُنہیں شرف تلمذ بھی حاصل ہے ایک مرتبہ یوں بیان کی تھی کہ خود علامہ اقبال نے سید عبدالقادر کو کہا تھا کہ "میں نے قاضی صاحب کے ارشاد کے مطابق پہلے حضرت سلطان جی حاضری دی اور وہاں رویا میں حضرت قاضی صاحب نے ارشاد کیا کہ تمہارا فیض حضرت مجدد کے پاس ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال سرہند پہنچے اور فیض یاب ہوئے۔"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب علامہ اقبال حضرت مجدد الف ثانیؒ کے روضہ مبارک پر سرہند شریف لے گئے تو اپنے ہمراہ اپنے فرزند ارجمند جاوید اقبال کو بھی

لے گئے۔ بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ علامہ اقبال کے والد ماجد شیخ نور محمد کے حضرت قاضی سلطان محمودؒ سے مراسم تھے اور دونوں کی آپس میں ملاقاتیں بھی رہتی تھیں اور بقول سید نور محمد قادری:

"کشمیری محلّہ میں میرے والد مکرم حافظ عبداللہ شاہ صاحب خلیفہ مجاز حضرت قاضی صاحب (۱۸۵۷ء - ۱۹۴۱ء) اور عم محترم مولوی نوراللہ شاہ صاحب نور سیالکوٹی کے ہاں میرے بڑے بھائی شاہ ولایت مرحوم کی علالت کے سلسلہ میں حضرت قاضی صاحب نے والد مکرم کو حکیم اجمل خان کے نام ایک تعارفی رقعہ لکھ کر دیا جو ہمارے گھر واقعہ سیالکوٹ کشمیری محلّہ میں لکھا گیا تھا۔ رقعہ "مقامات محمود" مرتبہ نواب معشوق یار جنگ میں چھپ چکا ہے اور رقعہ کے آخر میں از سیالکوٹ لکھا ہے۔ حضرت صوفی نور محمد صاحب (والد محترم علامہ اقبال) کی ملاقاتیں حضرت قاضی صاحب کے ساتھ میرے خیال اور یقین کے مطابق ہمارے ہی گھر میں ہوتی رہی ہوں گی۔ (۵)

راقم کے نام ایک خط میں سید نور محمد قادری لکھتے ہیں۔

"میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی سید مظہر حسین صاحب کا بچپن اپنے ماموں صاحبان مولوی نوراللہ شاہ صاحب اور حکیم ظہوراللہ شاہ صاحب کے پاس کشمیر محلّہ میں گزرا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ میں کئی کئی گھنٹے صوفی نور محمد صاحب (جنہیں وہ میاں جی نتھو کہا کرتے تھے) کی دکان پر بیٹھا رہتا اور وہ مجھ سے مولوی چراغ شاہ صاحب کے نواسہ ہونے کی وجہ سے بہت پیار کرتے تھے۔" (۶)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کے والد بزرگوار کے حافظ عبداللہ شاہ اور ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے اور چونکہ دونوں میں دینی لگن و حمیت قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھی۔ اِس لئے ضروری ہے کہ جب بھی کوئی بزرگ یا عالم دین اُن میں سے کسی کے ہاں تشریف لاتا تو یہ بزرگ اِس سے استفادہ کرتے۔

جہاں تک قاضی سلطان محمودؒ کا تعلق ہے وہ سلسلۂ قادریہ کے بزرگ تھے۔ ۱۹۱۹ء

میں وفات پائی۔ یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ علامہ اقبال نے قاضی سلطان محمودؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور یوں سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہوئے۔

قاضی سلطان محمودؒ کے ساتھ میاں محمد بخشؒ صاحب سیف الملوک کا گہرا تعلق تھا اور اس طرح میاں صاحب کے کلام دلنواز قاضی سلطان محمود سے گہری عقیدت و ارادت کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی سلطان محمود سال میں دو دفعہ کھڑی تشریف لے گئے تھے۔ میاں محمد بخشؒ جب روحانیت کی منازل طے کر رہے تھے تو انہیں سائیں غلام محمد نے حکم دیا کہ وہ کشمیر جائیں اور شیخ احمد ولیؒ صاحب کی بیعت کریں۔ چنانچہ میاں محمد بخشؒ پاپیادہ سری نگر پہنچے۔ شیخ احمد ولیؒ سے ملاقات کی۔ اُس زیارت سے میاں صاحبؒ میں زبردست روحانی تبدیلی پیدا ہوئی۔

شیخ احمد ولیؒ جو اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے اور جن کے بارے میں منشی محمد الدین فوق نے تاریخ کشمیر حصہ سوم میں لکھا ہے۔

"آپ کے علم و فضل کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی یہاں تک کہ خراسان، ترکستان، ہندوستان اور اطراف و اکناف سے لوگ شرف ملاقات اور حصول برکات کے لئے آتے تھے۔ سائلوں کی حاجت روائی، تشنگاں علم کی پیاس بجھانے کا آپ کو خاص شوق تھا" [۷]

شیخ احمد ولیؒ نے میاں محمد بخشؒ کو کہا کہ وہ شیخ نور الدین رشی ولیؒ کے مزار پر حاضری دیں۔ چنانچہ میاں صاحبؒ اس غرض کے لئے چرار شریف گئے۔ اور وہاں سے فیض یاب ہوئے۔ شیخ نور الدین رشی ولیؒ کا شمار کشمیر کے ممتاز بزرگان دین میں ہوتا ہے۔ آپ کو علمدار کشمیر اور شیخ العالم کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کو سلسلہ ریشیت کا بانی بھی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں سلسلہ ریشیت دین اسلام کی آمد سے قبل متعارف بلکہ ارتقاء پذیر ہو چکا تھا۔ اور بقول ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی مصنف "کاشیر" (Kashir)

"سات سو سال تک بدھ مت کی ویدانت کی تعلیم کو ایرانی ماخذ سے سرایت کرنے والے اسلامی تصوف کو کشمیر نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ پیروں اور پنڈتوں نے اُسے توہم پرست بنانے کی کوشش بڑے زور وشور سے

کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تصوف اور وہم اب ایک کشمیری کی فطرت میں رچ بس گئے ہیں۔ درحقیقت وہ وہم اور تصوف کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کشمیر کے پیروں اور صوفیوں کے خیال میں طریقت کو شریعت پر ترجیح حاصل ہے لہٰذا اہل طریقت شریعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔"

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی کتاب "ہسٹری آف سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر" میں لکھا ہے۔ اب پرانے اور نئے مذاہب کی تعلیم میں گہری مماثلت کے سبب کشمیری ہندوؤں کو جو کچے شو بھگت ہیں اسلام میں کوئی چیز بار خاطر نظر نہیں آئی بلکہ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ اِس دین کے بنیادی متعقدات اِن کے اپنے عقائد سے بالکل ملتے جلتے ہیں" اِس ضمن میں پروفیسرپی۔ این پشپ نے لکھا ہے کہ

"ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام سے ہم آہنگ ہو کر کشمیر کے ریشی مسلک نے نئے تقاضوں کو پورا کیا اور وہ شکل اختیار کی جو کلام شیخ العالم (کے شلوکوں) سے مترشح ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ شیخ العالم نے اپنے پیش رو ریشیوں کو بھی خراج عقیدت ادا کیا ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ شیخ العالم نے ہی کشمیر میں ریشی سلسلہ کو اسلام کی ہمہ گیر بنیادوں پر ایک نئی آب و تاب کے ساتھ استوار کیا۔

اور بقول محمد اسد اللہ وانی "حضرت شیخ کا کوئی نیا مذہب نہیں تھا بلکہ وہ اسلام کی حدود کے اندر ہی اپنی تحریک چلا رہے تھے بلکہ اسلام کے تمام اُصول، نماز، روزہ وغیرہ کے پابند تھے۔" (۸)

آگے چل کر محمد اسد اللہ وانی لکھتے ہیں "ریشی مت کے پیرو بھی سادہ لباس پہنتے تھے۔ کاسنی اور اپچل ساگ استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات اخروٹ کے چھلکے بطور سبزی پکاتے تھے۔ اندرائن کے پھل بھی کھاتے تھے۔ بعض ریشی صرف پانی کا استعمال کرتے تھے۔ حضرت شیخ نے عمر کے آخری ایام میں تقریباً اڑھائی برس صرف پانی پیا ہے اور باقی غذا کا بالکل استعمال ہی نہیں کیا۔" (۹)

محمد اسد اللہ رقم طراز ہیں کہ

"عدم تشدد اہنسا، تزکیہ نفس اور نفسانی خواہشات کے سلسلے میں سالار

ریشیت حضرت شیخ العالم کا کلام راہنمایانہ حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت شیخ کے بعد کے ریشیوں نے اِس کلام کو اپنے لئے ناطق سمجھا اور اِس کے مطابق زندگی گزار دی۔ القصہ بدھ مت اور ریشی مت کی بہت سی قدریں مشترک ہیں اور کافی حد تک مطابقت و مماثلت ہے مگر کچھ باتوں میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ریشی لوگوں نے پہلے پہل ویدک دور کے ریشیوں منیوں اور پھر بدھ مت کے اصول اپنائے ہوں گے اور جب وہ اسلام کی تعلیمات سے روشناس ہوئے تو اِن کی عبادت کے طریقوں میں بھی فرق آیا۔"...

اس ضمن میں پروفیسر محی الدین حاجنی لکھتے ہیں

"لفظ ریشی سنسکرت زبان کا لفظ ہے جو عارفوں اور متصوفانہ زندگی کے ساتھ براہ راست میل کھاتا ہے۔ اِس سے مراد وہ شخص ہے جو بھجن گاتا ہو یعنی وہ انسان جو خدائے لم یزل سے اپنی نجات اور مکتی کے کلام موزوں میں دعا مانگ لے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اُس لفظ نے اصطلاحی لحاظ سے مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔ اب دنیائے روحانیت میں ریشی اُس شخص کو کہا جانے لگا کہ جو عرفان حق تلاش کرتے کرتے لذات دنیا سے کلیتاً کنارہ کش ہو جائے یا وہ شخص جو تلاش حق کے مسلک پر چل کر مادی چیزوں سے انحراف کو اپنا شعار بنالے۔ کشمیری زبان میں ریشی لفظ نے اپنا صحیح مقام تلاش کرتے کرتے معنی کا وہی لباس پہنچ لیا جو بقول منیرؔ عبرانی زبان کے لفظ ارسان نے پہن رکھا ہے۔ مطلب وہ شخص جو اپنی فطانت و ذہانت کے کارن لوگوں میں بزرگ اور صوفی منش مان لیا جائے، ریشی کہلاتا ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کے ریشیت سے منسلک ہونے کا تعلق ہے سبھی محقق اور مورخ اِس بات پر متفق ہیں کہ علامہ اقبال کا کشمیری برہمنوں کی "سپرو" گوت سے تعلق ہے اور اُن کے جد اعلیٰ کا نام حضرت بابا لول حج تھا۔ اِس سلسلہ میں علامہ اقبال نے ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو لکھا تھا کہ اُن کو اپنے بزرگوں کا سراغ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تصنیف تاریخ کشمیر اعظمی (واقعات کشمیر) سے مل گیا ہے۔ علامہ نے اپنے خط

میں لکھا کہ اُن کا اصل گاؤں لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ آدوِن تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ تعلقات اچھے نہ تھے۔ اِسی واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر حضر بابا نصر الدین کے مرید ہوئے۔" (۱۱)

محمد الدین فوق "تاریخ اقوام کشمیر" میں لکھتے ہیں کہ "سلطان زین العابدین بڈ شاہ کے زمانے تخت نشینی (۸۲۴ ھ وفات ۸۷۴ ھ) میں حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین ولی کے ارادت مندوں میں حضرت بابا نصر الدین ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شیخ العالم نے اپنے اشعار (کشمیری) میں اپنے اِس نامور خلیفہ کا بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ بابا نصرالدین کے مریدوں میں بابا لولی حج ایک بزرگ تھے جنھوں نے کئی حج کئے تھے اور بارہ سال تک کشمیر سے باہر سیر و سیاحت ہی میں رہے تھے چنانچہ مصنف تاریخ اعظمی لکھتا ہے کہ "دو از دوہ سال سیاحت کردہ بہ کشمیر آمدہ۔ باشارت غیبی مرید حضرت بابا نصرالدین شد و بقیہ عمر در خدمت و صحبت او گزرانید۔" (۱۲) اُن کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا لول حج یا لولی حج کے نام سے اُنھوں نے شہرت پائی۔ اُنھوں نے کئی حج پاپیادہ کئے تھے۔ لول یا لالہ یا لال کشمیری میں پیار یا عزت کا لفظ ہے جیسے بڑے بھائی کو کاک لال کہتے ہیں۔ وطن اُن کا پرگنہ آدوِن کے موضع چکو میں تھا۔ قبول اسلام سے قبل ذات کے برہمن تھے۔ گوت سپرو تھی۔ پیشہ اُن کا زراعت کاری اور زمینداری تھا۔ لیکن جب فقر اختیار کیا تو سب باتوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ آپ کی قبر چرار شریف میں احاطہ مزار شیخ نور الدین ولی کے اندر ہے جہاں اُن کے مرشد بابا نصرالدین بھی مدفون ہیں چنانچہ صاحب "تاریخ اعظم" لکھتے ہیں۔

"از ساکنان موضع چکو پرگنہ آدوِن بود۔ زنی خواستہ بود وقت زنش خوش نکردہ۔ خلع بمیان آمد۔ این معنی موجب برودت دلش از دنیا شد و بقیہ عمر در خدمت و صحبت او گزرانید۔ وقت رحلت در آستانہ چرار در جوار پیر بزرگوار آسود" (۱۳)

خواجہ محمد اعظم شاہ دیدہ مری سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ابو محمد حاجی محی الدین مسکین نے سنہ ۱۳۲۱ ہجری بمطابق ۱۹۰۳ء میں اپنی مشہور تالیف "تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار" تاریخ کبیر کشمیر ترتیب دی۔ اُس میں ریشیوں کے باب میں لولی حج کے

بارے میں لکھا ہے:

ولادتش در موضع چکو جلند پرگنہ آدوَن بود۔ ہر دو چشم و پایش کج بودند۔ پس وی را داعیہ تزویج بظہور آمد و بازنی عقد نکاح بربست۔ چوں منکوحہ اش صورت وی را بدید و بخندید۔ دلِ بابا از وے متنفر گردید۔ پس کمر ہمت بربست برآمد، سفر حرمین شریفین نمود و پس از تشریف یابی بزیارت مبارک چوں مراجعت بجانب کشمیر کرد در خدمت بابا نصرالدین رومی ارادت آورده گوئے تجرید و تفرید ربود، چوں رحلت کرد در مقبرۂ مرشد آسود۔ و بعضے نوشتہ اند در قریہ زالرہ پرگنہ کامراج مدفون است۔ [۱۱۴]

ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں "مسکین کا بیان اعظم دیدہ مری سے قدرے مختلف ہے اور دونوں حضرات یہ نہیں بتاتے کہ اُنہوں نے یہ مواد کہاں سے حاصل کیا ہے؟ ہمیں یہ اطلاع علامہ کے خط سے ملتی ہے کہ اُنہیں یہ معلومات اپنے والد محترم سے حاصل ہوئی تھیں کہ شیخ بابا لولی حج اُن کے جد اعلیٰ تھے۔ البتہ یہ پتہ نہیں ملتا کہ لولی حج سے کس پشت میں حضرت علامہ کا رشتہ منسلک ہوتا ہے۔ [۱۱۵]

کشمیر کی تواریخ سے بابا لول حج کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں اُن کے مطابق آپ کا تعلق برہمنوں کی گوت سپرو سے تھا۔ اُن کے ایک عرصہ تک اپنی اہلیہ سے تعلقات خوشگوار نہیں رہے اور دین اسلام اور رسول اکرم سے عشق کے باعث اپنا آبائی مذہب چھوڑا اور بابا نصرالدین خلیفہ چہارم شیخ نورالدین رشی ولی کے دست حق پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور یوں ریشیاں سے وابستگی ہو گئی۔ بابا نصرالدین کے تذکرہ میں اُن کے جن مریدان باصفا کا ذکر ملتا ہے اُن میں بابا لول حج کا نام موجود ہے اور یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ریشی کوئی ذات یا گوت نہیں ہے بلکہ یہ زہاد کا طبقہ ہے جو اِس نام سے پکارا جاتا ہے۔ جن ریشی حضرات کا ذکر "تواریخ کشمیر" میں محفوظ ہے، اُن میں سے کچھ لوگ راجپوت کچھ میر، بٹ اور زمیندار تھے۔ اِس لئے علامہ اقبال کے جد اعلیٰ ریشی کہلائے اور اِس سے اِن کی سپرو گوت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ جہاں تک شیخ نورالدین رشی ولی کا تعلق ہے وہ سلسلۂ ریشیت کے سرخیل تھے۔ محمد اسد اللہ دانی کا یہ خیال ہے کہ "ریشیت یا سلسلۂ ریشیاں خالص کشمیری سلسلہ ہے جو اسلام کے اندر پنپنے والے صوفیوں کے گروہ کی مانند ہے۔ ریشیوں

میں اسلام سے قبل اور بالخصوص حضرت شیخ العالم سے پہلے کہیں بھی یہ سلسلہ باقاعدہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ حضرت شیخ العالم پہلے رشی ہیں جنھوں نے اِس سلسلہ کا پہلی بار آغاز کیا اور سرخیل کی حیثیت اختیار کی۔ اُنھوں نے اپنے ایک اشلوک میں اپنے سے پہلے مقتدر ریشیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اول رشی احمد بہشی
دویم حضرت اویس آوٗ
تریم رشی زلکا رشی
ژوریم حضرت پلاس آوٗ
پونژیم رشی رمہ رشی
شیم حضرت میران آوٗ
ستی مس کورہم وشناہشتی
بہ کس رشی مئے کیلہ ناوٗ

ترجمہ۔ رشی سلسلہ میں پہلے حضرت احمد ہوئے ہیں۔ دوسرا رشی حضرت اویس قرنی ہے۔ زلکا رشی تو تیسرے رشی ہو کر گزرے ہیں جب کہ چوتھے رشی حضرت پلاس تھے۔ پانچویں رشی رمہ رشی تھے اور چھٹے حضرت میران ہو گزرے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں رشی سلسلے کا ساتواں رشی ہوں مگر حقیقتاً میں کوئی رشی نہیں ہوں کیونکہ میرا رتبہ بلند نہیں ہے۔ (۱۶)

ان کے علاوہ شیخ نور الدین رشی ولی نے چند ایسے ریشیوں کا ذکر کیا ہے جو اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

حضرت رمہ ریشن
تمی سورگس ارزن جائے
تیھن ہو بن ریشن
کر بندن توشہ خودائے
ونڈک ہو بن ریشن
تمی کنز ھس سوتگن مائے

تھتھن ہو بن ریشن
کر بندن توشہ خودائے
پلاس ریشی او سو
تمی پھر تس لیونی وڑائے
تس شب روز موٗتھ نسو
کر بندن توشہ خودائے

ترجمہ۔ حضرت رمہ ریشی نے اپنے لئے جنت میں جگہ بنالی۔ ایسے ریشیوں کی خدمت کرنے سے اللہ تم پر مہربان ہو گا۔ ڈنڈک دن کے زنک ریشی نے خود رو جھاڑیوں کا شیرہ نکال کر گزر بسر کی۔ ایسے ریشیوں کی خدمت کرنے سے اللہ تم پر مہربان ہو گا۔ پلاس ریشی بھی کیا ریشی تھا وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے سفیدے کو چاٹا کرتا تھا اور رات دن اللہ کو یاد کرتا تھا۔ ایسے ریشیوں کی خدمت کرنے سے اللہ تم پر مہربان ہو گا۔

موتی لال ساقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

حضرت شیخ کے عہد میں ریشیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ریشی صرف نام کے ریشی رہ گئے تھے۔ وہ محض رنگے سیار تھے جو اپنی مطلب براری کے لئے ریشیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے ان لوگوں کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے۔

کیلک ریشی پت ریشی
یمن ماز کھینس کم
کھا سی زہ تھون نشم نشی
اس گوگل بیس کرم
تہ کھیتھ یلے خدائے مشی
ریشے یم تے گلہ دان کم

ترجمہ۔ آج کے ریشی بہروپئے ہیں جن کا پیٹ گوشت کھا کر بھی نہیں بھرتا۔ یہ لوگ شلغم اور ناگ کے دو طبق ساتھ ساتھ کھانے کے لئے رکھ دیں گے۔ یہ سب کچھ کھا کر بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا پھر اگر تم لوگ ریشی ہو تو کن لوگوں کو چور کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ریشیت کا یہ بکھراؤ دیکھ کر شاید حضرت شیخ کو ریشی سلسلے کو از سر نو مجتمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ چنانچہ اُنہوں نے تازہ تواریخی حقیقتوں اور ضروریات کے پیش نظر اِس سلسلہ کو ترتیب دیا جو کافی دیر تک ایک زور دار اور بااثر تحریک کی صورت میں کشمیر پر چھایا رہا۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے اپنی سیاحت کے دوران بابا نصرالدین کو اننت ناگ میں ایک جگہ کچھ دیر رکنے کے بعد کہا۔ ''اب سے دو سو سال بعد اِسی جگہ ریشی مولو نام کا ایک شخص قیام کرے گا اور اِس کے ساتھ ہی ریشی سلسلہ دم توڑ دے گا۔'' واقعہ بھی یہی ہے کہ گزشتہ تین چار سو برسوں کے دوران ریشیت بحیثیت ایک تحریک کے ختم ہو چکی ہے اور اب ریشی سلسلہ محض ریشی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

علامہ اقبال کے جد اعلیٰ بابا لول حج، بابا نصرالدین کے مرید خاص تھے اور اِس حوالہ سے ریشی تھے اور اِس سلسلے کے سرخیل شیخ نورالدین رشی ولی، جن بزرگوں کو ریشی تسلیم کرتے ہیں اُن میں مولانا روم'' بھی ہیں اور حضرت عبدالقادر گیلانی'' بھی۔ مولانا روم'' کو علامہ اقبال نے پیر رومی مانا ہے اور سلسلۂ قادریہ میں خود بیعت تھے اور یوں اگر علامہ اقبال کو اِس حوالہ سے ریشی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مگر اُنہوں نے تازیست اِس نظریہ تصوف کو ہدف تنقید بنایا اور جہاں خانقاہوں سے نکل کر رسم شبیری ادا کرنے کی تلقین کی وہاں یہ بھی کہا کہ

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

حواشی

۱۔ خواجہ نقش بند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔ (اقبال نامہ ص ۷۹)

۲۔ "ضیائے حرم" اپریل ۱۹۷۵ء

۳۔ "ضیائے حرم" اپریل ۱۹۷۵ء

۴۔ "آئینہ لاہور" اپریل ۱۹۶۵ء

۵۔ "ضیائے حرم" اپریل ۱۹۷۵ء

۶۔ سید نور محمد قادری بنام کلیم اختر (۱۶ فروری ۱۹۷۸ء)

۷۔ تاریخ کشمیر حصہ سوم ص۔ ۹۹

۸۔ ایضاً ص ۱۰۱

۹۔ ایضاً ص ۱۱۱

۱۰۔ ریشیات ص ۱۱۱

۱۱۔ کلیات مکاتیب اقبال ۲: ۶۰۸

۱۲۔ تاریخ اعظمی ص۔ ۷۲

۱۳۔ تاریخ اعظم ص۔ ۷۲

۱۴۔ تاریخ کبیر کشمیر از مسکین صفحات (۱۲۳۔ ۱۲۴)

۱۵۔ صحیفہ اقبال نمبر ۳۔ ۱۹۷۳ء۔ ص ۶

۱۶۔ (برج نور صفحہ ۲۸۵)

اقبالؒ اور غنی کاشمیریؒ

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کشمیر کے فارسی زبان کے شعرائے کرام میں جتنی مقبولیت اور شہرت غنی کاشمیریؒ کو حاصل ہوئی اتنی اور کسی کشمیری شاعر کو نصیب نہیں ہو سکی۔ یہ بات درست ہے کہ ایک عرصہ دراز تک اُن کا کلام زمانے کی بے اعتنائیوں اور ناقدروں کی جانب دارانہ روش کے باعث اربابِ فکر و فن کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا اور اُن کی شخصیت اور شاعری پر اتنا تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق اور حق دار تھے۔ بہر نوع ۱۹۱۹ء میں اُس ادبی ناانصافی کے خلاف سب سے پہلے ممتاز مورخ اسلام مولانا محمد اکبر خان نجیب آبادی نے قلم اٹھایا اور غنی کاشمیری کے حالات زندگی اور شاعرانہ محاسن پر ایک مختصر سا کتابچہ ترتیب دیا اور "موجب نگارش" یہ بتائی کہ:

"چند تذکرے جن سے میں اپنی آنکھیں روشن کر سکا ہوں اُن میں "خزانہ عامرہ" تو غنی کا نام تک نہیں لیتا۔ "آتش کدہ" کا لائق و ذی علم مگر مغرور و بدمغ مؤلف صرف ڈیڑھ سطر میں غنی کا تذکرہ اور نمونہ کلام سب ختم کر دیتا ہے۔ میر حسین دوست سنبھلی نے بھی اپنے "تذکرۂ حسینی" میں غنی کا ذکر چند سطروں سے زیادہ نہیں کیا۔ سراج الدین علی خان آرزو کے تذکرہ "مجمع النفائس" اور مرزا محمد افضل سرخوش کے تذکرہ کا مختصر اقتباس دیوان غنی کے خاتمہ یعنی آخری صفحہ میں درج ہے جو حد سے زیادہ مجمل ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب کا تذکرہ "شمع انجمن" بھی کوئی ایسی روشنی غنی کے حال پر نہیں ڈال سکا جس سے کوئی مفید علم حاصل ہو سکتا۔ اور کسی

کی شکایت کیا کی جائے جب کہ مولانا شبلیؒ نے بھی اپنے قابل قدر تذکرہ شعرالعجم میں ابو طالب کلیم اور طالب آملی کا ذکر تو کیا لیکن غنی کی طرف مطلق التفات نہیں فرمایا۔ حالانکہ غنی کی شاعری کا مقام طالب اور کلیم کی شاعری سے اُسی قدر زیادہ بلند ہے جس قدر کہ طالب و کلیم کی دُنیوی دولت و ثروت کا مرتبہ چشم ظاہر بیں کے لئے بلند تھا۔"(۱)

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہو گا کہ ڈاکٹر ریاض احمد شروانی نے ایک تحقیقی فارسی کتاب "غنی کشمیری احوال و آثار و سبک اشعار" کے عنوان سے لکھی ہے جس پر انہیں تہران یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی تھی۔ اِس کتاب کے ۲۸ صفحات ہیں اور ۱۹۶۸ء میں یہ کتاب سری نگر سے شائع ہوئی تھی۔ تہران میں احمد کرمی نے ۲۰۳ صفحات پر مشتمل دیوان غنی کاشمیری شائع کیا جو بے حد مقبول ہوا ہے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تمام عمر خدمت اسلام اور تبلیغ دین میں گزری اور انہوں نے اپنی زندگی میں یہ اُصول قائم رکھا کہ اُن کے قلم سے کوئی ایسی چیز نہ نکلے جو احکام خداوندی، ضابطہ محمدیؐ اور دائرہ اخلاق کے منافی ہو یا پھر کسی کی بے جا مخالفت اور خوشامد پرستی کی دلیل ہو —— اپنے اِس شریفانہ انداز فکر و عمل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں آج مسرور و خوش دل ہوں کہ مجھ کو ایک ایسے شخص کے حالات فراہم کرنے اور اِس کے کلام پر نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے جو اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں کرتا تھا اور جس سے ملتا تھا صاف قلب اور پاک باطنی کے ساتھ ملتا تھا اور میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ بڑے بڑے عالی جناب ملک الشعرا مگر اپنے ضمیر کا خون کرنے والے قصیدہ خوان خوشامدی اور منافق شاعروں میں سے کسی کی سوانح عمری لکھنے میں میرا قلم آلودہ نہیں ہوا۔"(۲)

یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ علامہ اقبالؒ کی مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی خط و کتابت بھی تھی اور علامہ اقبالؒ نے مولانا مرحوم کی علمی و مذہبی خدمات کو سراہا ہے۔

غنی کاشمیری کا پورا نام محمد طاہر تھا۔ آپ کشمیر کے مشہور عشائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو ساڑھے تین سو سال سے وہاں آباد تھا۔ آپ ایک متوسط گھرانے میں ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ خوبصورت، ذہین اور فطین تھے۔ تاریخ حسن

(جلد دوم) میں مذکور ہے کہ غنی کے آباؤ اجداد حضرت شاہ ہمدان" کے ساتھ وادی کشمیر میں وارد ہوئے تھے۔ سرینگر میں رنبیر گنج کے عقب میں محلّہ راجوری کدل میں آج بھی خاندانِ غنی کی ایک شاخ موجود ہے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم محلّہ قطب پورہ کے فارسی مکتب میں حاصل کی جو ملا محسن فانی کے زیر اہتمام تھا جو خود بہت بڑے شاعر اور اُمور مذہبیہ کے ماہر تھے۔ ملا محسن فانی اپنے دور کے ممتاز اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کا شیخ یعقوب صرفی گنائی کے خاندان سے تعلق تھا۔ ملا محسن فانی، شہزادہ دار شکوہ کی ادبی و شعری اور مذہبی محفلوں کے جان سمجھے جاتے تھے اور خود اُن کے ہاں بھی اہل علم و سخن کی محفلیں برپا رہتی تھیں۔ غنی کاشمیری بعض دینی و علمی معاملات میں اپنے استاد سے آگے تھے اور اِس بات پر سبھی تذکرہ نویس متفق ہیں کہ جب کبھی بھی ملا محسن فانی کو کوئی مشکل یا پیچیدہ علمی و دینی مسئلہ پیش آتا تو آپ صرف غنی کاشمیری ہی سے رجوع کرتے —— غنی کاشمیری نہ صرف شعر و سخن میں یگانہ تھے بلکہ دینی اُمور میں بھی اُن کی حیثیت مسلمہ تھی۔ آپ کو تصوف سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ حاجی محی الدین مسکین اپنی کتاب "تحائف الابرار فی ذکر الاخیار" میں غنی کے بھائی محمد زمان نافع کی نسبت لکھتے ہیں کہ... "آداب طریقت باطنی از برادر خود ملا طاہر غنی حاصل نمودہ بود"... ملا حسن فانی نے غنی کا تخلص بھی عمر کے اعتبار سے منتخب کیا تھا جو ابجد کے حساب سے ۱۰۶۰ھ بنتا ہے۔

غنی کاشمیری ایک صوفی منش انسان تھے۔ طبیعت میں خلوت نشینی اور درویشی تھی۔ گوشہ نشینی کو پسند کرتے تھے اور بحث و مباحثوں سے بھی علیحدہ رہتے تھے۔ ہر وقت شعر و شاعری میں مست رہنے لگے جس سے صحت پر برا اثر پڑا۔ دوستوں کو سخت تشویش ہوئی، شاگرد بھی پریشان ہو گئے۔ خود فرماتے ہیں:

از کشتہ شدن چہرۂ عاشق نشود زرد
این داغ بہ پیشانیٔ سیماب نہادند

غنی کاشمیری نے جس دور میں شاعری کے میدان میں قدم رکھا اُس زمانے میں کشمیر میں شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا اور باذوق اور علم دوست حاکموں کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی شعراء کرام کا ایک جم غفیر دربار میں موجود رہتا تھا۔ لیکن غنی کاشمیری حاکموں کی محفلوں سے بے نیاز ہو کر اپنے حجرے میں گوشہ نشین رہتے تھے۔ اِس کے باوجود اُن کی

شاعرانہ عظمت کے چرچے کشمیر کی گل پوش وادی سے نکل کر دور دور تک پھیل گئے تھے اور ممالک غیر سے کئی شاعر آپ کے نیاز حاصل کرنے کے لئے آتے تھے جن میں میرزا صائب بھی شامل تھے۔ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی سوانح مولانا غنی میں لکھتے ہیں:

"شاعروں کی تکریم و عزت ان کی خوشحالی و بلند اقبالی اپنے انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور ملک میں ہر طرف مال و دولت کی نہریں بہہ رہی اور عیش و عشرت کی لہریں، ہونہار نوجوانوں کو شاعری کی طرف بہائے لیے جا رہی تھیں۔ اسی زمانے یعنی عہد شاہ جہانی میں غنی کاشمیری نے ہوش سنبھالا اور زورِ سخن کے ذریعہ گوشہ گمنامی سے سر باہر نکالا۔ لیکن یہ معلوم ہو کر لوگوں کو حیرت ہو گی کہ غنی نے جاہ و منصب اور مال و دولت کو ہمیشہ نہایت ہی نفرت کی نظر سے دیکھا۔" (۳)

آگے چل کر مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی لکھتے ہیں:

"فارسی شاعری کے انتہائی عروج و ترقی کا زمانہ تھا۔ غنی پیدا ہوئے۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ غنی نے نہ کسی امیر و وزیر سے کوئی صلہ و انعام حاصل کیا نہ کسی سلطان و بادشاہ کے دربار میں پہنچنے کی کوشش کی۔ نہایت افلاس و آزادی و خودداری کی حالت میں زندگی بسر کی۔" (۴)

غنی کاشمیری کی غیرت، حمیت اور شان استغنا نے انہیں کبھی بھی کسی حاکم کے پاس جانے نہ دیا۔ اِس معاملے میں سبھی مورخین اور محققین اتفاق کرتے ہیں کہ جب:

"شہنشاہ ہند حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ غنی کا کلام سنتے اور اُن کے کمالات سے واقف ہو کر مشتاق ملاقات ہوئے اور اپنے وائسرائے یعنی حاکم کشمیر سیف خان کو لکھتے ہیں کہ ملا محمد طاہر غنی کو عزت و احترام کے ساتھ ہماری خدمت میں دہلی کی طرف روانہ کر دو۔ سیف خان غنی کو اپنے پاس بلا کر خوش خبری سناتا ہے کہ شہنشاہ ہند نے آپ کو یاد کیا ہے۔ غنی جانے سے انکار کرتے اور کہتے ہیں کہ بادشاہ کو لکھ دو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے۔ سیف خان کہتا ہے کہ میں بھلا عاقل و فرزانہ کو دیوانہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ غنی اِسی وقت کپڑے پھاڑ کر دیوانوں کی طرح سیف خان کے دربار

سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور تیسرے دن فوت ہو جاتے ہیں۔" (۵)

غنی کاشمیری نے تمام عمر درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ اُن کے بھائی محمد زمان نافع بھی مدرس تھے۔ اُن کی ابتدائی زندگی کے دور میں حاکم کشمیر ظفر خان احسن تھا جس کے دربار سے صائب، کلیم اور قدسی ایسے جید عالم اور ممتاز شاعر وابستہ تھے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ غنی کاشمیری کی زندگی میں شہنشاہ شاہجہان چار بار سری نگر آیا لیکن غنی ایک بار بھی بادشاہ کے حضور حاضر نہ ہوا —— غنی کاشمیری کے استغنا کے بارے میں اُوپر جو واقعہ درج کیا گیا ہے، تذکرہ نصر آبادی نے یوں بیان کیا ہے جسے اُن کے بعد کے بھی ناقدوں اور مورخوں نے نقل کیا ہے۔

"مسموع شد کہ پادشاہ والا جاہ ہندوستان بہ سیف خان حاکم کشمیر نوشت کہ او را روانہ پائے تخت نماید۔ سیف خان او را طلبیدہ تکلیف رفتن بہند نمود او ابا کرد و گفت عرض کنید کہ دیوانہ است۔ خان گفت عاقلی را چون دیوانہ بگویم۔ او فی الفور گریبان خود را دریدہ دیوانہ وار روانہ خانہ شد۔ بعد از سہ روز فوت شد۔"

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

"اپنے اُس محترم شاعر کے اچانک مشتعل ہو جانے والے جذبے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہم اوراق تاریخ کی مزید چھان بین کرتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر ساموگڑھ اور کھجوا میں باری باری داراشکوہ اور شجاع کو شکست دینے کے بعد ۱۰۶۹ھ سے تخت طاؤس کا مالک بن چکا تھا۔ داراشکوہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ شجاع ایران کی سمت بھاگ گیا تھا اور شاہجہان قید میں سات سال گزارنے کے بعد عسرالبول کی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۰۷۶ھ میں فوت ہو چکا تھا اور اِس رعیت پرور اور رفیع المنزلت، شہنشاہ کی میت کو قلعے کی دیوار گرا کر چند خواجہ سرا بالکل بے کسی کی حالت میں دفن کرنے لیے لے گئے تھے۔ یہی وہ سال ہے یعنی ۱۰۷۶ھ جب سیف خان ناظم مقرر ہو کر کشمیر پہنچتا ہے اور ہمیں صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب اہالیان ملک کے دلوں میں شاہجہان کے اِس حسرت ناک انجام کا غم ابھی تازہ تازہ تھا تو

اورنگ زیب عالمگیر کی طرف سے محمد طاہر نے غنی کو شاہجہان آباد پہنچنے کی دعوت دی۔ اِس مرحلے پر ملا صاحب کی سیرت پر مزید غور کر لینا چاہئے۔ وہ فقہ اسلامی کی بہترین اقدار پر دل و جان سے عمل پیرا ہو کر زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کا ایک شعر ہے:

خوشا عہدی کہ مردم آدم بے سایہ را دیدند
غریب است این زمان گر سایہ آدم شود پیدا

اور غنی کی یہی شان قلندری اقبالؒ کو بھاگئی کہ اُس نے جاہ پسند ماحول سے سمجھوتہ نہ کیا اور اپنی علمی و دینی بصیرت کو عوام الناس میں عام کر دیا!

کلام غنی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ غنی کاشمیری کو اپنے عہد اور اِس کے لوگوں سے ہمیشہ شکایت رہی اگر ایک طرف ناقدری عالم کا گلہ تھا تو دوسری طرف اپنی قسمت سے بھی شاکی رہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ اظہار غنی کا بحیثیت ایک انسان کے ہے اور انسانی جذبے کا پیانہ کبھی نہ کبھی چھلک ہی پڑتا ہے۔ فرماتے ہیں:

انقلاب نعم آباد جہاں می خواہم
شاید ایں طالع برگشتہ من برگردد
نیک و بد را امتیازے نیست در بازار دہر
می شود در ہر ترازو سنگ با گوہر طرف
در محفل خود بار مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
کس بعد مرگ گریہ بعالم نمی کند
در زندگی چو شمع بگریم بحال خویش

یہ درست ہے کہ غنی کاشمیری نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا تھا اور یہ انکار اُس کی شان خودداری کے عین مطابق تھا لیکن اُس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے وطن عزیز کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک غیرت مند محب وطن تھا اور اُس کو اپنی سرزمین سے اتنی محبت و عقیدت تھی کہ ایک بار جب اُسے کشمیر سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تو بے قرار ہو گیا:

کرد است ہوائے بند دلگیر مرا
اے بخت رساں بہ باغ کشمیر مرا

غنی کاشمیری کی اِس درویشانہ زندگی، شانِ خودداری، روحِ آزادی ہی کی بنا پر یہ اقبالؒ کے ممدوح بنے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں غنی کی عظیم شخصیت، شاعرانہ فضیلت اور غیرت و حمیت کا جابجا ذکر کیا ہے اور بقول پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، علامہ اقبال:

"کشمیر کے فارسی اساتذہ کے اِسی طرح قائل تھے جس طرح دوسرے شعراء کے اور اُن کے بہت سے اشعار اُنھیں ازبر تھے۔ طاہر غنی کاشمیری کو خصوصیت سے یاد کرتے تھے۔ اُن کا ذکر اور اُن کے اشعار اقبال کے کلام میں بطور تضمین کے آئے ہیں۔"(۶)

چنانچہ "بانگ درا" میں جو نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" (ص ۱۸۰) ہے اُس کا آخری شعر غنی کاشمیری ہی کا ہے:

غنی روزِ سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

غنی کی ایک غزل کے دوسرے شعر یہ ہیں:

جنونی کو کہ از قید خرد بیرون کشم پارا
کنم زنجیر پای خویشتن دامان صحرا را
اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را
ببزم می پرستان سر کشی بر طاق نہ زاہد
کہ میریزند مستان بی محابا خون مینا را
ندارد رہ بگردون روح تا باشد نفس در تن
رسائی نیست در پرواز مرغ رشتہ برپا را

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جب علامہ اقبالؒ ۱۹۲۱ء میں کشمیر گئے تو وہاں پر اُنھوں نے کشمیر کے موضوع پر تین نظمیں لکھیں۔ ایک "ساقی نامہ" دوسری "کشمیر" اور تیسری

"غنی کاشمیری"۔ "ساقی نامہ" میں کشمیریوں کی حالت زار کے بارے میں فرمایا:

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

دوسری نظم 'کشمیر' میں لکھتے ہیں:

رخت بہ کاشمر گشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر

تیسری نظم غنی کاشمیری کے بارے میں ہے جس میں غنی سے متعلق اِس واقعہ کو نظم کیا ہے جسے مولانا محمد الدین فوق نے "مشاہیر کشمیر" میں یوں بیان کیا ہے۔ فوق مرحوم لکھتے ہیں:

"غنی نے اپنے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا حجرہ بنا رکھا تھا۔ وہیں بیٹھ کر فکر سخن فرماتے تھے۔ ایک روز کوئی دوست آیا تو حجرے کے دروازے کھلے پائے مگر غنی کہیں نظر نہ آئے چنانچہ ناکام واپس چلے آئے۔ دوسری مرتبہ پھر وہی دوست آئے تو حجرے کے دروازے بند پائے۔ دستک دی، غنی نے دروازہ کھولا اور دوست کو خوش آمدید کہا۔ انہوں نے حیرت کے ساتھ استفسار کیا کہ میں ایک مرتبہ پہلے آیا تھا تو آپ نہ تھے اور کواڑ کھلے تھے۔ اب آپ موجود ہیں اور کواڑ بند تھے۔ غنی نے جواب دیا کہ متاع مکان تو میں ہی ہوں جب میں نہ ہوں تو دروازہ بند کرنا بے سود اور جب کہ میں موجود تھا دروازہ بند ہونا ضروری تھا۔"

غنی کاشمیری کے بارے میں علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر
نوا سنج کشمیر مینو نظیر

چو اندر سرا بود در بستہ داشت
چو رفت از سرا تختہ را وا گذاشت
یکے گفتش اے شاعر دل رسے
عجب دارد از کار تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر
فقیر و باقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاراں رواست
دریں خانہ جزمن متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش
متاعے گرانے ست در خانہ اش
چوآں محفل افروز درخانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

یہاں سب سے زیادہ غور و فکر والی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے کشمیریوں کو یہ درس دیا ہے کہ جب تک غنی ایسی غیرت و حمیت پیدا نہیں کرو گے تمہاری غلامی اور مقہوری ختم نہیں ہو گی۔ یہ تینوں نظمیں 'پیام مشرق' میں موجود ہیں جو علامہ اقبالؒ کے سفر کشمیر کے بعد ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبالؒ غنی کی شخصیت و شاعری دونوں سے بے حد متاثر تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غنی بھی اُن کے محبوب ممدوحین میں سے تھے تو غلط نہ ہو گا۔ وہ غنی کے شاعرانہ محاسن کے معترف تھے۔ اپنے ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کو لکھتے ہیں:

"اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کی رو سے بیدل اور غنی کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔" (۷)

اپنے ایک مضمون میں میر غلام احمد کشفی لکھتے ہیں کہ:

"غنی کاشمیری کی اِس خصوصی صفت کو شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال رحمت اللہ علیہ نے ہی کما حقہ سمجھا۔ اِس لیے کہ وہ خود بھی غنی کاشمیری کی طرح حریت فکر اور عروج انسانیت کے نقیب تھے۔ شاعری اور فلسفہ میں ہر کہ

وم سے خراج تحسین حاصل کرنے کے باوجود اُن کے کلام کا محور آزادی اور عروج آدمیت رہا بلکہ یوں کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ اُن کی شاعری حریت فکر و نظراور عروج انسانیت کا درس تھی۔"

آگے چل کر میر کشفی لکھتے ہیں:

"اِس میں شک نہیں کہ حضرت علامہ اقبال" کا کشمیر کے ساتھ ایک خصوصی رشتہ تھا۔ اُنھوں نے اِس خطہ پر بہار کے باغ و راغ کی تعریف و توصیف میں بھی کمی نہیں کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ شاعر تھے تو آفاقی نوعیت کے اور اگر حریت فکر و نظر کے نقیب تھے تو اُن کا دائرہ عمل "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" تھا۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے دنیا کے گوشے گوشے سے وہ جواہر یکتا ڈھونڈ نکالے جنھوں نے انسانیت کے عروج و آزادی کا پھریرا اڑایا تھا۔ اُن ہی میں طاہر غنی کاشمیری بھی ایک تھے۔"(۸)

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ علامہ اقبال" کو اوائل عمر ہی سے کشمیر دیکھنے کی آرزو تھی جس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اُن میں ایک وجہ غنی کاشمیری کی لحد کی زیارت بھی تھی چنانچہ ۲۸ جون ۱۹۱۷ء کو اُنھوں نے فارسی زبان کے عظیم ممتاز شاعر مولانا غلام قادر گرامی جالندھری کو لکھا:

"کیا آپ امسال کشمیر چلیں گے؟ اگر ارادہ ہو تو لکھیے۔ ممکن ہے کہ میں بھی آپ کا ساتھ دوں۔ کشمیر کی سیر کا آپ کی معیت میں لطف ہے۔ غنی کاشمیری کی روح خوش ہو گی کہ گرامی جالندھری اُس کے مزار پر آئے ہیں۔"(۹)

اس ضمن میں ڈاکٹر محمد صابر آفاقی لکھتے ہیں:

"مجھے کسی کتاب سے تو شہادت نہیں ملی لیکن یقین ہے کہ ۱۹۲۱ء کے سفر کشمیر کے موقع پر علامہ اقبال نے اپنے محبوب و پسندیدہ شاعر غنی کے مزار پر حاضری دی ہو گی۔"(۱۰)

سرینگر میں غنی، عالی کدل میں اپنے استاد ملا محسن فانی کے مقبرے میں آسودہ خاک ہیں۔ اُن کا سال وفات ۱۰۷۹ھ بمطابق ۱۶۶۰ء ہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے ایک شاگرد محمد علی ماہر نے اُن کے کلام کو مرتب کیا جسے نول کشور نے شائع کیا تھا۔ اُن کی

وفات پر کئی قطعات کہے گئے۔ ایک قطعہ یہ ہے:

چو داوش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی
غنی سر حلقہ احباب و در نکتہ دانی شد
تہی چوں گرد بزم شیخ را گفتند تاریخش
کہ آگاہے سوے دارا لبقا از دار فانی شد

علامہ اقبالؒ کی غنی کاشمیری سے عقیدت و ارادت کی معراج یہ ہے کہ جب وہ پیر رومی کی رفاقت و قیادت میں 'جاوید نامہ' میں "آں سوئے افلاک" جاتے ہیں تو وہاں انہیں امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی (شاہ ہمدان) اور ملا طاہر غنی کاشمیری کی زیارت ہوتی ہے اور پاک روحوں کی اِس بستی میں اقبال کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے:

جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را
گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں (غنی)

علامہ اقبال اِس ندا کو سن کر پریشان ہو جاتے ہیں اور مولانا روم سے پوچھتے ہیں کہ اے رہبر! بتایہ کس کی آواز ہے۔ اِس پر رومی فرماتے ہیں کہ یہ تو:

شاعر رنگیں نوا طاہر غنی
فقر او باطن غنی ظاہر غنی

جو اپنے وطن کی حالت زار کے بارے میں حضرت امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی سے کہہ رہا ہے کہ اے سید السادات سالارِ عجم میرے وطن اور اہل وطن پر بھی نظر کرم ہو کیونکہ آپ کی نظر

یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ

یہاں پر اقبالؒ شاہ ہمدان سے چند سوالات کرتے ہیں اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کا ذکر مضمون اقبال اور شاہ ہمدان میں ہے۔ لیکن اقبال غنی کاشمیری کے حوالے ہی سے شاہ ہمدانؒ کو کہتے ہیں کہ:

ایں مشت پر کجا و سرود ایں چنیں کجا
روح غنی است ماتمی مرگ آرزوے

باد صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گوئی
دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

غنی کاشمیری کی اس آہ زاری سے شاہ ہمدان متاثر ہوتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ اس غلامی کو توڑنے کے لیے جرات اور قربانی کی ضرورت ہے۔ غنی اس درس عمل کو سنتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بسنے والوں کو آزادی و حریت کے ذوق و شوق سے تو کشمیری الاصل سیاست دانوں نے ہی آشنا کیا ہے:

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد؟
صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالہ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہ شان فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامنگیر ماست
مطلع ایں اختراں کشمیر ماست
خاک مارا بے شرر دانی اگر
بردرون خود یکے بہ کشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست
ایں دم باد بہاری از کجاست
ایں ہماں باد است کز تاثیر او
کوہسار ما بگیرد رنگ و بو

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ غنی کاشمیری بہت بڑے حریت پسند تھے۔ اقبال کے آباؤ اجداد بھی برہمن تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کے بزرگ بھی برہمن تھے۔ بہرنوع ایک دوسرے مقام پر 'روح غنی' اقبال کی زبان میں یوں

گویا ہوئی:

کاروانہا را صدائے تو درا
تو زاہل خطہ نومیدی چرا؟
دل میانِ سینہ شاں مردہ نیست
اخگر شاں زیرِ یخ افسردہ نیست
باش تابینی کہ بے آواز صور
ملتے برخیزد از خاک قبور
غم مخور اے بندۂ صاحب نظر
برکش آں آہے کہ سوزد خشک و تر
شہر ہا زیرِ سپہر لاجورد
سوخت از سوزِ دلِ درویش مرد
سلطنت نازک تر آمد از حباب
از دمے او را تواں کردن خراب
از نوا تشکیلِ تقدیرِ امم
از نوا تخریب و تعمیرِ امم
نشترِ تو گرچہ در دلہا خلید
مر ترا چونانکہ ہستی کس ندید
پردۂ تو از نوائے شاعری است
آنچہ گوئی ماورائے شاعری است
تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

غنی کاشمیری کی انفرادیت کردار کی عظمت اور وطن سے محبت کی اِس سے زیادہ اور کیا مثالیں مل سکتی ہیں جو اُوپر بیان کی گئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی خودداری اُن ہی انسانوں میں پیدا ہوتی ہے جن کے دل میں خوف خدا کے سوا اور کوئی خوف نہ ہو اور جن کی نگاہوں میں دنیاوی عیش و عشرت اور جاہ و طلب بے بنیاد اور بے حقیقت چیزیں ہوں۔

اُن وجوہات کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ غنی کاشمیری دنیا کے اُن چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے کبھی کسی کی مدح میں نہ تو کوئی قصیدہ لکھا اور نہ کسی سے انعام و اکرام کے طالب ہوئے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُنھوں نے کشمیر کے ایک صوبے دار اسلام خان کی وفات پر مرثیہ لکھا اور وہ بھی اس نقطۂ نظر سے کہ:

"صوبہ داران کشمیر میں اسلام خان ایک سچا پکا مسلمان اور عابد و زاہد شخص تھا، اِس لیے غنی کو اسلام خان سے کبھی ملنے میں کوئی باک و تامل نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ غنی نے کبھی کسی بادشاہ یا صوبے دار کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا تھا۔ اسلام خان کے مرنے کی خبر سن کر آبدیدہ ہو گئے اور یہ قطعہ تاریخ وفات لکھا:

حیف کز فوت قدوۂ امرا
یہ پر داغ شد نصیب سپاہ
جس زیں مصرعہ از زبانِ غنی
مرد اسلام خانِ والا جاہ "(۱)

الغرض غنی کاشمیری —— اقبال کے مثالی مرد درویش اور مرد حر تھے جنھوں نے کشمیریوں کو عزت اور حریت کے ساتھ جینے کا درس عمل دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ محمد اقبال نے آزادی کے ذوق و شوق کی داستان اِسی باحمیت انسان کی زبان بیان کی ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ برصغیر کے رہنے والوں کو آزادی دلانے والے کشمیری ہی تھے جو آج خود آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اور مدتوں سے ظلم و ستم کا شکار رہے ہیں۔ غنی نے کہا:

ہمچو سوزن دائم از پوشش گریزانیم ما
جامہ بہر خلق می دوزیم و عریانیم ما

علامہ محمد اقبال نے کہا:

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

علامہ اقبال'' امید، روشنی اور زندگی کے شاعر ہیں اور یہی وصف غنی کاشمیری کی

شاعری کا بھی ہے۔ چنانچہ فکر و نظر کی اِسی یگانگت سے غنی کی سیرت و کردار میں اقبال کو وہ انسان نظر آگیا جسے وہ انسانوں کی رہبری کا منتہا سمجھتے ہیں کیونکہ غنی کا یہ عقیدہ تھا:

کاسۂ خود پُر مکن زنہار از خوانِ کسے
داغ از احسانِ خورشید است بردل ماہ را

حواشی

۱۔ (سوانح مولانا غنی۔ صفحہ ۹۰۸)
۲۔ سوانح مولانا غنی۔ ص ۳۱
۳۔ سوانح مولانا غنی۔ ص ۱۱
۴۔ سوانح مولانا غنی۔ ص ۳۱۔ ۳۲
۵۔ سوانح مولانا غنی۔ ص ۳۸۔۳۹
۶۔ صوفی تبسم بنام کلیم اختر مورخہ ۴ فروری ۱۹۷۸ء
۷۔ اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۸۶
۸۔ کشمیر، راولپنڈی ۲۱۔ اپریل ۱۹۶۸ء
۹۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۱۳۲
۱۰۔ اقبال اور کشمیر صفحہ ۱۷۰
۱۱۔ سوانح مولانا غنی۔ ص ۳۱۔ ۳۲

علامہ اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ

علامہ اقبالؒ سید سلیمان ندویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "—— خواجہ نقشبندیؒ سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں، میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا"[1]

علامہ اقبالؒ نے قاضی سلطان محمودؒ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور یوں سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہوئے۔ قاضی سلطان محمودؒ مشہور و ممتاز بزرگ و شاعر میاں محمد بخشؒ کے ہم عصر بھی تھے اور ان کے خاص رفیق بھی۔ ان دونوں بزرگوں کے مابین ملاقاتیں رہتی تھیں۔ سلسلۂ مراسلت بھی قائم تھا اور دونوں ایک دوسرے کے رمز آشنا تھے بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کیلئے آتے جاتے بھی رہتے تھے۔ "سیف الملوک" میں مذکور ہے کہ "ایک دفعہ حضرت قبلہ قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ دربار شریف سے، جو جانب مغرب اب تک ایستادہ ہے، الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت حضور کے پاؤں میں بوجہ ایستادگی و شب بیداری ورم تھا۔ حضور سہارا لے کے یہاں تک پہنچے اور مندرجہ ذیل رباعی ارشاد فرمائی۔

سجن وداع کریندیاں نیناں چائے دین
نہ رووو نیئوں بھڑیو دیکھن دیو نین
سکھ چلے دُکھ آملے درد اُٹھے چین
ملے فیر محمدا خبر نہیں کہ جین

حضرت میاں محمدؒ بخش صاحبؒ اپنے وقت کے عالم بے مثل اور زہد و تقویٰ میں یکتا تھے۔ آپ نہ صرف عاشق رب کردگار اور عاشق رسولؐ تھے بلکہ بہت بڑے شاعر اور محب وطن بھی تھے —— آپ کا سارا خاندان پشت ہا پشت سے اپنی دین داری اور پرہیز گاری کی وجہ سے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کے دادا میاں دین محمدؒ بڑے مانے ہوئے مذہبی پیشوا تھے۔ آپ حضرت پیر شاہ غازیؒ دمڑی والے کے عقیدت مند تھے اور اُن کی درگاہ شریف اُنہی کے خاندان کے تصرف میں چلی آ رہی ہے۔ آپ کے والد محترم شمس الدینؒ بھی ولی کامل تھے۔

حضرت میاں محمدؒ بخشؒ کے روحانی مرشد حضرت پیر غازی دمڑی والاؒ جنہوں نے میاں صاحبؒ کو یہ کہا تھا کہ "تو میرا مرید ایں تے میں تیرا پیر آں" سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر لکھتے ہیں کہ پیر غازی دمڑی والا نے میاں صاحبؒ سے کہا تھا کہ

"قادریہ سلسلے وچ پیر سائیں غلام محمدؒ میرے روحانی فرزند نیں۔ کلروڑی شریف اوہناں دا ڈیرا اے۔ اوہناں دی خدمت وچ حاضر ہو کے ظاہری بیعت کر لو۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میاں محمد بخش صاحبؒ بھی سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ نہ صرف بیعت تھے بلکہ جب اُنہیں علم ہوا کہ درگاہ میں حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے بیشتر تبرکات ہیں تو زیارت کے لئے درگاہ تک پاپیادہ گئے اور پُرخار راستہ میں سعدی شیرازی کا یہ شعر پڑھا:

در بیابان شوقِ کعبہ گر تو خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

میاں صاحبؒ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں لکھتے ہیں:

واہ وا میراں شاہ شاہاں دا سید دوہیں جہانی
غوث الاعظم پیر پیراں دا ہے محبوب ربانی
چوراں نوں توں قطب بنایا میں بھی چور اچکا
جس در جاواں دھکے کھاواں ہک تیرا در تکا

علامہ اقبالؒ کو میاں صاحبؒ کے کلام سے اُنس و محبت تھی۔ ویسے بھی اُنہیں

پنجابی شعراء کرام کا کلام سننے کا شوق تھا۔ اور بقول صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مرحوم:

"اقبال پنجابی کے مشاہیر شعرا کے بڑے مداح تھے اور اُن کے کلام کے جوہر ریزوں کے قدر دان تھے۔"

— پنجابی شاعری سے لگن اوائل عمر سے ہی تھی اور بقول خالد نظیر صوفی، "میری نانی جان مکرمہ (علامہ مرحوم کی بھاوجہ اور بیگم شیخ عطا محمد صاحب) بتایا کرتی تھیں کہ اقبال بڑے خوش گلو اور پر سوز آواز کے مالک تھے۔ بچپن میں وہ ہمیں منظوم قصے بڑے پیارے لحن کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔" (۳) جہاں تک میاں محمد بخش کے کلام کا تعلق ہے "صاحب عارف کھڑی" لکھتے ہیں:

"تحصیل گوجر خان علاقہ پوٹھوہار کے صاحب جو اب کافی عمر رسیدہ ہو چکے ہیں۔ ایام جوانی میں بڑے خوش الحان نعت خوان تھے اور اب بھی حضرت میاں صاحب کا کلام نہایت شوق سے پڑھا کرتے ہیں انہوں نے ہمیں بتایا کہ ایک دفعہ لاہور میں جب کہ وہ وہاں ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ ایک جلسے میں نعت خوانی کے لیے بلائے گئے جب وہ سٹیج پر آئے تو دیکھا کہ علامہ اقبال بھی وہاں تشریف فرما ہیں۔ ایک اردو نعت پڑھنے کے بعد میں نے حضرت میاں صاحب کی تصنیف "سیف الملوک" کا کلام پڑھنا شروع کیا۔

بیدرداں توں پچھو ناہیں درد منداں دا رولا
مرجیون ناں واقف تھیون عشق نہیں پٹ کولا

وہ کہتے ہیں کہ حضرت میاں صاحب کا کلام پڑھنے کے دوران میں نے دیکھا کہ تمام جلسے پر وجد طاری تھا۔ جب میں نے حضرت اقبال کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ نہایت غور سے حضرت میاں صاحب کا کلام سن رہے ہیں اور اُن پر رقت طاری تھی۔ جب میں نے "سیف الملوک" پڑھنا ختم کیا تو حضرت اقبال نے مجھے فرمائش کی کہ تھوڑا اور "سیف الملوک" سناؤ۔ میں نے اِس فرمائش پر "سیف الملوک" کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

ملک عبادت خاصی اندر دائم رہن کھلوتے
پر عشقے دی لہر سے اندر مار نہ سکدے غوطے

جب میں "سیف الملوک" پڑھنا ختم کر چکا تو حضرت علامہ اقبال نے فرمایا کہ "افسوس مصنف "سیف الملوک" اب اِس دُنیا میں موجود نہیں ورنہ میں اُن کے ہاتھ چومتا۔" جب میں نے حضرت علامہ اقبال پر حضرت میاں صاحب کے کلام کا یہ اثر دیکھا تو ہمت کر کے آپ سے عرض کی جناب اگر پسند کریں تو کچھ اور شعر "سیف الملوک" کے سناؤں۔ اِس پر حضرت علامہ اقبال نے فرمایا کہ ضرور ضرور سناؤ۔ اِس کے بعد جب میں نے اہل جلسہ کی طرف نگاہ کی تو میں نے محسوس کیا کہ اہل جلسہ کے دِلوں میں حضرت میاں صاحبؒ کے کلام سے ایک عجیب تڑپ پیدا ہو گئی ہے اور اُن کی تشنگی ابھی باقی ہے۔ پھر میں نے حضرت میاں صاحبؒ کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے:

جنہاں طلب قصے دی ہوسی سن قصہ خوش ہو سن
جنہاں جاگ عشق دی سینے جاگ سویلے روسن
جس وچ کجھی رمز نہ ہووے درد منداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے نالوں !!

یہ اشعار پڑھنے کے بعد حضرت اقبال کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھیں پُر نم تھیں اور پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے فرما رہے تھے کہ حضرت میاں صاحب کے کلام میں انتہا کا سوز ہے۔" (۳)

میاں محمد بخشؒ اور علامہ اقبال دونوں بہت بڑے عاشق رسولؐ تھے۔ اُن کے کلام میں سرور کائنات ﷺ سے عقیدت و ارادت ٹپکتی ہے۔ دونوں عالم انسانیت کے شاعر ہیں۔ دونوں نے اپنے مرشد معنوی حضرت مولانا رومؒ کے کلام سے استفادہ کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ اور میاں محمد بخش صاحبؒ کے کلام میں کافی اشتراک پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر اُن کے فلسفہ کے کئی پہلوؤں پر میاں صاحبؒ کے کلام سے اشعار مل جاتے ہیں۔ ایک شعر ہے:

لوڑن والا رہیا نہ خالی لوڑ کیتی جس پکی
لوڑ کریندا جو مڑ آیا لوڑ اوہدی گن کچی

پھر میاں صاحب" کا ایک شعر ہے۔

جو ڈھونڈے سر پاوے بھائی مفت نہیں پر یاری

جس طرح علامہ اقبال" نے اپنے آبائی وطن کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے اسی طرح میاں محمد بخش صاحب" نے بھی کشمیر کے فطری نظاروں کو موضوع سخن بنایا ہے۔

علامہ اقبال" کہتے ہیں ۔

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

اے وادی لولاب

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
رخت بہ کاشمر کشاہ کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر!
باد بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر ناروں نگر

میاں صاحب" فرماتے ہیں۔

سبزیوں سبز پوشاک زمیں نوں دا نگن میکوں بختاں
ہر ہر پاسے پانی نہراں لایا رنگ درختاں
میوہ دار پکی ہر ڈالی لنک زمیں پر آئی !
گل پھل رنگ برنگی پھلے رونق جوہ سہائی
کوئل مور چکور ہزاراں خوش آواز لٹورے
طوطے قمری کالے تتر بولن دانگ کٹورے
کہگاں نور گمانی کدھی چلن وانگن ہنساں
بتے مرگ شکاری دوجے کتنے گن گن دساں

باغو باغ ہووے دل اس دا جو اس جو ہے پھردا
فرش ہوا خوشبوئے والی جنت وانگ چوگردا

علامہ اقبالؒ کو بھی اپنے وطن سے محبت و عقیدت تھی اور میاں صاحبؒ کو بھی۔ میاں صاحبؒ کا ایک شعر وطن سے محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں۔

ملک اپنے دے کلر اندر تے چن چن کھائیے
غیر ملکاں دیاں باغاں اندر میوے لین نہ جائیے

اس طرح اقبالؒ نے امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کو "سالارِ عجم" اور "سید السادات" کے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ میاں صاحبؒ نے بھی اپنی کتاب "سفر العشق" یعنی "سیف الملوک" میں جناب سید علی ہمدانیؒ کے بارے میں یہ کہا ہے۔

سید علی ہمدانی مینوں ایہہ روایت دَسے
شاہ وزیر دوہاں دے جھگڑے اکس دہاڑے دَسے

بہر حال میاں محمد بخشؒ اور علامہ اقبالؒ کے کلام میں بہت سی اقدار مشترک ہیں۔ اس سلسلہ میں راقم نے جب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو یہ لکھا کہ کیا علامہ اقبالؒ کے فکر و شعر دونوں میں میاں صاحبؒ کے اشعار کا کوئی پر تو ہے تو انہوں نے یہ فرمایا تھا۔

"پر تو تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ایسے حضرات کے افکار کہیں نہ کہیں یکساں ضرور ہوتے ہیں۔"

اب ہم میاں محمد بخش صاحبؒ اور علامہ اقبالؒ کے وہ چند اشعار لکھتے ہیں جن میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

میاں صاحبؒ بال چراغ عشق دا میرا روشن کر دے سیناں!
دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زمیناں
دیہیں دل عشق دے درددں کارا
جن بوٹے محبت دا نیارا

اقبالؒ خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے !!
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو

یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
وہ نہ روشن تو سخن مرگ دوام ہے ساقی

میاں صاحب" جس وچ گجھی رمز نہ ہووے درد منداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے ناوں
کامل عشق خدایا بخشیں غیر دلوں مکھ موڑاں
ہکو جاناں ہکو تکاں ہکوں رکھاں لوڑاں
آوے مستی جاوے مستی بھلے شکل پرستی
پیر اکسیر گھتے ہو سونا ایہہ کھیال جستی

اقبال" عطا اسلاف کا جذب دروں کر!
شریک زمرہ لا یحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

میاں صاحب" ملک عبادت خاصی اندر دائم رہن کھولتے
پر عشقے دے لہرے اندر مار نہ سکدے غوطے
بھار عشق دا کے نہ چایا ہر ہر عذر بہانے
آکھ بلی بلا سیڑی انسانے نادانے!

اقبال" خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

میاں صاحب" دل وچ کرے دمیل شہزادہ کیہہ کم کرن تارے
آپ تخت توں ڈھیندے جاندے ہو غریب وچارے

اقبال" ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں

میاں صاحب ؒ جیون جیون جھوٹا ناتواں سوت کھلی سراتے
لکھ کروڑ تیرے تھیں سوہنے خاک اندر رل تے

اقبال ؒ اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

میاں صاحب ؒ سچے مرد صفائی والے جو کچھ کہن زبانوں
مولا پاک سنیدا اوہو کلی خبر اسانوں

اقبال ؒ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

القصہ علامہ اقبال ؒ اور میاں صاحب ؒ کے اشعار میں کئی اشعار ایسے ہیں جن کا مضمون مشترک ہے۔ اِس سلسلہ میں سید نذیر نیازی نے راقم کو بتایا کہ ایک بار علامہ کی خدمت میں جہلم کے رہنے والے دو شخص حاضر ہوئے اور نہایت ادب و تکریم سے ملے اور بیٹھ گئے۔ علامہ اقبال ؒ نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا مگر وہ بہ اصرار فرش پر بیٹھے اور عقیدت و ارادت سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو انہوں نے علامہ اقبال ؒ کے کچھ اشعار پڑھے اور پھر کہا جناب انہی مضامین میں میاں محمد بخش صاحب کے اشعار بھی ہیں اور میاں صاحب ؒ کے اشعار سنائے۔

علامہ اقبال ؒ نے اُن اشعار کو سنا اور کہا — "میاں سو سیانے تے اکو سی ست —"

"سو دانا اور ایک ہی بات —"

حواشی

۱۔ اقبال نامہ از شیخ عطا محمد حصہ اول ص ۷۹
۲۔ اقبال درون خانہ ص ۱۰
۳۔ عارف کھڑی ص ۸۵۔۸۷

مولوی سید چراغ شاہ اور
علامہ اقبال کے والد شیخ نُور محمد

سید نذیر نیازی مرحوم اپنی بے مثل تصنیف "دانائے راز" میں حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بچپن میں ان کے محلہ کے علمی و دینی ماحول اور ان کے گھر کی مذہبی فضا کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"اُن کے گھر کی فضا کہ والد ماجد کو دیکھئے، ان کے ہاں اہل دل جمع ہیں۔ محمد اقبال نے اگرچہ صرف اتنا کہا ہے کہ اس حلقہ میں کتب تصوف کا مطالعہ ہوتا لیکن یہ نہیں بتایا کہ حلقہ کن بزرگوں پر مشتمل تھا۔ اتنا معلوم ہے کہ ان میں ایک سید چراغ شاہ بھی تھے۔ گجرات سے ترک وطن کر کے انہیں کے قریب محلہ کشمیریاں میں آباد ہوئے۔ مولوی غلام مرتضیٰ کے، جن کی میر حسن نے بڑی تعریف کی ہے، شاگرد تھے۔ یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مساجد کی اگرچہ وہ شان نہیں رہی تھی جو شاہی زمانے میں تھی لیکن اب بھی ان کی حیثیت درس گاہوں کی تھی۔ میر حسن زیادہ تر مسجد حسام الدین میں درس دیتے اور مولوی غلام مرتضیٰ مسجد کبوتراں والی میں۔" سید نذیر نیازی صاحب نے اگرچہ "دانائے راز" کے صفحہ نمبر ۵۶ کے حاشیہ میں مولوی سید چراغ شاہؒ کی نشاندہی کر دی ہے کہ وہ مشہور اہل قلم سید نور محمد قادری کے جد امجد تھے۔ لیکن ان کے سوانح کے بارے میں کچھ درج نہیں کیا۔ چونکہ مجھے بھی جناب نیازی کی طرح قادری صاحب سے نیاز حاصل ہے۔ اس لیے ان سے عرض کیا کہ چونکہ نیازی صاحب حضرت علامہ اقبالؒ کی

زندگی کا ایک نیا گوشہ سامنے آئے ہیں اس لیے اگر آپ سید صاحب کے تفصیلی حالات سے مطلع فرمائیں تو اقبالی دنیا پر احسان ہو گا۔ چنانچہ قادری صاحب نے اس سلسلہ میں کافی مواد مجھے فراہم کر دیا جس کی مدد سے میں اس عظیم ہستی کے حالات قارئین کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

سید چراغ شاہ رحمتہ اللہ علیہ گجرات شہر سے متصل ایک چھوٹے سے گاؤں "بوکن" میں ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ باپ کا اسم گرامی سید محمد شاہ ولد سید محمود شاہ تھا۔ ابتدائی درسی کتب اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ جب سن شعور کو پہنچے تو حضرت بابا جنگو شاہ صاحب سہروردی المعروف بابا صاحب ساکن موکھوکھر (جو بوکن سے صرف نصف میل کے فاصلہ پر ہے) کے ارشاد فرمانے پر سیالکوٹ چلے گئے اور استاذ العلماء مولوی غلام مرتضیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے درس عالیہ میں شریک ہو گئے۔ مولوی صاحب سے فیض یاب ہونے کا ذکر سید صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ تالیف "بیاضِ صحیح" میں کئی جگہ کیا ہے۔ ایک استفتاء کے جواب کے اختتام پر لکھتے ہیں:

> "حررہ فقیر چراغ شاہ سیالکوٹی از کمترین تلمیذاں مولوی غلام مرتضیٰ مرحوم و مغفور برائے برخوردار احمد شاہ، عبداللہ، نور اللہ، ظہور اللہ و محمد شریف خدا تعالیٰ جمیع فرزندانِ فقیر را راہ مستقیم نصیب کناد و بر مذہب امام المسلمین امام اعظم دارد۔

جناب مولوی غلام مرتضیٰ صاحب کے علاوہ سید صاحب نے کچھ منتہی کتب مفتی صدر الدین صاحب آزردہ دہلوی سے بھی پڑھیں جس کا ذکر آپ نے بیاض صحیح جلد دوم کے صفحہ ۴۰ پر کیا ہے۔

دورانِ تعلیم ہی میں آپ کی شادی استاذِ مکرم مولوی غلام مرتضیٰ صاحب کی کوشش سے قصبہ فیروزوالا ضلع گوجرانوالہ کے ایک ذی علم گھرانے میں ہو گئی۔ آپ کے خسر میاں محمد صاحب مولوی غلام مرتضیٰ صاحب کے گہرے دوست تھے اور مشہور ولی کامل مولانا محمد عظیم کے فرزند تھے۔ آپ کی زوجہ محترمہ کا اسم گرامی حسن بی بی تھا جو بڑی عالمہ، فاضلہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔

شادی کے بعد سید صاحب کشمیری محلہ میں ذاتی مکان خرید کر مستقلاً یہیں آباد ہو

گئے۔ آپ کے زمانہ تدریس ہی میں انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا اور جیسا کہ کسی اجنبی قوم کے تسلط سے ملکی نظم و نسق کی حالت ابتر ہو جاتی ہے، اسی طرح پنجاب میں بھی بد نظمی اور ابتری عام ہو گئی اور یہ حالت کئی سال تک رہی۔ کشمیری محلّہ کے ایک کشمیری لسو نامی نے کئی سال تک اپنی غنڈہ گردی کی وجہ سے اہل محلّہ کا ناک میں دم بند کیے رکھا) اہل محلّہ نے اس کے خلاف کئی دفعہ حاکمانِ وقت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہ اپنے اثر و رسوخ اور ہم مشرب دوستوں کے تعاون سے بچ جاتا۔ ایک دفعہ اسے جوئے کی پاداش میں چھ ماہ کی قید بھی ہو گئی۔ لیکن اثر و رسوخ کی وجہ سے ضمانت پر رہا ہو گیا۔ آخر کار اہل محلّہ نے تحصیلدار سیالکوٹ کی معرفت ایڈمنسٹریٹر مسٹر جان کے پاس لسو کی ضمانت کی تنسیخ کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی اور لسو کی ضمانت منسوخ کر دی گئی۔

سید صاحب اپنے استاذ مکرم مولوی غلام مرتضیٰ رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے اور وفات تک کبوتراں والی مسجد میں درسِ قرآن و حدیث سے اہالیانِ سیالکوٹ کو مستفیض کرتے رہے۔ سیالکوٹ کے علاوہ دور دراز جگہوں کے لوگ بھی آپ سے رجوع کرتے۔ اس وقت تک بھی سید صاحب کے اخلاف کے پاس کئی ایسے استفتاء موجود ہیں جو دوسرے اضلاع سے مسائل کی تحقیقات کے لیے آپ کی خدمت میں بھیجے گئے تھے۔ مشاہیر میں مولانا عبدالرحمن ولد مولانا محمد شریف کوٹلی لوہاراں، مولوی غلام حسین ساہووالہ، مولانا محمد حسن فیضی اور شیخ نور محمد والد حضرت علامہ اقبال سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔

علمائے عظام اور اولیاء کرام سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ گجرات کے مشہور اہل اللہ سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود رحمتہ اللہ علیہ (۱۹۱۹ء) مزاراتِ عالیہ کی زیارت کے لیے سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو اپنا ہم وطن ہونے کی وجہ سے اکثر سید صاحب کے پاس کشمیری محلّہ میں ٹھہرتے۔ سید صاحب اگرچہ خود سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت خواجہ خان عالم رحمتہ اللہ علیہ ساکن باولی شریف (گجرات) سے بیعت تھے۔ لیکن حضرت قاضی صاحبؒ کے علم و فضل اور ان کی زبردست روحانی شخصیت سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے بیٹوں حافظ عبداللہ شاہ ۱۹۴۱ء اور مولوی نور اللہ شاہ صاحب (۱۹۳۸ء) خطیب مسجد قصاباں سیالکوٹ کو آپ کے دست حق پرست پر بیعت کرا دیا۔ سید صاحب کی

وفات کے بعد جب قاضی صاحب سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو اپنے محبوب مرید و خلیفہ حافظ عبداللہ شاہ کے پاس کشمیری محلّہ میں قیام فرماتے اور یہاں طالبانِ حق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کسب فیض کرتے۔

سیالکوٹ شہر کے اکثر لوگ حافظ عبداللہ شاہ اور قصبات و دیہات کے اکثر لوگ حکیم محمد سعید روڈوس والوں کی معرفت حضرت قاضی صاحب کی بارگاہ عالیہ میں پہنچے ہیں۔ پھر حضرت علامہ اقبال ؒ کا خاندان تو تھا ہی کشمیری محلّہ کا، وہ لوگ ضرور حضرت قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوں گے اور ان کی صحبتوں سے متاثر ہو کر حضرت علامہ کے والد حضرت قاضی صاحب سے بیعت ہوئے ہوں گے اور بعد میں ننھے اقبال کو بھی بیعت کے لیے اوان شریف لے گئے ہوں گے۔ سیالکوٹ شہر کے ایک مشہور فاضل مولوی عبدالکریم المعروف اشراقی جو مدرسہ فتح پوری دہلی اور خیر آباد کے تعلیم یافتہ تھے، حافظ صاحب ہی کی معرفت قاضی صاحب کے دربار میں پہنچے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک خط ۱۹۱۵ء کا لکھا ہوا اس وقت بھی قادری صاحب کے پاس موجود ہے جس میں انہوں نے اس امر کا کھلا اعتراف کیا ہے کہ وہ حافظ صاحب کی معرفت حضرت قاضی صاحب کے دربار میں پہنچے۔

آپ بڑے کتب خانہ کے مالک اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی ایک تالیف "بیاضِ صحیح" سید نور محمد قادری کے پاس محفوظ ہے اس کا زیادہ تر حصہ تو آپ کے قلم کا لکھا ہوا ہے لیکن کچھ دوسروں کی لکھی ہوئی پسندیدہ چیزیں بھی موجود ہیں۔

اس کے علاوہ آپ نے مختلف علمی و دینی مسائل مثلاً شفاعت، عبادت، استعانت، بدعت، تقلید اور علم غیب پر بڑی فاضلانہ بحثیں کی ہیں۔ بسم اللہ شریف کی تفسیر شعر و ادب کا مرقع ہے آپ اچھے خوش نویس بھی تھے۔

"دانائے راز" کے صفحہ ۵۶ کے حاشیہ پر جناب سید نذیر نیازی صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ سید چراغ شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہ خاندان سیالکوٹ چھوڑ گیا تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ سید صاحب کی وفات کے بعد ترانوے (۹۳) برس بعد تک اس خاندان کے افراد اسی مکان میں آباد رہے ہیں۔ ابھی ۱۹۸۰ء میں اس خاندان کے ایک فرد سید شیر شاہ

نے اس مکان کو فروخت کیا ہے اور اس طرح اس خاندان کا جو رابطہ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ کشمیری محلہ سے قائم ہوا تھا وہ پورے ایک سو تیس برس کے بعد ٹوٹ گیا ہے۔

سید صاحب شعبان المعظم ۱۳۰۴ھ کو سول ہسپتال گجرات میں فوت ہوئے اور اپنے آبائی گاؤں بوکن تحصیل گجرات میں دفن ہوئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اقبالؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ

مولانا انور شاہ کاشمیری خطہ کشمیر کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو مدتِ دراز سے اپنی دین داری، پرہیزگاری اور حب اسلام کی وجہ سے وادی بھر میں ممتاز اور معروف تھا۔ آپ کے جدامجد شیخ مسعود نروری مغلوں کے زمانہ میں سرینگر سے ہجرت کر کے لولاب کی پرسکون اور خوبصورت وادی میں اٹھ آئے اور گرد و نواح بسنے والوں کو مذہبی اور دینی تعلیم دینے لگے!

مولانا انور شاہ، شیخ مسعود نروری کی ساتویں پشت میں تھے۔ آپ کے سوانح نگار حضرت مولانا یوسف بنوری "نفحہ العنبر" میں لکھتے ہیں:

> "آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کر کے برصغیر ہندو پاکستان آیا اور تھوڑے عرصہ ملتان اور لاہور میں قیام کر کے آخرکار کشمیر میں سکونت پذیر ہو گیا۔ آپ کی ولادت سے کافی عرصہ پہلے یہ خاندان کشمیر میں رہ رہا ہے۔ وہیں کے ایک قریہ دودھواں (لولاب) کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔"

مولانا انور شاہؒ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت میں آپ والد محترم محمد معظم شاہ بن عبدالکبیر کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے خود ابتدائی تعیم دی اور قرآنِ حکیم بھی پڑھایا۔ چنانچہ چھ برس ہی کی عمر میں آپ نے قرآنِ مجید حفظ کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ زبان فارسی کے چند رسائل بھی پڑھ لیے۔ آپ کی ذہنی اور علمی تعلیم و تربیت اور علوم شرقیہ سے آگاہی میں مولانا عبدالجبار جندل اور مولوی غلام محمد کا بھی حصہ

ہے۔ اول الذکر فارسی کے عالم اور شاعر تھے اور موخر الذکر زبان عربی اور علوم فارسی کے علاوہ دینی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اِن اساتذہ کی صحبت نے مولانا کے دل میں مزید علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا اور پھر یہی شوق اُنہیں وطن کی بہاروں سے وداع کر کے دیارِ غیر میں لے گیا۔

مولانا انور شاہ نے سب سے پہلے کاکول (ہزارہ) میں قیام کیا۔ یہاں کے مختلف علماء کرام سے علم صرف و نحو اور منطق کے ابتدائی اسباق پڑھے۔ یہ زمانہ تھا جب برصغیر کی فضائیں حضرت مولانا محمود حسن کے درس و مواعظ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خطبات سے گونج رہی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند کے چرچے زبان زدِ خواص و عام تھے۔ اِس علمی و دینی ادارہ کی کشش نے مولانا کو ۱۳۰۸ھ میں سترہ برس کی عمر میں دیوبند کھینچ لیا۔

دیوبند میں مولانا انور شاہ ایک مفلوک الحال اور مفلس طالب علم کی حیثیت سے مولانا مشیت اللہ بجنوری مرحوم کے ساتھ رہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ہمت نہ ہاری اور نہایت صبر و تحمل سے تحصیل علم میں مصروف رہے اور جب بقول مولانا محمد الدین فوق اہل دیوبند کو گودڑی کے اِس لعل کی بابت معلوم ہوا کہ یہ سنگریزہ نہیں بلکہ لعل بدخشاں ہے تو وہ اِن کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھنے لگے۔" آپ نے چار برس کی باقاعدہ تعلیم اور مشاہیر مشائخ عصر کی بابرکت صحبتوں کے طفیل نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سند فراغ حاصل کی۔ اُس وقت آپ کی عمر صرف بیس یا اکیس سال تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں جن علما و فضلا نے آپ کی دینی، علمی اور عملی تربیت میں حصہ لیا اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا حافظ خلیل احمد سہارن پوری، مولانا محمد اسحاق امرتسری مہاجر مدنی، مولانا غلام رسول ہزاروی الدیوبندی، مولانا حبیب الرحمن دیوبندی، مولانا عبدالعلی محدث، مولانا حکیم محمد حسین۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آپ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے شمع رشد و ہدایت روشن کر رکھی تھی۔ یہاں سے آپ نے حدیث کی سند حاصل کر کے دہلی کے مدرسہ امینیہ میں، جو اُن کے دوست مولانا امین الدین صاحب نے قائم کیا تھا، مدرسِ اعلیٰ مقرر ہوئے اور بارہ برس تک درس و تدریس

میں مصروف رہے۔

دہلی سے کشمیر واپس آئے۔ سینکڑوں طالب علم آپ کی شاگردی میں رہے اور ہزاروں نے ہدایت پائی جس کے باعث آپ عوام الناس میں نہایت ہی عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ ویسے بھی آپ کی علمی اور مذہبی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی مگر طبیعت میں درویشی و قلندری بدستور تھی۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ بارہ مولا (کشمیر) کے مخیر رئیس خواجہ الصمد ککرو مرحوم (والد محترم خواجہ حبیب اللہ ککرو و خواجہ عنایت اللہ ککرو) کی رفاقت میں بلادِ اسلامیہ کی سیر کو گئے اور مصر، حجاز، طرابلس اور بصرہ کی سیاحت کی۔ وہاں کے علما و فضلا آپ کی ذہانت و فطانت اور علم و مطالعہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ اِس سفر کے دوران میں آپ نے اسلامی ملکوں کے بعض مستند عالموں سے بھی دینی علوم پر سندات حاصل کیں۔ سید اسد اللہ شاہ دوارکی راوی ہیں کہ جب آپ مصر میں پہنچے تو آپ نے وہاں ایک نادر دینی کتاب دیکھی جس کا دنیا بھر میں صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ شاہ صاحب نے لائبریرین سے کتاب پڑھنے کی درخواست کی جو اُس نے منظور کرلی۔ آپ نے کتاب کو بغور پڑھا اور پھر اپنی بے پناہ قوتِ حافظہ اور یادداشت کی بنا پر تحریر کرلیا۔ اصل کتاب سے جب اِس کا متن ملایا گیا تو اِس میں ایک غلطی بھی نہ تھی۔

کشمیر واپس آکر آپ نے اپنے رفیق خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم کی تحریک اور خواہش پر بارہ مولا میں "مدرسہ فیض عام" کی بنیاد رکھی اور تین سال وہاں درس دیا۔ مولانا مرحوم کی ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی کہ کشمیری خوابِ غفلت سے بیدار ہوں۔ اُنھوں نے اہل وطن کو درسِ دین بھی دیا اور درسِ حریت بھی۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ اُنھیں اپنے ہم وطنوں سے مایوسی ہوئی اور پھر دیوبند واپس تشریف لے گئے۔ اِس ضمن میں مولانا محمد الدین فوق مرحوم لکھتے ہیں:

> "میں نے دیوبند کی نسبت جہاں بہت سے علما دارالعلوم میں کام کررہے تھے۔ کشمیر کے زیادہ حقوق عرض کئے۔ آپ نے فرمایا کوئی ایسا آدمی پیدا کیجئے جو ہماری باتیں سن سکے۔ ہمیں خدمت وطن سے تو کوئی انکار نہیں۔" [1]

اپنی قابلیت اور عبادت گزاری کے سبب مولانا نے جلد ہی اپنا مقام علمائے کرام کی صف اول میں پیدا کرلیا۔ اُن کے ہم عصر اُن کی دینی فضیلت اور علمی صلاحیت کے اتنے

قائل ہوئے کہ کسی نے "بخاری وقت" کے نام سے پکارا اور کسی نے "ابوحنیفہ ثانی" کے لقب سے۔ اِس سلسلہ میں اُن کے ایک ہم عصر نامور محدث علامہ زاہد بن الحسن الکوثری کی شہادت یہ ہے:

"علامہ ابن الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متنِ حدیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو۔ اور یہ وقفہ شاہ صاحب اور ابن ہمام کے درمیان کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے۔" ؎

مولانا مرحوم نہایت ہی خوبرو اور وجیہہ تھے۔ قوتِ حافظہ بے پناہ تھی۔ شخصیت جاذبِ نظر بھی تھی اور پرکشش بھی۔ جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظریں چہرہ سے نہ اُٹھاتا۔ باتیں بہت کم کرتے تھے لیکن ہر بات سے وقار ٹپکتا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ کھانے پینے کے معاملے میں جو چیز زیادہ پسند آ جاتی اُسے سیر ہو کر کھاتے تھے۔ طبیعت شگفتہ تھی اور جانِ محفل تھے، اپنی کم گوئی کے باوجود بڑی پیاری اور پرلطف باتیں کرتے تھے۔ ایک بار سبق پڑھا رہے تھے کہ کہنے لگے "چلو اپنے گھر کا راستہ لو۔ بھائی شمس الدین ہی چلے گئے ہیں۔" پڑھنے والوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کون شمس الدین؟ تو ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "جاہلو دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین رخصت ہو رہے ہیں۔" اندھیرے میں پڑھ کر کیا کرو گے۔ اِس میں تو لطف نہیں آئے گا۔"

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن آپ کی دین داری، علمی فضیلت اور صالح سیرت سے بخوبی آگاہ تھے اور اکثر آپ کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ آپ کو اِس بات کا کامل یقین تھا کہ اگر کوئی عالم دین اِن کے بعد اِن کے منصب اعلیٰ کا اہل و مستحق ہو سکتا ہے تو وہ مولانا انور شاہ ہی ہیں۔ اِس لیے چاہتے تھے کہ مولانا انور شاہ مستقل طور پر دیوبند میں ہی بس جائیں۔ تحصیل علم اور تبلیغ دین میں مولانا مرحوم اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کر چکے تھے اور اِس کام میں ایسے مستغرق تھے کہ ۴۴ برس تک شادی نہ کی۔ چنانچہ اِس کارِ خیر کو حضرت محمود حسن اور مولانا حبیب الرحمن مرحوم نے سرانجام دیا اور اُن کی مساعی جمیلہ سے گنگوہ کے سادات خاندان میں شادی ہو گئی۔ اِس وقت تک آپ بلامعاوضہ کام کرتے تھے۔ اِس سلسلہ میں شاہ الحق ایم۔اے۔ لکھتے ہیں:

"منتظمین نے بہت چاہا کہ آپ کم از کم اپنی بنیادی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے ہی کچھ مشاہرہ قبول فرمالیں مگر آپ کسی طرح راضی نہ ہوئے اور بلامعاوضہ ہی کام کرنے کے لئے تیار ہو گئے البتہ مہتمم دارالعلوم حافظ محمد احمد صاحب کے بے حد اصرار پر آپ نے دونوں وقت اِن کے ساتھ طعام میں شرکت کرنا قبول کر لیا اور دارالعلوم کے احاطے میں ایک مختصر سا حجرہ جو رہائش کے لئے مل گیا اِس میں یہ شیدائی علم ایک طویل عرصہ تک خود بھی علم کے اتھاہ سمندر میں غواصی کرتا رہا اور صدہا تشنگان کی پیاس بھی بجھاتا رہا۔"

۱۳۲۳ھ میں جب حضرت مولانا محمود حسن حجاز تشریف لے گئے تو صحیح بخاری کا درس آپ ہی کے سپرد ہوا اور آپ نے اِس کام کو بہ طریق احسن سرانجام دیا۔ آخری عمر تک صرف ساٹھ روپیہ مہینہ تنخواہ لیتے رہے۔ "سرگزشت فوق" (غیر مطبوعہ جو محمد عبداللہ قریشی کی تحویل میں ہے) میں لکھا ہے کہ اُن کو "سید" نہ لکھا جائے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں "سید" نہیں ہوں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اردو زبان کے مشہور شاعر، ادیب اور ڈرامہ نگار آغا محمد شاہ حشر کاشمیری بھی آپ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اِسی طرح کشمیر کے مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد سعید مسعودی کا سلسلہ نسب بھی مولانا انور شاہ کاشمیری کے بزرگوں سے ملتا ہے۔ اُن دونوں بزرگوں نے بھی اپنے آپ کو سید نہیں کہا۔ مولانا انور شاہ کو اہل جموں و کشمیر سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔

ایک بار آپ نے کشمیریوں کے ایک وفد کی قیادت بھی فرمائی تھی جو نواب سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے پاس گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے نواب مرحوم کی خدمت میں بزبانِ عربی جو سپاسنامہ پڑھا وہ تاریخ، سیاست اور زبان کا اعلیٰ اور نادر نمونہ مانا جاتا ہے۔ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں آپ اپنے والد ماجد اور دیگر اہل کنبہ سے ملاقات کی غرض سے کشمیر گئے اور مختلف ضلعوں میں اپنے مواعظ سے لوگوں کو مستفیض فرمایا۔ آپ کے دوسرے چاروں بھائی کشمیر میں دین اسلام کے مبلغ رہے، اُنھوں نے بھی تازیست درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیے رکھا۔ آپ کے ایک فرزند دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں۔ اُن کا اِسم گرامی ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر ہے اور وہ دارالعلوم کے رسالہ کے مدیر ہیں۔

مولانا انور شاہ اُن خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کی علمی و دینی عظمت کا اعتراف اُن کے ہم عصروں نے بھی کیا ہے اور غیر ملکی مشاہیر دین و ملت نے بھی۔ اِس

ضمن میں علامہ رشید رضا مدیر "المنار" مصر نے لکھا ہے کہ جب میں دار العلوم دیوبند میں آیا تو مولانا انور شاہ کی "مسلک حنفیہ اور اصولِ اساسی" پر عربی زبان میں مدلل اور جامع تقریر سن کر بے حد متاثر ہوا اور میری زبان سے بار بار یہ جملے نکلتے تھے کہ "بخدا میں نے اِس مرد کی مانند کسی کو کبھی نہیں دیکھا۔"

علامہ رشید رضا جو شافعی المذہب تھے مولانا کی تقریر اور دار العلوم کے نصاب سے بے حد متاثر ہوئے اور جاتی دفعہ یہ کہہ گئے کہ اگر میں اِس دار العلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس واپس جاتا۔ اِس دار العلوم نے بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں بھی علومِ عربیہ اور تعلیمات مذہبیہ اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا: ایک انگریز کا قول تھا کہ اسلام کی حقانیت کا اِس لیے قائل ہوا کہ غزالی جیسا مدبر اسلام کو حق سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں جب انور شاہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے تو میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی یہ ایک بڑی دلیل ہے۔"

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

"اگر ہماری آنکھوں نے شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا تو یقین ہے کہ شاہ صاحب کی آنکھوں نے بھی شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا۔ وہ امام ابوالحسن کی زبان اور ترجمان ہیں اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور حافظ ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں کہہ دوں گا کہ میں نے انور شاہ کی ذات میں سب کو دیکھا ہے۔"

ایک اور مقام پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"نہ تو دنیا کی آنکھوں نے اِن کی نظیر دیکھی اور نہ خود انھوں نے اپنے کسی ثانی اور مماثل کو دیکھا۔" (۳)

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ اُن کی مثال اِس سمندر کی سی تھی جس کی اُوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں

اُس عہد میں بے مثال تھے۔ علومِ حدیث کے حافظ نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں اُن کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اِس شہید نے قال اللہ و قال الرسول ؐ کا نعرہ بلند رکھا۔ مرحوم معلومات کے دریا، حافظ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے۔ اُن کو زندہ کتاب خانہ کہنا بجا ہے۔ شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی اُن کے مطالعہ سے بچی ہو۔"

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

"آپ کے یہاں رد قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اِس فتنہ کو اعظم الفتین شمار کرتے تھے۔ اِس سلسلہ میں کئی معرکتہ آرا کتابیں بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اِس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لا کر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرما کر دعائیں دیتے تھے۔ تقریباً ۱۳۲۷ھ سے آپ نے دارالعلوم میں درس کا آغاز فرمایا۔ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔ اِس دوران میں تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دورِ صدر مدرسی میں ۸۵۹ طلبا نے درسِ حدیث لیا اور اِس فن پاک کو تقریراً اور درساً و تدریساً دُور دُور تک پھیلایا۔" (۴)

علامہ اقبالؒ کو حضرت انور شاہؒ سے بہت عقیدت وارادت تھی اور اکثر دینی امور میں آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے بلکہ کئی موقعوں پر علامہ اقبالؒ نے مولانا شاہؒ کی علمی، دینی اور فقہی قابلیت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اِس سے رہبری اور رہنمائی بھی حاصل کی۔ مولانا عبدالصمد صارم لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال مرحوم خود بڑے پائے کے فلسفی تھے۔ فلسفہ قدیم و جدید پر اُن کی یکساں نظر تھی۔ علوم جدیدہ میں اُن کو کمال حاصل تھا لیکن وہ بھی شاہ صاحب کی نگاہ التفات کے خواست گاروں میں سے تھے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم

نے شاہ صاحب سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور اِس کا اعتراف اُنہوں نے خود بھی کیا ہے۔" (۵)

مولانا ضیاء الرحمن فاروقی اپنے ایک مضمون "دیو بند کی عہد ساز "شخصیتیں" میں لکھتے ہیں:

"اُنہی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ اِس وقت روئے زمین پر انور شاہ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔" (۶)

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ مرحوم کے تعلقات کا باقاعدہ آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اِس سلسلہ میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیت العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ اِن سیاسی حالات کے تحت کیا جائے۔ اِس کے روحِ رواں مولانا عبدالقادر قصوری وکیل تھے اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلا ہال میں منعقد ہوا۔ راقم نے اتنے علمائے دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا۔ اِس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اِس جلسہ کے افتتاح پر قرات مولانا طاہر دیو بندی نے کی تھی اور تحریک صدارت کی تائید میں کئی علما نے تقریریں کی تھیں مگر وہ تقریر جو مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا فاخر کانپور نے کی تھی، شاہکار تھی۔ خطبہ صدارت کا کچھ حصہ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود، کچھ حصہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اور باقی مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا۔ اِسی جلسہ میں اول مرتبہ میں نے علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ کاشمیری کا تعارف کرایا تھا۔" اِس کے بعد اقبال اور مولانا انور شاہ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تاکہ وہ خود اور اہل لاہور اِس سے استفادہ کر سکیں۔ اقبال کے نزدیک لاہور میں ایک متنفس بھی ضروریاتِ اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب علمی طور پر بانجھ تھا۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناسب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیا کی دکانیں ہیں۔ مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔

ایسے میں اقبال" کی نظر انتخاب برِعظیم پاک و ہند میں دو شخصیتوں پر پڑی جنہیں لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی جا سکے۔ ایک سید سلیمان ندوی" اور دوسری مولانا انور شاہ کاشمیری" لیکن بدقسمتی سے دونوں بزرگ لاہور نہ آ سکے۔" (۷)

اِس ضمن میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ علامہ انور شاہ صاحب لاہور میں تشریف لائے۔ وہ راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں میں پیر عبدالغفار شاہ کے ہاں مہمان تھے۔ اُن کی آمد سے پہلے علامہ اقبال" نے انجمن اسلامیہ اور انجمن حمایت اسلام سے معاملہ فہمی کر لی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علومِ دین اسلام کے سربراہ ہوں گے۔"

مولانا انور شاہ کاشمیری مارچ ۱۹۲۵ء میں جب "انجمن خدام الدین" کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو علامہ اقبال نے ۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء کو انہیں حسب ذیل خط لکھا:

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

"مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے۔ میں اُسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا۔ اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمن صاحب قبلہ عثمانی، حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب اِس عریضے کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔"

اقبال

اِس دعوت میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی بھی شریک تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ نے ۱۹۲۶ء میں دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کے استعفیٰ کے پس منظر کو عبدالصمد صارم یوں بیان کرتے ہیں:

"۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے قید ہو جانے کے بعد شاہ صاحب کو دارالعلوم کا صدر مدرس مقرر کیا۔ دارالعلوم کی انتظامیہ نے بہت سے اصلاحی کام کیے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو مزید اصلاحات کے خواہاں تھے۔ اُن لوگوں میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے علاوہ خود شاہ صاحب بھی شامل تھے۔ یہ تحریک اصلاحات انتظامیہ کو منظور نہ تھی۔ چنانچہ جب شاہ صاحب نے انتظامیہ کی یہ ہٹ دھرمی دیکھی تو صدر مدرس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا جو انتظامیہ نے منظور کر لیا۔ اور اِس کے بعد شاہ صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ یہاں اِس بات سے بحث نہیں کہ شاہ صاحب کا استعفیٰ دینا ٹھیک تھا یا انتظامیہ کا استعفیٰ منظور کرنا۔ بحث اِس بات سے ہے کہ جب شاہ صاحب نے انتظامیہ کی ہٹ دھرمی کو غلط سمجھا تو اُنہوں نے دارالعلوم کی صدرِ مدرسی سے (جو ایک بہت بڑا قابل عزت عہدہ ہے) بھی استعفیٰ دینے سے دریغ نہ کیا۔ اِس سے آپ کی خودداری کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔"(۸)

جہاں تک حضرت مولانا انور شاہؒ کے استعفیٰ اور علامہ اقبالؒ کے اُنہیں لاہور میں بلانے کا تعلق ہے اِس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاد نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دیا تو یہ خبر اخبارات میں چھپی ہیں اِس کے چند روز بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہوا میں بہرحال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا۔

"کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا کیوں

نہیں؟ مگر دارالعلوم کو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لیے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اِس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے اِس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورتِ فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے اُن سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اِس کام کے لئے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اِس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اِس عظیم ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ اور اُن کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے اُن کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور اُن کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اِس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آ جائے گی۔"

عبدالرشید ارشد صاحب مولانا عبدالحنان ہزاروی کی زبانی لکھتے ہیں:

"جب شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے استعفا دے دیا۔ میں اُن دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں، جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب نہ آیا۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اُس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا۔ افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا ہوں۔" (۹)

علامہ اقبالؒ اور مولانا سید انور شاہؒ میں باقاعدہ خط و کتاب بھی ہوتی رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خط و کتابت دینی امور کے بارے میں ہی ہوتی ہو گی۔ اِس ضمن میں قاری محمد طیب لکھتے ہیں:

"(اقبال) کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پر آتے تھے اور حضرت اُن کے شافی جوابات لکھتے۔"

علامہ اقبال "شاہ صاحب" کی کتابوں کو نہایت دلچسپی اور غور و فکر سے پڑھتے تھے۔ اِدھر شاہ صاحب کی جب کوئی نئی تصنیف چھپ کر آتی تو وہ بھی علامہ اقبال کے پاس بھیجتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"شاید اِس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ حضرت استاد کا ایک منظوم رسالہ "حدوث عالم" کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اُس کا ایک نسخہ حضرت الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی بطور تحفہ ارسال فرمایا۔ ایک صحبت میں فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول ؐ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی اُن کو اِس درجہ درک و بصیرت اور اِس کے مسائل پر اِس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اِس رسالہ میں اُنھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اِس مسئلہ پر اِس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔"[۱۰]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مولانا انور شاہ" کی علمی و دینی بصیرت کو بے حد سراہا اور اُن سے کئی امور پر رہنمائی بھی حاصل کی۔ اُنھوں نے ۱۹۲۸ء میں اورینٹل کانفرنس لاہور کے شعبہ عربی و فارسی کے صدارتی خطبہ میں لکھا:

"لیکن جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث "لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ" میں دہر بمعنی (Time) کا جو لفظ آیا ہے اُس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے جو دنیا کے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں، اُن سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اُس مراسلت کے

دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اُس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہ عنایت مجھے اُس کی ایک نقل ارسال کی۔"

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کی آخری ملاقات اگست ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا شاہ "مقدمہ بہاولپور" کے سلسلہ میں بہاول پور جا رہے تھے۔ اِس سفر میں انہوں نے دو روز لاہور میں قیام کیا۔ اِن ایام میں مولانا انور شاہ جامع مسجد آسٹریلیا میں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ علامہ اقبالؒ اِس موقعہ پر موجود ہوتے تھے۔ مولانا انور شاہ صاحب ڈابھیل میں بیمار ہو کر دیو بند چلے گئے جہاں ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء (۱۳۵۱ھ) کو آپ کا انتقال ہوا اور اِس طرح:

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عدل

برکت علی اسلامیہ ہال لاہور کے تعزیتی جلسے میں علامہ اقبال نے فرمایا:

"اسلام کی اِدھر پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔"

آپ نے اپنی تقریر کا اختتام اپنے اِس شعر پر کیا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہؒ کے دینی عقائد میں یگانگت تھی اور طبیعتیں بھی آپس میں ملتی تھیں۔ سیرت انور شاہؒ اور سوانح سید انور شاہ کے مطالعہ سے جو باتیں شاہ صاحب کی سیرت و کردار کے بارے میں اُجاگر ہوتی ہیں، وہ اُن کا مطالعہ سے عشق، بے پناہ حافظہ، حسن صورت، لطائف و مزاح، خودداری، رواداری، خدمت مذہب اور عشق رسولؐ ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ حضرت علامہ اقبال کی ذاتِ گرامی میں بھی یہ چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ البتہ اگر اُن دو شخصیتوں میں کوئی اختلاف تھا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں تھا۔

چونکہ دیوبند میں زیادہ اثر و رسوخ شیخ الہند محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تھا اِس لیے یہ دونوں بزرگ "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل

کیلئے بہتر سمجھتے تھے۔ مگر علامہ اقبالؒ متحدہ قومیت کے قائل نہ تھے۔ یعنی اُن کا نقطہ نظر "جداگانہ قومیت" کا تھا۔ بہرحال واقعات اِس امر کے شاہد ہیں کہ دیوبند کے بیشتر علماء کرام نے علامہ شبیر احمد عثمانی کی زیر قیادت تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور علامہ اقبال کی ہمنوائی کی۔

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہؒ مسئلہ ختم نبوت پر بھی کامل یقین رکھتے تھے۔ اِس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے جو جدوجہد کی اُس سے سب آگاہ ہیں اور مولانا انور شاہ صاحب نے علمی اور دینی میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہاں پر اُس مسئلہ پر اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اُنہوں نے اِس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے کئی رسائل لکھے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اِس سلسلہ میں مولانا بدرالحسن در بھنگوی فاضل دیوبند لکھتے ہیں:

"علامہ سید محمد انور شاہ کو اِس فتنہ کی خطرناکی کا شدید احساس تھا اور اِس وجہ سے مسلسل چھ مہینے تک انتہائی کرب اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے حتیٰ کہ نیند اُچاٹ ہو گئی تھی جس کا صحت پر بھی ناخوش گوار اثر مرتب ہونے لگا تھا"۔ [۱۱]

کچھ ایسی ہی کیفیت علامہ اقبالؒ کی بھی تھی۔

مولانا انور شاہؒ نے صحیح بخاری کی چار جلدوں میں شرح لکھی اور سرورِ کائنات ﷺ کی مدح میں عربی زبان میں کئی قصائد قلم بند کیے۔ آپ عربی اور فارسی زبانوں کے باکمال شاعر تھے اور اُن دونوں میں یکساں روانی کے ساتھ شعر بھی کہتے تھے اور نثر میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:

۱۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

۲۔ اکفار الملحدین فی ضروریاتِ الدین

۳۔ فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب

۴۔ کشف الستر عن صلوۃ الوتر

۵۔ نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین

۶۔ بسط الیدین نیل الفرقدین

۷۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم

۸۔ سہم الغیب فی کبد اہل الریب

۹۔ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح

۱۰۔ خاتم النبیین

۱۱۔ تحیۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام

۱۲۔ ازالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العین

۱۳۔ مراقات الطارم لحدوث العالم

۱۴۔ خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب

آپ کے شاگردوں میں مولانا حفظ الرحمن، قاری محمد طیب مولانا مناظر احسن گیلانی، مفتی محمد شفیع، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد یوسف بنوری، حامد الانصاری، غازی مولانا محمد میاں، مولانا محمد منظور نعمانی، قاضی زین العابدین میرٹھی، سید اختر حسین، میر واعظ مولوی یوسف شاہ معروف و ممتاز ہیں۔

حضرت علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" میں لکھا ہے:

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

اے وادیٔ لولاب ۱۲

حواشی

۱۔ مشاہیر کشمیر ۱۹۲
۲۔ مقدمہ التصریح بماتواتر فی نزول المسیح از شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ص ۳۶
۳۔ فتح الملہم، جلد اول، ص ۳۳۵
۴۔ دارالعلوم (دیوبند) فروری ۱۹۷۱ء ص ۲۱
۵۔ سیرت انور شاہ کاشمیری، ص ۳۰
۶۔ دارالعلوم، فروری ۱۹۷۶ء
۷۔ افضل حق قرشی۔ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیری۔ چٹان
۸۔ سیرت انور شاہ کشمیری، ص ۳۰
۹۔ چٹان لاہور، ۱۲/ جنوری ۱۹۷۵ء
۱۰۔ چٹان، لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء
۱۱۔ چٹان، ۲۶ مئی ۱۹۷۵ء
۱۲۔ ارمغان حجاز ۱۷۶۔ المعارف نومبر ۱۹۷۷ء

علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال

بین الاقوامی شہرت کے حامل اسلامی مفکر اور مصنف علامہ محمد اسد ۲۳ فروری ۱۹۹۲ء کو سپین کے شہر ماربیا میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے — اِنا للہ واِنا الیہ راجعون

راقم نے علامہ محمد اسد کا اسم گرامی (جن کا سابقہ نام لیوپولڈ ویس Leopold Weiss تھا) بچپن میں اپنے والد ماجد میاں غلام علی مرحوم اور اُن کے دوست ڈاکٹر نور حسین مرحوم سے سنا تھا۔ یہ دونوں بزرگ علامہ محمد اسد سے اُن دنوں آشنا ہوئے تھے جب برطانوی ہند کی حکومت نے جنگ عالمگیر کے دوران علامہ مرحوم کو نظربند کر دیا تھا اور اُنھوں نے نظربندی کے وہ دن سرینگر کے محلّہ گُرمل باغ کی ایک کوٹھی میں گزارے تھے اور سردار وزیر محمد خان ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، جو اُن دنوں ایس پی سری نگر تھے اُن کی نگرانی پر مامور تھے — والد مرحوم اور ڈاکٹر نور حسین مرحوم کے سردار وزیر محمد خان گہرے دوست تھے اور تینوں ادبی و علمی ذوق و شوق رکھتے تھے اور یہی ادب نوازی اُن تینوں کی قدر مشترک تھی۔" (کشمیر میں اردو)

ترک وطن کے بعد جب ہم لوگ سرینگر سے سیالکوٹ پناہ گزین ہوئے تو وہاں پر بھی ہمارے بزرگ علامہ محمد اسد کا ذکر جمیل بالالتزام کرتے اور جب "The Road to Mecca" چھپ کر آئی تو یہ کتاب فوری طور پر خریدی گئی اور اسے بڑی محبت و خلوص سے پڑھا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام کے علاوہ مغربی دنیا میں بھی اِس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں جب سابق وفاقی وزیر اور اٹارنی جنرل چوہدری نذیر احمد خان مرحوم نے "محبان عالم اسلام" (الاحباء) تنظیم قائم کی اور اسلامی

ممالک کی دولت مشترکہ کا تصور پیش کیا تو چوہدری صاحب مرحوم نے جن مفکرین اسلام سے رابطہ قائم کیا اُن میں علامہ محمد اسد سرفہرست تھے۔ چوہدری صاحب مرحوم کے علامہ محمد اسد سے دیرینہ تعلقات تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ علامہ محمد اسد اُن کے مشن "کامن ویلتھ آف مسلم سٹیٹس" میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ اُن کے تعلقات کئی اسلامی ملکوں کے سربراہان سے تھے ___ راقم کو "الاحباء" کی تنظیم کا بانی سیکرٹری جنرل ہونے کا شرف حاصل ہے اور آج تک اِس جماعت سے بہ الحمد تعلق قائم ہے۔ اِس تنظیم کے موجودہ صدر جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان ہیں۔ علامہ محمد اسد نے الاحباء کی اتحاد عالم اسلامی کی کوششوں کو سراہا تھا اور لاہور میں چوہدری نذیر احمد خان کے مہمان بنے تھے۔ علامہ محمد اسد کے روابط اور تعلقات، علامہ محمد اقبال کے مصاحب خاص سید نذیر نیازی مرحوم سے بھی تھے جو اکثر اپنی صحبتوں میں اُن کا ذکر خیر کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ جس ہستی سے مرحوم علامہ محمد اسد کو پیار اور خلوص تھا وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی ذات گرامی تھی۔ دراصل علامہ محمد اسد کا مسلم مفکرین سے گہرا تعلق تھا اور یہ ایک فطری بات تھی۔ بہرحال آپ جن لوگوں سے متاثر ہوئے اُن میں علامہ محمد اقبال اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اِس ضمن میں علامہ محمد اسد لکھتے ہیں:

"سارے مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں برسوں کی سیاحت کے بعد بالآخر ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ اِس تبدیلی مذہب کے بعد تقریباً چھ سال عرب میں مقیم رہا اور سلطان ابن سعود کا تقرب حاصل رہا، عرب کو چھوڑ کر میں ہندوستان گیا اور وہاں عظیم مسلم مفکر و شاعر محمد اقبال سے نیاز حاصل ہوا جن کو پاکستان کے تخیل کو روحانی بنیاد استوار کرنے میں سب سے سبقت حاصل ہے۔ موصوف ہی کے آمادہ کرنے پر میں جلد ہی مشرقی ترکستان، چین اور انڈونیشیا کے سفر کے اہتمام سے باز آیا اور ہندوستان میں رہ کر اِس ریاست اسلامی کے فکری عناصر ترکیبی و مبادی کی وضاحت میں سعی و معاونت کرنے لگا جس کے خدوخال موصوف کے ذہن میں ہنوز ایک خواب کی مانند مبہم و ناصاف تھے۔ تاہم میرے اور علامہ موصوف دونوں کے نزدیک یہی دھندلا سا خواب اِس واحد راہ کی نشاندہی کرتا تھا جس پر گامزن ہو

کر ہم اسلام کی خوابیدہ آرزوؤں کو بیدار کر سکتے تھے۔"

— یاد رہے کہ "طوفان سے ساحل تک"۔ علامہ محمد اسد کی مشہور کتاب "دی روڈ ٹو مکہ" کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم محمد الحسنی ندوی ہیں اور مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اِس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ ندوی نے اِس کتاب کو "سفرنامہ" سے تعبیر کیا ہے

علامہ اسد کی علامہ اقبال سے ملاقات کے ضمن میں سید نذیر نیازی مرحوم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

" — ۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ اقبال کی وفات سے چند ہفتے پہلے چوہدری نیاز علی صاحب جاوید منزل (میو روڈ لاہور) تشریف لائے۔ علامہ محمد اسد (سابق لیو پولڈویس) بھی اُن کے ساتھ تھے۔ چوہدری صاحب نے علامہ محمد اقبال کی مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ اُنھوں نے قلعہ جمال پور میں ایک وقف دارالسلام کے نام سے قائم کیا ہے تاکہ وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اُن کی خواہش تھی کہ حضرت علامہ اُس کام میں اُن کی رہنمائی فرمائیں اور جیسا کہ اُن کا مشورہ ہو اُس کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالسلام آنے کی دعوت دی جائے — حضرت علامہ نے فرمایا کہ دینی مدارس کی کوئی کمی نہیں — بہتر ہو گا چوہدری صاحب اِس وقف سے کوئی اور کام لیں۔ چوہدری صاحب نے عرض کیا کہ آپ ہی فرمائیے۔ اِس وقف سے کیا کام لینا چاہئے۔

حضرت علامہ نے فرمایا —

" — میرے نزدیک اِس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ بحالت موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹ رہے ہیں اور اِس کی وجہ ہیں وہ سیاسی و اجتماعی مسائل، جنھوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔ ضرور اِس بات کی ہے کہ علماء اُن مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اِس پر سوال پیدا ہوا کہ اکابر علماء کا تو دارالسلام آنا محال

نظر آتا ہے — وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں — حضرت علامہ نے کہا یہ ٹھیک ہے، مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں، اُن میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ بھی شامل ہیں — ضرورت اُن کو جمع کرنے کی ہے۔ پھر حضرت علامہ نے محمد اسد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوہدری نیاز علی سے کہا — دیکھئے یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں کیوں نہ یہ اِس کام کو ہاتھ میں لیں؟ چوہدری صاحب نے کہا کہ اسد صاحب ضرور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں گے مگر اس کام کے لیے تو ایک جماعت کی ضرورت ہے۔"(۲)

علامہ محمد اقبال کے نزدیک سب سے اہم کام فقہ اسلامی کی تشکیل جدید تھی اور زندگی کے آخری ایام میں تو یہ سب سے بڑا مسئلہ اُن کے سامنے تھا اور بقول مولانا عبدالمجید سالک:

" — فقہ اسلامی کے متعلق ڈاکٹر صاحب عمر بھر یہی کہتے رہے کہ بلاشبہ ہمارے فقہا و مجتہدین نے فقہ پر بڑی محنت کی ہے اور اُن کی یہ محنت صرف قابل داد و تحسین ہی نہیں بلکہ اِس سے ہر دور کے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہئے لیکن آج کے دور میں ضرورت ہے کہ اصول فقہ کو زمانہ حال کی "جیورس پروڈنس" کے انداز پر از سر نو مدون کیا جائے تاکہ ہم مسلمانوں کے لئے نہایت واضح نظام شریعت مہیا کر سکیں اور دنیا کو یہ بھی بتا سکیں کہ ہمارا قانون دنیا بھر کے قوانین و شرائع پر بہ ہزار وجوہ فضیلت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ کام خود کرنا چاہتے تھے لیکن انسانی عمر بہت کوتاہ ہے اور کام بہت ہی بڑا ہے — اِس کے علاوہ یہ کام کسی ایک آدمی کے کرنے کا بھی نہیں اس لیے وہ محض اُصول پیش کر سکے اور اپنے ہر خطبے میں انہوں نے مسلمان اہل شریعت اور ماہرین قانون کی توجہ اِس کام کی طرف مبذول کرائی — اب اگر مستقبل میں اہل علم اور اہل فکر کی کوئی جماعت اِس کام کی تکمیل پر کمربستہ ہو گی تو یہ بھی ڈاکٹر اقبال ہی کی تلقین و ہدایت کا نتیجہ ہو گا۔"(۳)

علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ علامہ محمد اسد یہ کام سنبھالیں اور فقہ اسلام کی جدید تدوین کریں جو عصر جدید کی سب سے اہم ضرورت ہے —اس سلسلے میں علامہ محمد اقبال نے مولانا سید انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی سے بھی رجوع کیا تھا۔

علامہ محمد اقبال اِس سے پیشتر علامہ محمد اسد سے متعارف ہو چکے تھے اور اُن سے جب وہ دہلی میں مقیم تھے، سید نذیر نیازی کی وساطت سے اور براہ راست بھی خط و کتابت ہوئی تھی۔ سید نذیر نیازی کو ۲۷ جون ۱۹۳۴ء کو علامہ اقبال نے لکھا تھا:

" — مسٹر محمد اسد (Leopold Weiss) کو ایک خط لکھا تھا اِس کا جواب نہیں آیا۔ اُن سے بھی دریافت کریں کہ میرا خط اُن کو ملا ہے یا نہیں۔ ڈاک خانہ سے دریافت کرنا چاہئے کہ جو خطوط میں نے لکھے ہیں وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچے — والسلام محمد اقبال (۴)

علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ علامہ محمد اسد دہلی میں قرول باغ میں رہتے تھے اور سید نذیر نیازی اُن کے ہمسایہ تھے اور بقول نیازی صاحب:

"اتفاق سے انہیں مکان بھی ملا تو قرول باغ میں اور ایک طرح سے میرے دیوار بہ دیوار یعنی اتنا قریب کہ روز ملاقات ہو جاتی — چند دنوں میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے —" (۵)

۱۹۳۴ء میں ہی علامہ محمد اسد کی مشہور کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈز (Islam at the cross roads) شائع ہوئی۔ جسے ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے پسند کیا۔ اور علامہ محمد اقبال نے بھی اِس کتاب کو پذیرائی بخشی تھی۔ سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں:

"حضرت علامہ نے اُن کی تصنیف — (Islam at the cross roads) کو پسند فرمایا تھا۔ اسد صاحب اُن دنوں اگرچہ صحیح بخاری کا ترجمہ کر رہے تھے لیکن ایک طرح سے تھے بیکار —اِس لئے میں نے اُن کی مرضی پا کر حضرت علامہ سے درخواست کی کہ انہیں اسلامیہ کالج سے منسلک کر دیا جائے۔" (۶)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ محمد اسد نے صحیح بخاری کا ترجمہ کیا اور یہ کتاب چھپ بھی گئی اور اسے سرینگر سے شائع کیا گیا۔ سنہ اشاعت ۱۹۳۵ء ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اِس کتاب کو اپنی ذاتی لائبریری میں رکھا۔ اب وہ نسخہ اقبال میوزیم، میو روڈ میں موجود

ہے اس پر لکھا ہے — "صحیح بخاری- مرتبہ محمد اسد — " یہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اعمال کا مکمل ریکارڈ — جو صحابہ سے اُن کے پیروؤں تک پہنچا اور جنھوں نے تیسری صدی ہجری میں اُنھیں مرتب کیا- یہ امام ابو عبداللہ محمد بن اسمعیل ابن المغیرہ البخاری کی روایات ہیں اور محمد اسد نے عربی سے اُن کا ترجمہ کرتے ہوئے کچھ تشریحی اشارات اور کچھ فہرستیں بھی اُن میں شامل کی ہیں- جلد اول- الہام کس طرح شروع ہوا — مطبوعہ عرفات پبلی کیشنز سرینگر ۱۹۳۵ء — "۔

جہاں تک علامہ محمد اسد کے اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت کا تعلق ہے، علامہ محمد اقبال نے سید نذیر نیازی کو لکھا "محمد اسد صاحب کو میں نے خط لکھا دیا ہے"

چونکہ علامہ محمد اقبال کو علامہ محمد اسد کے ذریعہ معاش کی بے حد فکر رہتی تھی- وہ چاہتے تھے کہ وہ کہیں ملازم ہو جائیں وہ اُن کی دینی علمیت و بصیرت کے مداح تھے لہٰذا سید نذیر نیازی کو ۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو لکھا —

"معلوم نہیں محمد اسد کیا کرتے ہیں؟ شاید وہ کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ نکالنے والے ہیں- میرا خیال تھا کہ اُن کو کہیں دینیات کا یا عربی زبان کا پروفیسر کر دیا جائے- اُن کی انگریزی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین اسلام کے اسرار سے ناواقف نہیں- اگرچہ اُن کے Pessimism سے مجھے اتفاق نہیں- والسلام- محمد اقبال"۔

۱۹۳۴ء میں سر شیخ عبدالقادر کے بعد علامہ محمد اقبال انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۳۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے- یعنی چار سال تک انجمن ہذا کے صدر رہے- آپ نے ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور ۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو علالت طبع کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا- روائیداد جنرل کونسل انجمن حمایت لاہور مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء میں لکھا ہے: "علامہ اقبال نے جب علالت طبع کی وجہ سے انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے استعفیٰ دیا تو جنرل کونسل نے علامہ موصوف کی خدمات کو سراہتے ہوئے قرار داد پاس کی اور اُن کی صحت یابی کے لئے دعا کی-"

کہنا یہ ہے کہ جن دنوں علامہ محمد اسد کے لئے علامہ محمد اقبال پروفیسر کی اسامی کے لئے کوشاں تھے تو اس وقت وہی انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر بھی تھے- انھوں نے

۲۲ جولائی ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو لکھا:

"محمد اسد صاحب سے کہئے کہ کالج کمیٹی منگل کے روز اُن کے معاملے کا فیصلہ کرے گی۔ میں نے خلیفہ شجاع الدین سیکرٹری کمیٹی سے کہہ دیا ہے کہ فیصلہ سے اُن کو مطلع کر دیں۔ والسلام محمد اقبال۔"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ علامہ محمد اسد دینیات کے پروفیسر بنیں اور یہ خدمات اسلامیہ کالج لاہور میں سرانجام دیں جہاں اُن کی تقرری کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو علامہ محمد اقبال نے جو تحریری تقریر جنرل کونسل میں کی تھی اُس میں فرمایا:

"اول! دینیات کی تعلیم — "اب میری استدعا آپ سے یہ ہے کہ اِس معاملہ پر کافی غور و خوض کے بعد زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق انجمن کے کالج اور سکولوں میں دینی اور اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مجھے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ انجمن حمایت اسلام کی آئندہ کامیابی (بلکہ ایک قومی ادارہ ہونے کی حیثیت سے اِس کی آئندہ زندگی) صرف اِسی ایک مسئلہ کے کامیاب حل پر انحصار رکھتی ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اراکین کالج کمیٹی اِس ضروری امر کے متعلق جو فیصلہ کر چکے ہیں اب آپ کا اِس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانا باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ایسا کیا جائے گا —"

یہ اشارہ علامہ محمد اسد کی تقرری کے فیصلہ کی طرف تھا۔ اِس تقریر میں آپ نے مسٹر عبداللہ یوسف علی کے بارے میں فرمایا:

"مسٹر عبداللہ یوسف علی اگر اِس عہدہ جلیلہ پر واپس آ سکتے تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل ہو جاتا" یعنی اسلامیہ کالج کے پرنسپل دوبارہ بن جاتے۔ (۱۱)

علامہ اقبال پڑھے لکھے اور علوم جدیدہ سے واقف دانش مندوں کی تلاش میں رہتے تھے جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ علامہ محمد اقبال علامہ محمد اسد کے بارے میں متفکر رہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ وہ جلد از جلد لاہور آ جائیں اور اسلامیہ کالج سے منسلک ہو جائیں انہوں نے سید نذیر نیازی کو خط میں لکھا:

" — محمد اسد صاحب سے کہہ دیں کہ کالج کمیٹی کی میٹنگ منگل کی بجائے جمعرات کو ہو گی جو فیصلہ ہو گا اِس سے آپ کو مطلع کیا جائے گا —

"۱۲

۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء کے خط بنام سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

" — محمد اسد صاحب سے کہہ دیجئے کہ کالج کمیٹی نے اُن کا تقرر منظور کر لیا ہے۔ امتحاناً" چھ ماہ کے لیے اُن کی تنخواہ مقرر کرنے کا اختیار اُنھوں نے یعنی کالج کمیٹی نے مجھ کو دیا ہے۔ کمیٹی سے باقاعدہ اطلاع آنے پر میں اُن کو خط لکھوں گا۔ میرے خیال میں اُن کو کم تنخواہ پر بھی یہ جگہ قبول کر لینی چاہیے کیونکہ اِس جگہ کے امکانات بہت ہیں۔

والسلام — محمد اقبال"۱۳

اس خط کے دو روز بعد یعنی ۳۰ جولائی کو لکھتے ہیں:

"مسٹر محمد اسد کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ اُن کا خط بھی آج آیا تھا۔ میرا پیغام اُن تک پہنچا دیں جس میں میں نے کالج کمیٹی والے فیصلہ کی اطلاع دے دی ہے۔ کمیٹی نے اُن کے حق میں فیصلہ کیا ہے، یعنی اُن کو ملازم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ کو اختیار دیا ہے کہ میں اُن کی تنخواہ مقرر کر دوں۔ ابھی تک میرے پاس باقاعدہ اطلاع کمیٹی کی طرف سے نہیں آئی۔ مولوی غلام محی الدین صاحب سیکرٹری انجمن سے زبانی سنا ہے۔ اطلاع آنے پر میں اُن کو خود لکھوں گا۔ فی الحال میں اُن کو صرف اِسی قدر مشورہ دیتا ہوں کہ کچھ تنخواہ پر بھی اُس جگہ کو قبول کر لیں۔ وہ ۳۵۰ روپیہ ماہوار پر راضی ہیں مگر کالج کے فنڈ ابھی اُس تنخواہ کی شاید اجازت نہیں دیتے۔ وہ خود اُس میں Reasonable Reduction کر دیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر آئندہ چھ ماہ میں اُنھوں نے تعلیم دی کو عمدگی کے ساتھ سرانجام دیا تو انجمن اُن کی تنخواہ بڑھا دے گی۔ میرے خیال میں وہ فی الحال ۲۵۰ روپیہ ماہوار قبول کر لیں۔ اگر یہ ناممکن ہے تو اطلاع دیں۔ اگر مجوزہ رسالہ بھی وہ نکالتے ہیں تو ممکن ہے اِس سے اُن کی آمدنی میں اضافہ ہو۔"۱۴

اِس ضمن میں سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ "اسد صاحب سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں خود ہی لاہور جا رہا ہوں حضرت علامہ سے مل کر سب باتیں کر لوں گا۔" (۱۵)

علامہ محمد اسد اِس عرصہ میں لاہور میں مقیم رہے اور اُن کا علامہ اقبال سے مسلسل رابطہ رہا اور یہ وہ ایام ہیں جب علامہ اقبال صاحب فراش تھے۔ اِس ضمن میں سید نذیر نیازی اپنی معروف کتاب "اقبال کے حضور" جزو اول جنوری تا ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کے صفحات ۳۸۶ میں لکھتے ہیں:

"اسد صاحب کا دیر سے خیال تھا کہ بعض جرمن ڈاکٹر جو لاہور میں مقیم ہیں اور مطب کر رہے ہیں کیوں نہ وہ بھی حضرت علامہ کو دیکھ لیں۔ اُن کا طریق علاج اگرچہ مختلف ہے اور بہت ممکن ہے وہ علاج کریں تو سب سے الگ تھلگ رہ کر، یعنی اِس شرط پر کہ اُن کے علاج میں کسی دوسرے کا دخل نہ ہو، لیکن اُن سے مشورہ لینے میں کیا حرج ہے۔ اُن میں ایک تو ڈاکٹر سیلزر تھے اور دوسرے ڈاکٹر کالیش۔ میں نے اسد صاحب سے کہہ رکھا تھا آپ اُن میں سے کسی سے بات کرلیں۔" (۱۶)

بہرحال علامہ محمد اسد کی سعی سے ڈاکٹر سیلزر "جاوید منزل" آئے اور انہوں نے علامہ محمد اقبال کا طبی معائنہ کیا اور گفتگو بھی کی۔ بقول سید نذیر نیازی ان ایام میں علامہ محمد اسد ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے اور علامہ محمد اقبال سے ملتے رہتے تھے۔

قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد علامہ محمد اسد حکومت پاکستان سے وابستہ ہو گئے تھے خود اِسی تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام وجود میں آیا تو حکومت پاکستان کی طرف سے میں ایک محکمہ "اسلامی تعمیری جدید" کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا، جس کا مقصد ریاست اور ملت کے بارے میں اسلام کے معیاری تصور کی تفصیل و توضیح تھی جس سے یہ نوزائیدہ سیاسی جماعت استفادہ کر سکے۔ اِس باب میں دو سال کی انتہائی حرکت آفریں جدوجہد کے بعد میری خدمت پاکستان کے محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور میرا تقرر وزارت خارجہ میں حلقہ مشرق

وسطیٰ کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ چنانچہ پاکستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کے باہمی رشتہ کو مضبوط اور استوار بنانے کے لئے میں نے خود کو وقف کر دیا اور بالآخر اقوام متحدہ کے لئے نیویارک میں مجھے پاکستان کے وفد اور اُس کی مہم سے متعلق آگاہ کر دیا گیا"۔ (۱۷)

علامہ محمد اسد پولینڈ کے شہر لوو (Lowow) کے مکین تھے۔ اُن کا تعلق یہودیوں کے ایک خاندان سے تھا۔ اُن کے والد ایک پڑھے لکھے انسان تھے لیکن علامہ اسد ابتداہی سے ایک روحانی خلا محسوس کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا، جہاں اسلامی اور عربی تہذیب و تمدن کو دیکھنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی ساتھ مذاہب عالم کا تقابل بھی کرتے رہے۔ اِس کے بعد سوویت یونین جانے کا موقع ملا اور اشتراکی معاشرہ کو دیکھا۔ پھر جرمنی گئے جہاں اُنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اِس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اب مجھے یقین ہو گیا کہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں ہے جو ایک دور دراز جزیرۃ العرب میں تاریخ کے کسی دور میں تھا۔ اِس لیے کہ یہ انسان لاکھ سمجھدار، حکیم اور دانا سہی مگر پھر بھی اس عذاب کی پیش گوئی نہیں کر سکتا جو بیسویں صدی کی خصوصیت ہے مجھے قرآن کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ اونچی اور گہری آواز سنائی دے رہی تھی۔ اِس بات کا واضح اور کھلا ہوا نتیجہ یہ تھا کہ میں ایک مسلمان ہندوستانی دوست کے پاس گیا جو اُس وقت برلن میں مسلمانوں کی انجمن کے صدر تھے اور اُن سے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُنہوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی اپنا داہنا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دو گواہوں کی موجودگی میں میں نے کہا

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ - میرے دوست نے کہا کہ آپ کا نام (Leopold) ہے لیو کے معنی یونانی شیر کے ہوتے ہیں۔ اِس لئے ہم آج سے آپ کو "محمد اسد" کہیں گے۔ چند ہفتے بعد میری بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا"

۱۹۳۴ء میں علامہ محمد اسد نے Islam at the cross roads لکھی تھی جسے ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے پسند کیا تھا اور جن دنوں یعنی ۱۹۴۶ء میں جب آپ ڈلہوزی میں قیام پذیر تھے تو ایک انگریزی ماہنامہ Arafat کے نام سے شائع کیا تھا۔"

علامہ محمد اسد قرآن حکیم کے مطالعے اور اُس کے اعجاز سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ پھر احادیث نبوی کو پڑھا اور صحیح بخاری کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا یعنی آپ سیرت رسول اکرمؐ کے ہر گوشہ سے منور ہوئے اور دین مبین کی تبلیغ و اشاعت سے منسلک ہو گئے۔ "علامہ محمد اقبال" کے فکر و نظر کا منبع اور سرچشمہ بھی قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ تھا۔ اُن دونوں مفکروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ دین مصطفویؐ ہی عالم انسانیت کی رہبری اور رہنمائی کا یارا رکھتا ہے اور عہد حاضر کے تقاضوں پر بھی پورا اُترتا ہے مگر ضرورت اِس امر کی ہے کہ دین اسلام کی حقیقی روح کو عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ فقہ اسلامی کی جدید طرز پر تدوین ہو۔ اِس سلسلہ میں اُنھوں نے علامہ سید محمد انور شاہ دیوبندی سے بھی رجوع کیا تھا اور علامہ محمد اسد کی توجہ بھی اِس طرف مبذول کرائی تھی جنھوں نے اپنی زندگی میں اسلام کی حقانیت کی تبلیغ کی اور جب تک جئے اپنے تبلیغی مشن کو جاری و ساری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اِس جہاں رنگ و بو سے اُٹھ جانے کے بعد دنیائے اسلام ایک ایسے مبلغ اور عالم سے محروم ہو گئی جس کے دل میں وہی تڑپ، وہی اُمنگ اور وہ ولولہ تھا جو علامہ محمد اقبال میں تھا جنہیں ایرانی مفکر اور دانش ور ڈاکٹر علی شریعتی نے "مصلح قرن آخر" کے نام سے پکارا ہے۔ محمد اسد اِسی ترجمانِ حقیقت کا ہم قدم بھی تھا اور ہم آواز بھی —!

حواشی

۱- (طوفان سے ساحل تک ص- ۳۶)
۲- (ہفت روزہ ایشیاء- اقبال نمبر ۱۷- اپریل ۱۹۶۹ء)
۳- (یاران کہن ص ۳۵)
۴- مکتوبات اقبال- ص ۱۵۹
۵- مکتوبات اقبال- ص ۱۵۹
۶- ایضا
۷- آثار علامہ اقبال ص- ۱۱۳
۸- ایضا ص ۱۷۱
۹- مکتوبات اقبال ص- ۱۶۱
۱۰- ایضا ص ۱۷۳
۱۱- اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص- ۱۲۷- ۱۲۸
۱۲- مکتوبات اقبال ص- ۱۷۵
۱۳- مکتوبات اقبال ص- ۱۷۸
۱۴- ایضا ص- ۱۷۹-۱۸۰
۱۵- مکتوبات اقبال ص ۱۸۰
۱۶- اقبال کے حضور میں ص- ۳۸۳
۱۷- طوفان سے ساحل تک صفحہ ۳۷

اقبال اور مجدد الکشامرہ محمد الدین فوق

یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ تاریخ کشمیر کی نشاۃ الثانیہ اور کشمیری علم و ادب کے بکھرے اور گم شدہ اوراق کی ترتیب و جستجو کے سلسلہ میں منشی محمد الدین فوق کو اولیت حاصل ہے اور جس لگاؤ اور عشق سے انہوں نے کشمیر کے مسائل و معاملات کو اپنی زندگی میں سمو کر صفحہ قرطاس پر نکھارا ہے وہ کشمیری قوم پر ایک عظیم احسان سے کم نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عصر جدید میں اگر فوق مرحوم کی کاوشِ فکر کا نچوڑ اور ادبی کوششوں کی شاہکار تصانیف موجود نہ ہوتیں تو کشمیریوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اپنی تاریخ جاننے اور سمجھنے میں خاصی مشکلات پیش آتیں۔ چنانچہ منشی محمد الدین فوق کی انہی کوششوں کو علامہ اقبال نے سراہتے ہوئے اُنہیں "مجدد الکشامرہ" کے نام سے یاد کیا اور خود فوق مرحوم کے الفاظ میں:

> "راقم الحروف نے کشمیر کے متعلق جس قدر کتابیں لکھی ہیں، ان کو سر اقبال نے ہمیشہ پسند کیا اور اپنی زریں آراء سے کتابوں کی وقعت کو دوچند کر دیا ہے۔ میری اخباری خدمات اور تصنیفات متعلقہ کشمیر کی وجہ سے آپ نے بارہا "مجدد الکشامرہ" لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خطہ کشمیر کے بارہ تیرہ لاکھ انسانوں کی تعلیمی و اخلاقی پستی کو دور کرنے اور ان لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے والوں کی خدمات کو پسند فرماتے ہیں۔" [1]

منشی محمد الدین فوق نہ صرف خود ایک محقق، مورخ، صحافی اور شاعر تھے بلکہ انہوں نے کئی موضوعات پر تحقیقی مقالات قلم بند کرائے اس ضمن میں مورخ اسلام مولانا اکبر

شاہ خاں نجیب آبادی رقمطراز ہیں:

"میرے محترم دوست اور تاریخی مطالعہ کا بے حد شوق رکھنے کی وجہ سے میرے ہم ذوق مولوی محمد الدین فوق جو اپنی کثیر التعداد اور نافع ملک و ملت تصانیف اور قومی و وطنی خدمت میں خاموشی کے ساتھ مصروفیت و انہماک رکھنے کی وجہ سے پنجاب و کشمیر کے لیے مایہ ناز اور اپنی خوش اخلاقی و وضعداری کے سبب محبوب احباب ہیں، اس عاجز کو اس امر کے لیے مجبور کرنے میں کامیاب ہوئے کہ غنی کاشمیری کی نسبت ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کروں۔" (۲)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشہور فارسی گو کشمیری شاعر ملا محمد طاہر غنی کاشمیری پر مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے جو کتابچہ تحریر فرمایا تھا اس کا محرک جذبہ مولانا فوق کا اسرار اور ارشاد تھا۔

فوق کی سب سے بڑی خوبی اور عظمت یہ تھی کہ انہوں نے تاریخ کشمیر بلکہ تاریخ عالم کے اوراق کا سراغ لگانے کے لیے خود ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں کا سفر کیا۔ کتب خانوں میں برسوں پرانی کتابوں اور علمی و ادبی نسخہ جات کی ورق گردانی کی اور تاریخ حریت اسلام اور تاریخ کشمیر اور تاریخ اقوام کشمیر کو سنوارا اس سلسلہ میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"ایک عرصہ سے اس امر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ قلمی دنیا کے تاریخی کتب خانہ میں تاریخ کشمیر کی جو الماری خالی پڑی ہے کسی جلامع کتاب سے آراستہ کی جائے خصوصاً جبکہ اردو، فارسی، انگریزی اور شاستری کے موجودہ صحیفوں کی منتشر اور پریشان اور مبالغہ آمیز تحریریں دیکھی جاتی ہیں تو اضطراب اور بھی بڑھتا ہے۔" (فوق)

غرضیکہ ایک ذوق اضطراب اور اشتیاق کو لیے انہوں نے کوشش کی سب سے پہلے تاریخ کشمیر کی حقیقت اقوام عالم کے سامنے آجائے جو اصل حقائق کی غماز بھی ہو اور زمانہ حال کے علمی و ادبی تقاضوں کے مطابق بھی کیونکہ مولانا محمد الدین فوق کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ ان کے پیش رو مورخین اور صحافیوں نے اپنے اپنے مذاق اور معلومات کے موافق پبلک کی قابل قدر خدمات کیں لیکن افسوس کہ ان کی جانکاہ کوششیں نئی روشنی کے

میدان تحقیق میں ایسی مفید ثابت ہو سکیں کہ انہیں مکمل اور مستند مانا جاتا۔

اس سلسلہ میں ریاست کے مشہور صحافی، سیاست دان اور مورخ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کس قدر درست کہا ہے:

"منشی محمد الدین فوق کشمیر کے ان محبانِ وطن بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے وطن میں ایک وسیع ذہنی سیاسی و مجلسی انقلاب پیدا کرنے کے لیے انتھک کام کیا جب کشمیر کے عوام خوابِ غفلت میں پڑے تھے اور تعلیم یافتہ لوگ اپنی ذاتی اغراض کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے تو فوق صاحب شب و روز اپنے قلم سے انہیں جگانے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈر بنا فیشن میں شامل ہو گیا تھا یا لیڈر بننے سے کوئی سیاسی اور اقتصادی فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ اُن دنوں وطن کی آزادی کے لیے لڑنا بہت مہنگا پڑتا تھا لیکن فوق صاحب عام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور آج جب ان کے مضامین اور کتابوں کو پڑھتا ہوں جو انہوں نے آج تیس چالیس سال قبل سپرد قلم کی تھیں تو مجھے ان کی جرات اور ہمت دیکھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی۔" (۳)

چنانچہ اس علمی و تاریخی تشنگی کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے ایک مکمل اور مستند اور تاریخ کشمیر لکھنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کی تصنیف و تالیف کے لیے پانچ ہزار اٹھاسی سال قبل کے تاریخی واقعات کو قدیم مذہبی، دینی اور تاریخی کتابوں سے اخذ کیا۔ مولانا فوق نے کشمیر کو ایک مستقل موضوع بنایا اور پھر اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تحقیقی تنقیدی علمی اور تاریخی کتابیں تحریر کیں۔

قدیم تاریخ کشمیر

جس میں تاریخ کشمیر، تاریخ اقوامِ کشمیر، تاریخ بڈ شاہی، کشمیر کا نادر شاہ، مشاہیر کشمیر، کشمیر کی رانیاں، تذکرہ زین العابدین، حالات نواب دبیر الدولہ کاشمیری قابل ذکر ہیں۔

ادبیاتِ کشمیر

اس حصہ میں حکایاتِ کشمیر، للہ عارفہ، تذکرہ شیخ نور الدین ولی، شاہی سیر کشمیر، ادبی اہمیت کی حامل اور نمائندہ کتب ہیں۔

اخلاق و معاشرت

اس حصہ میں خواتین کشمیر، آئینہ کشمیر، راہنمائے کشمیر شامل ہیں۔

صحافت و سوانح حیات

مولانا فوق نے اپنی زندگی کی سرگزشت بھی تحریر کی جو کتابی صورت میں سامنے نہیں آئی البتہ اخبار، انصاف راولپنڈی میں شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب اس دور کے تاریخی سیاسی علمی و ادبی معرکوں پر سب سے زیادہ مستند داستان ہے اور اس میں ایسی باتیں رقم ہیں جو ابھی تک اہل علم و ادب کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ مولانا محمد الدین فوق نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ کشمیر کے موضوع پر صرف کیا مگر ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اسلامیانِ عالم کے مسائل و تاریخ کو نظرانداز نہیں کیا اور اس صیغہ میں بھی خاصا کام کر کے مندرجہ ذیل کتب تصنیف فرمائیں۔ ملا عبدالحکیم، تاریخ حریت اسلام، حیات داتا گنج بخش، تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور، یاد رفتگان، روایاتِ اسلام، حکمت کے موتی، تذکرۃ الصالحین، ان اسلامی اور تاریخی کتابوں کے علاوہ انہوں نے علاقائی واقعات اور مشہور حاکموں کے بارے میں بھی کتابیں تحریر کیں جن میں فاتح ملتان، حیات جہانگیر و نورجہاں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ قابل ذکر ہیں۔ اس طرح مشہور عالم شعرائے کرام کے حالات بھی تصنیف و ترتیب دیئے جن میں مولانا روم، شمس تبریز اہل علم و ذوق حضرات کے لیے باعث کشش و قدر ہیں ان علمی و ادبی کتابوں کے علاوہ فوق نے طبع زاد ناول لکھے ہیں جن میں انار کلی، خانہ بربادی، رام کہانی اور محروم تمنا مشہور ہیں۔

مولانا فوق صرف نثر کے دھنی ہی نہ تھے بلکہ ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ کلام فوق کے نام سے مجموعہ اشعار شائع ہو چکا ہے جس کا دیباچہ پروفیسر محمد علم الدین سالک نے لکھا تھا۔ آپ حضرت داغ کے شاگرد تھے۔ علامہ اقبال نے انکے مجموعہ کلام کی تاریخ کہی۔

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعہ اشعار
معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نظر فوق
شستہ ہے زباں جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نظر فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہوئی اقبال
ہاتف نے کہا لکھ دے کمالِ نظر فوق

اِن سب چیزوں کے علاوہ جو چیز آپ کی شہرت و عظمت کا سبب بنی وہ اُن کی اخبار نویسی تھی آپ نے "پیسہ اخبار" سے اپنی صحافیانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۱ء میں اپنا پہلا اخبار "پنجہ فولاد" جاری کیا۔ ۱۹۰۶ء میں کشمیر میگزین ۱۹۱۲ء میں "اخبار کشمیری" جاری کیا جو ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔

علامہ اقبال اور فوق مرحوم کو اگر جنم جنم کے ساتھی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اُٹھا۔ دونوں سیالکوٹ کی فضاؤں میں پل کر جوان ہوئے دونوں نے اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین کے نغمے گائے دونوں ایک ہی استاد حضرت نواب مرزا داغ کے شاگرد بنے، دونوں نے اسلام کے آفاقی نظریہ حیات کی تبلیغ و اشاعت کی، دونوں نے داتا کی نگری کو مسکن بنایا اور پھر دونوں اِسی شہر میں پیوند خاک ہوئے۔ علامہ اقبال اور فوق دونوں ایک دوسرے کو اوائل عمر سے ہی جانتے اور پہچانتے تھے اور اُن کا یہ تعلق عمر بھر قائم رہا۔ اگر علامہ اقبال نے فوق مرحوم کی ادبی و علمی کاوشوں کو سراہا اور اُن کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا تو فوق نے بھی علامہ اقبال کی شخصیت و شاعری کا تعارف نہایت فراخدلی اور خلوص و محبت سے کرایا، یہاں پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب فوق مرحوم نے اپنا پہلا اخبار "پنجہ فولاد" نکالا تو علامہ اقبال نے لکھا ۔

پنجہ فولاد اک اخبار ہے
جس سے سارا ہند واقف کار ہے
ہے روش اِس کی پسند خاص و عام
واہ واہ کیا معتدل اخبار ہے

کون ہے اِس بانکے پرچے کا مدیر
بات یہ بھی قابل اظہار ہے
نام ہے اِس کا محمد دین فوق
عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے

یہاں پر سب سے قابل ذکر بات ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی میں سید نذیر نیازی کے بعد اگر کسی شخصیت کو سب سے زیادہ خطوط لکھے ہیں تو وہ مولانا فوق مرحوم ہی ہیں۔ علامہ اقبال کا فوق مرحوم سے سلسلہ مراسلت ۱۹۰۴ء سے شروع ہوتا ہے اور غالباً اِس سال ہی فوق مرحوم نے اہل اللہ کے حالات پر مشتمل "یاد رفتگان" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی تھی اِس پر علامہ اقبال نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو فوق کو لکھا —

"بھائی فوق! خود بھی اِس گوہر نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے۔"(۴)

۲۹ اگست ۱۹۰۸ء کو ایک خط میں لکھا —

" — آپ جموں کے رستے جائیں تو ضرور سیالکوٹ تشریف لائیں تاکہ مجھے آپ کی دوستانہ قدر و منزلت کرنے کا موقع ملے۔ افسوس ہے کہ میں ابھی کچھ عرصہ تک آپ کے لئے کچھ نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ ہمہ تن قانون کی کتب کی طرف متوجہ ہوں" ...انشاء اللہ نومبر میں لاہور چلا جاؤں گا اور مستقل طور پر کام شروع کروں گا۔ اِس وقت آپ سے ملاقات ہوا کرے گی۔ جیسے کبھی کبھی پہلے ہوا کرتی تھی اور میں کشمیری گوت کے متعلق بھی چند باتیں آپ سے کروں گا۔"(۵)

علامہ اقبال نے اپنے خط میں جن ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے وہ بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کی انجمن اتحاد کے مشاعروں کی ہیں جہاں دونوں بطورِ شاعر کے شرکت کرتے تھے — فوق مرحوم نے علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی قلمبند کئے اور کشمیری میگزین میں شائع کئے۔ اُنہیں علامہ اقبال نے بے حد پسند کیا اور ایک خط میں اِس کی نقل طلب کی اور جب مولانا فوق نے "تاریخ حریت اسلام" لکھی تو علامہ اقبال نے اِنہیں لکھا:

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء

ڈیر فوق، اسلام علیکم

دونوں کتابوں کا پیکٹ ابھی ملا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے "تاریخ حریت اسلام" بھی لکھی ہے یہ کتاب لاجواب ہو گی اور مسلمانوں کے لئے تازیانے کا کام دے گی۔ آپ بڑا کام کر رہے ہیں اس کا اجر خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے ملے گا۔ والسلام محمد اقبال لاہور (۶)

اور جب فوق سیالکوٹ کے شعراء سے متعلق لکھنا چاہتے تھے تو حضرت علامہ نے لکھا:

ڈیر فوق، السلام علیکم

مخدوی جناب مولوی صاحب نے جو نام لکھے ہیں اُن سے میں کسی کو نہیں جانتا۔ سوائے عشق پیچہ شاعر کے جو کوئی شاعر نہ تھا۔ ہاں تک بند ضرور تھا۔ سیالکوٹ کے قدیم شعراء میں سے شیخ محمد علی رائج تھے۔ اُن کا دیوان فارسی میں بہت ضخیم میں نے خود دیکھا ہے۔ غالباً شاہجہان یا عالمگیر کے عہد میں تھے۔ ٹیک چند نے "بہار عجم" میں جابجا اُن کے اشعار کو محاورات فارسی کی سند میں لکھا ہے۔ ایک شعر اُن کا مجھے بھی یاد ہے ؎

از جوانے سرو قد دیگر بہ بند افتادہ ام
دوستاں، رحمے کہ ازبام بلند افتادہ ام

"غالباً کسی نہ کسی تذکرے میں ان کا ذکر آپ کو ضرور مل جائے گا مولوی صاحب، قبلہ میر حسن صاحب کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے میری کوئی نظم نہیں شاید کوئی شعر اشارتاً کسی نظم میں ہو۔ والسلام، محمد اقبال ۴ مارچ ۱۹۲۳ء

علامہ اقبال کو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ خطہ کشمیر اور اہل کشمیر سے بے حد محبت و عقیدت تھی اور اس لئے بھی وہ فوق مرحوم سے پیار و محبت کرتے تھے کہ وہ اپنے قلم سے خفتہ بخت کشمیریوں کو بیدار کرنے کے لئے سعی کر رہے ہیں علامہ اقبال اور فوق مرحوم دونوں نے ریاست میں تحریک آزادی کا بیج بویا۔ دونوں نے اسی سلسلہ میں قلمی و عملی

جہاد کیا۔ حکومت برطانیہ کی طرف کشمیریوں کے معاملات کو حل کرنے کے لئے رجوع کیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ والی کشمیر سے ملاقاتیں کیں، سفر کشمیر اختیار کیا۔ اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کیا۔ یہ درست ہے کہ علامہ نے ۱۹۳۱ء کی تحریک حریت کشمیر میں "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" کے پلیٹ فارم سے اور پھر ذاتی حیثیت سے کشمیریوں کی آزادی اور بالخصوص اسیران کشمیر کے مقدمات کی پیروی اور رہائی کے لئے بھرپور جدوجہد کی، درحقیقت یہ جدوجہد ان کی ان ابتدائی کوششوں کی ایک کڑی تھی جس کا آغاز آپ نے اوائل عمر میں کیا تھا، کشمیری برادری، اور "انجمن کشمیر مسلمانان پنجاب" کی تنظیموں میں آپ نے بڑھ چڑھ حصہ لیا تھا۔ فوق بھی ان تنظموں سے باواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ تھے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ فوق مرحوم کے اخبارات و جرائد ہی کشمیریوں کی ان تنظیموں کے آرگن تھے، علامہ اقبال نے نہ صرف بیرون کشمیر کی کشمیری تنظیموں کی قلمی، علمی اور مالی امداد کی بلکہ وہ اندرون کشمیر کی جماعتوں کی امداد فرماتے تھے اس سلسلہ میں فوق مرحوم اپنی "سرگزشت" میں لکھتے ہیں: "قریباً ۵۰۰ کا چندہ میں نے اپنے ممبران خاندان اوراحباب اور اخبار کے خریداروں سے جمع کر کے انجمن نصرت اسلام میں پیش کیا اس چندہ میں ڈاکٹر محمد اقبال کے پانچ روپیہ اور میرے ہندو اخبار نویس دوستوں نے روپے بھی شامل تھے۔"

یہ بات ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء کی ہے۔

علامہ اقبال نے فوق مرحوم کی اہلیہ محترمہ کی وفات پر لکھا:

ڈیئر فوق صاحب اسلام علیکم۔

اخبار انقلاب میں آپ کی اہلیہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ مرحومہ کو جنت عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل۔ تقدیر الٰہی سے کوئی چارہ نہیں۔ مسلماں کے لئے تسلیم کے سوا کوئی راہ نہیں اور یہی راہ انسب و اولیٰ ہے۔ والسلام محمد اقبال۔ (۸)

۱۹۳۷ء میں جب فوق مرحوم کے چچا منشی غلام محمد خادم جن کے بارے میں چوہدری خوشی محمد ناظر نے لکھا۔

اولیں جرعہ نوش آزادی،

علامہ اقبال کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے پوچھا۔

"فوق کہاں ہے ایک سال سے نہیں ملا۔ انہوں نے کہا وہ بیمار ہیں اس لیے میرے ساتھ نہیں آ سکے مئی ۳۶ء کی شام کو آئے تھے آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی وہ دل شکستہ ہو کر واپس چلے گئے، اقبال نے کہا مجھے ضعف نظر کی شکایت ہے۔ میں تو آپ کو بھی نہ پہچان سکا(۹) فوق مرحوم کی علالت ہی میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور تمام عالم اسلام رنج و غم میں ڈوب گیا۔ ان غم زدوں میں فوق مرحوم بھی تھے جو بقول مولوی محمد عبداللہ قریشی" — ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کی وفات کے دن بھی فوق صاحب بیمار تھے ان کو سخت بخار تھا اس لئے جاوید منزل تک نہ جا سکے لیکن اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ تک چلے آئے جہاں تمام لوگ جمع تھے وہاں سے جنازے کے ہمراہ بادشاہی مسجد تک گئے، اور جب تک انہیں سپرد خاک نہ کر دیا گیا وہاں سے نہ ہلے۔ پھر جب تک زندہ رہے ان کا ماتم کرتے ان کی یاد سینے سے لگاتے رہے دیکھئے ایک غزل میں ان کی رفاقت کا ذکر کس حسرت سے کرتے ہیں ؎

اجل اس مرد حق کو بھی جہاں سے لے گئی یارب
حقیقت کا جس سے بھیجا بنا کر ترجماں تو نے
ہوئے ہیں جس سے اسرار خودی و بے خودی ظاہر
نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیر مغاں تو نے
کیا اے فوق چاک اقبال نے اسرار کا پردہ
جو باقی رہ گئے تھے کر دیئے وہ بھی عیاں تو نے

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں ؎

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی
فطرت حق کا جسے کچھ رازداں سمجھا تھا میں
یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبر دین خودی
یا چراغ محفل ہندوستاں سمجھا تھا میں

علامہ کی وفات کے چند سال بعد فوق مرحوم بھی ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو وفات پا گئے اور بقول خود ان کے ؎

مدہم سی روشنی تھی چراغ حیات میں
اے باد مرگ تو نے اسے بھی بجھا دیا

حواشی

۱۔ مشاہیر کشمیر ص ۲۰۵-۲۰۶
۲۔ سوانح مولانا غنی ص ۵-۶
۳۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز بنام مدیر "جدید کشمیر" مظفر آباد۔ ۳۰ اگست ۱۹۵۹ء
۴۔ انوار اقبال ص ۵۲
۵۔ انوار اقبال۔ ص ۵۳-۵۴
۶۔ ایضاً۔ ص ۶۹
۷۔ ایضاً۔ ص ۷۳-۷۴
۸۔ ایضاً۔ ص ۷۸
۹۔ آئینہ اقبال ص ۲۲۸

مہجور کاشمیری اور اقبالؒ

علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن نے کشمیری زبان کے جن شعرائے کرام کو سب سے زیادہ متاثر کیا، ان میں پیرزادہ غلام احمد مہجور سرفہرست ہیں جنہیں کشمیری شاعری کے چوتھے دور کا امام اور نئے دور کا نقیب مانا جاتا ہے۔

مہجور کاشمیری ممتاز و معروف کشمیری شاعر ملا اشرف وائری کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو سترھویں صدی کے آخر میں ہوئے ہیں اور فارسی زبان کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اِس طرح گویا شاعری مہجور کو ورثے میں ملی۔ مہجور، عبدالعلی گھائی عاشق ترالی کے شاگرد تھے جو فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں کے مانے ہوئے شاعر اور اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہجور نے اپنی شاعری میں ماضی کی شاعری کی روایات اور سوقیانہ خیالات سے احتراز کیا اور اپنے فکر و شعر کو عہد حاضر کے تابع بنا کر عظمت انسان اور وطن کے گیت گائے اور بقول تابش صدیقی:

> "کشمیری شاعری کا چوتھا دور "جدید دور" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اُس دور کا سب سے بڑا شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور ہے۔ اُس دور میں شعرا نے خاص کر غلام احمد مہجور نے نئے نئے موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے حب الوطنی کے موضوعات کو کشمیری شاعری میں داخل کیا۔ وطن کی مظلومیت پر آنسو بہائے۔ وطن کے پہاڑوں، ندیوں، چشموں، مرغزاروں کے گیت گائے اور اُن کے حسن کا ذکر کر کے اہل وطن کو وطن سے محبت کرنے کی تلقین کی۔"[1]

مہجور کاشمیری کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اندازِ سخن سے کشمیری شاعری کو یاسیت اور قنوطیت کی آبِ جو سے نکال کر اُمید اور روشنی کا محیط بیکراں بنا دیا۔ کشمیری شاعری میں یاسیت و قنوطیت کی سب سے بڑی وجہ صدیوں پر پھیلی ہوئی غلامی و محکومی تھی جس نے اہلِ کشمیر کی صلاحیتوں اور خوبیوں کو منجمد اور ساکت بنا کر رکھ دیا تھا۔ مہجور نے اُس عہدِ ستم میں انسانی، سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل و معاملات پر قلم اُٹھایا اور اپنے ہم وطنوں کو آزادی و حریت کے نغمے سنائے اور اُن کے مردہ دلوں میں زندگی اور توانائی پیدا کی۔

مہجور نے نہ صرف شعر و سخن میں ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی بلکہ اُس نے پرانی اور فرسودہ قدروں سے منہ موڑا اور خاندانی روایات سے بھی بغاوت کی اور بقول مورخِ کشمیر منشی محمد الدین فوق:

> "سرینگر کے پیرزادگان میں نئی کدل کے پیرزادہ منشی غلام احمد مہجور پیری مریدی کا سلسلہ ترک کر کے ایک عرصہ سے محکمہ بندوبست میں نامور پٹواری کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ نہایت علم دوست اور ذی علم ہیں۔ فارسی شاعری کے علاوہ اردو شاعری میں بھی بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔" (۲)

پیرزادہ غلام احمد مہجور کاشمیری ۱۸۸۸ء میں تحصیل پلوامہ کے گاؤں تری گام میں پیدا ہوئے اور یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کا مسکن بھی اِسی تحصیل کا گاؤں لاجر ہے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم والدہ محترمہ کی زیرِ نگرانی حاصل کی جو نہایت دردمند دل رکھنے والی خاتون اور بہترین خوشنویس بھی تھیں۔ آپ کے والد محترم کا نام پیر اسد اللہ شاہ تھا جو اپنے حلقے میں، اپنی بزرگی اور پرہیزگاری کی وجہ سے بہت ممتاز تھے مگر غلام احمد مہجور نے پیری مریدی کا شغل اختیار نہ کیا بلکہ ذریعہ معاش کے لئے ملازمت اختیار کر لی۔ حالانکہ وہ ملازمت آپ کے منصب اور علم و فضل کے سامنے ہیچ تھی لیکن آپ کی خوددار اور غیرتمند طبیعت نے نہ تو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا اور نہ ہی ایسی کمائی پر تکیہ کیا جس میں اُن کا خون پسینہ شامل نہ ہو۔

آپ نے اپنے شاعرانہ کمالات سے اپنے ہم عصروں کو بے حد متاثر کیا جن میں عبدالاحد ذار آزاد قابلِ ذکر ہیں جنھیں کشمیری شاعری میں "شاعرِ انسانیت" کے نام سے یاد

کیا جاتا ہے۔ مہجور کاشمیری اہل قلم ہی نہ تھے بلکہ اہل علم بھی تھے ــــ آپ کو علم جدید، سیاسیات اور اقتصادیات سے واقفیت تھی۔ سیاسی، تاریخی ادراک بھی رکھتے تھے۔ اِس ضمن میں منشی محمد الدین فوق "تاریخ اقوام کشمیر" میں لکھتے ہیں:

"ذوقِ سخن کے علاوہ فن تاریخ سے بھی آپ کو بے حد دلچسپی ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "حیاتِ رحیم" چھپ چکی ہے۔ ایک کتاب آپ نے پٹواریوں کے متعلق "پٹواری" کے نام سے لکھی ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے لیکن اُن سب سے فائق تر اور مفید تر کتاب جو آپ نے ترتیب دی ہے وہ شعرائے کشمیر کا تذکرہ ہے جس کی دو تین جلدیں راقم مؤلف کی نظر سے بھی گزر چکی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ آپ کے پاس پرانی قلمی کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔ اِنہی قدیم کتب اور اِسی تذکرہ کے سلسلہ میں ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر سر اقبال ایم اے پی ایچ ڈی، بیرسٹرایٹ لاء (لاہور) اور نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی (حیدر آباد دکن) سے بھی آپ کی خط وکتابت رہی ہے۔ بلکہ علامہ سر اقبال نے آپ کو ایک مرتبہ لاہور بلوایا بھی تھا لیکن آپ بوجہ عدیم الفرصتی آ نہ سکے تھے۔" (۳۰)

علامہ اقبال، پیرزادہ غلام احمد مہجور کی شخصیت سے واقف تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ علامہ سر اقبال کی شاعری اور پیام نے ہی مہجور کی زندگی اور شاعری میں انقلاب پیدا کیا جس نے اپنے فکر و فن سے کشمیریوں کو ایک نیا راستہ دکھایا اور تحریک آزادی میں جوش و ولولہ پیدا کیا۔ مہجور کاشمیری کو علامہ اقبال سے متعارف کرانے کا شرف چوہدری خوشی محمد ناظر کو حاصل ہے جو علامہ اقبال کے دیرینہ رفیق اور حکومت جموں و کشمیر کے مشیر مال تھے۔ چنانچہ جموں و کشمیر میں ۱۹۰۲ء کے بعد جن شعری و ادبی محفلوں کا آغاز ہوا اُن میں علامہ اقبال کے دو پرانے ساتھی منشی سراج الدین احمد میر منشی کشمیر ریذیڈنسی اور چوہدری خوشی محمد ناظر پیش پیش تھے۔ اُن علمی و ادبی محفلوں نے کشمیری عوام کی بیداری میں اہم کردار سرانجام دیا اور نوجوان کشمیری اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن نوجوانوں میں غلام احمد مہجور بھی تھے۔ مہجور پیری مریدی کا دھندا نہیں کرنا چاہتے تھے، محکمہ

مال میں ملازم ہو گئے۔ اِس سے پیشتر وہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے گھوم آئے تھے۔ اِس غریب الدیاری میں اُن کی ملاقات علامہ شبلی نعمانی سے ہوئی تھی جنھوں نے اُن کے تخلص مہجور کی وجہ پوچھی تھی تو آپ نے کہا تھا:

"مہجور وہ ہوتا ہے جس سے کوئی دور ہو یا وہ کسی سے دور ہو۔"

شبلی نے پوچھا: "تم کس سے دور ہو؟"

مہجور نے کہا: "اپنے محبوب (کشمیر) سے۔"

مہجور وطن واپس آئے تو ملازم ہو گئے۔ اُن کے انقلابی خیالات کی وجہ سے جب حکومت کی طرف سے اُن پر کوئی افتاد آ پڑتی تو چوہدری خوشی محمد ناظر اُن کی امداد کرتے اور وہ اِس شاعر کو حکومتی دباؤ سے آزاد کرا دیتے۔

مہجور کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کے فکر و شعر سے بے حد متاثر و مستفیض ہوئے اور بقول ڈاکٹر محمد صابر آفاقی:

"مہجور علامہ کے فن اور شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کے سیاسی افکار اور انقلابی نظریات سے بھی بیحد متاثر تھے اور اُنھی کے نقش قدم پر چل کر کشمیری قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔"[۴۰]

اِس سلسلہ میں علامہ اقبال اور مہجور کے مابین مراسلت کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ مہجور کے نام علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل دو خط ملتے ہیں:

"مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اُس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں، مگر افسوس کسی نے ادھر توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔ افسوس ہے کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اِس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپرواہی اور نیز مسلمانان کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادی کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش و حفاظت کے لئے ایک سوسائٹی بنائیں؟ ہاں "تذکرہ شعرائے کشمیر" لکھتے وقت مولانا شبلی کی "شعر العجم" آپ کے پیش نظر رہنی چاہیے۔ محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہیں ہو گا۔ کلام کی

چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بار آور ثابت ہوگی اور اگر کبھی خود کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اُس کا شامل ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔ امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ میرے پاس کوئی مسالہ تذکرہ شعرا کے لئے نہیں ہے ورنہ آپ کی خدمت میں ارسال کرتا۔ (۵)

یہ خط ۱۹۲۲ء کا تحریر کردہ ہے اِس سے پیشتر جون ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال خود کشمیر گئے تھے اور اُن سے مہجور بھی ملے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے مہجور کو "بزمِ ادیبانِ کشمیر" بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مہجور کشمیری زبان کے شعرا کرام کی ایک مجلس بنا ئیں اور اُنہیں زندگی اور زندگی آموز مسائل و معاملات پر لکھنے کی تحریک کریں۔ چونکہ اہل کشمیر کی اکثریت زبان کو سمجھتی تھی اِس لیے علامہ اقبال نے مہجور کو کشمیری زبان میں اظہارِ خیال کرنے کا مشورہ دیا تاکہ کشمیری زبان کے شاعر و ادیب نئے نئے رجحانات اور خیالات سے واقف ہو کر اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔

۱۹۲۱ء کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اِس سال ماہ جون کے آغاز میں علامہ اقبال کشمیر تشریف لائے تھے۔ وہاں پر اپنی قانونی و عدالتی مصروفیات کے علاوہ اُنہوں نے ادبی و شعری مشق بھی کی اور نشاط باغ میں بیٹھ کر یہ کہا تھا:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر

اِس سفر کے دوران غنی کاشمیری، ساقی نامہ اور کشمیر ایسی معرکتہ الآرا نظمیں لکھیں جو بعد میں پیامِ مشرق میں شائع ہوئیں۔ اُن نظموں کا سب سے زیادہ اثر مہجور نے قبول کیا اور بقول عبدالاحد ڈار آزاد اِسی دور میں مہجور کے دل میں کشمیری زبان میں شعر کہنے کا جذبہ پیدا ہوا اور مہجور نے فکر اقبال کی روشنی میں اشعار کہنے شروع کر دیے جن میں "باغِ نشاط کے گرناز کراں دلو" خاصی مقبول ہوئی اور جو ہر جلسہ کے آغاز میں پڑھی جاتی۔

حضرت رحیم قلندر معنی پوری کے حالات زندگی پر مہجور کی تصنیف "حیات

رحیم" شائع ہوئی تو اِس کا نسخہ حضرت علامہ کی خدمت میں بھی ارسال کیا۔ کتاب کی رسید دیتے ہوئے ۶ اپریل ۱۹۲۳ء کو آپ نے تحریر کیا:

"حیات رحیم کے لئے سپاس گزار ہوں۔ میں نے اِس کتاب کو نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کشمیر اور کشامرہ کے متعلق آپ اپنی تصنیف کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ بالخصوص کشمیر کے شعرا کے تذکرے کی طرف جلد توجہ کیجئے۔" (۶)

کلام اقبال میں جو اہمیت و افادیت "شاہین" کو حاصل ہے اِس سے سبھی آگاہ ہیں۔ علامہ اقبال کے ہاں یہ علامت ایک عظیم کردار کی ہے اور علامہ اقبال نے شاہین کی حفاظت، اِس کی بلند پروازی، درویشی، آزادی سے محبت اور کلاِ آشیاں بندی سے نفرت کا جابجا ذکر کیا ہے۔ یعنی اقبال نے شاہین کے حوالہ سے انسانوں میں جذبہ عمل پیدا کیا۔ اِسی طرح کلام مہجور میں بھی پرندہ، آزادی کی ایک علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ مہجور اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے:

"پہاڑوں کے اُس پار
مجھے زندگی نے آواز دی
مست ہواؤں نے مجھے گیت سنائے
میں والہانہ انداز میں آگے بڑھتا گیا
یکایک ایک پہرہ دار نے
مجھے روک لیا
"تم اِس سرحد کو پار نہیں کر سکتے
پروانہ راہداری دکھاؤ"
میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں
میں اِس زمین کا وارث ہوں
میں دھرتی کا وارث ہوں
مجھے ہواؤں نے زندگی کا پیغام سنایا ہے
مجھے آگے بڑھنے دو

پہرہ دار نے اپنے ایک ساتھی سے کہا:
اُس پاگل سے کہو
دور بیٹھے
ورنہ کال کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے گا
"نہیں نہیں
میں آگے بڑھوں گا
مجھے مت روکو"
چلے جاؤ یہاں سے!
اُس نے غصے سے کہا
میں سوچتا رہ گیا
کیوں؟
اتنے میں ایک خوبصورت پرندہ
اپنے چمکیلے پروں کو
پھڑپھڑاتا ہوا
زور زور سے تالیاں بجاتا
ہمارے سروں پر سے گزر گیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے
سرحد کی اُس پار نگاہوں سے اوجھل ہو گیا"
اب علامہ کا یہ شعر پڑھئے اور سر دُھنیے:

پرواز ہے دونوں کی اِسی تاریک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں وطن سے محبت کا جو معیار قائم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ اِن کے پیشرو نہ کہہ سکتے تھے۔ اقبال کا جذبہ وطنیت اُن کے حریت انسانی ہی کا ایک حصہ رہا ہے البتہ اُنھوں نے وطنیت کی وہاں مخالفت کی ہے جہاں وطنیت کا نظریہ اجتماعیہ انسانیہ کے تصور سے متصادم ہوتا ہے۔ مہجور نے اقبال کے اس طرز فکر کو اپنایا۔

جس طرح اقبال وطن سے دوری یا غریب الدیاری پر نوحہ خواں رہے اُسی طرح مہجور بھی وطن کی غربت اور محکومی پر تڑپتا رہا اور جیسا کہ خود اُس کے تخلص سے عیاں ہے۔

مہجور ایک باغیرت اور حساس انسان تھا۔ اُس نے اپنے آباؤ اجداد کی روش "خانقاہ پرستی" پر چلنے سے انکار کر دیا۔ اُس کے سامنے افکار اقبال ایک مشعل کی طرح روشن تھے اور وہ یہ جان گیا تھا کہ

ع مسلمان جا کے لٹتے ہیں سوادِ خانقاہی میں

یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ مہجور جو پیری کا دھندا چھوڑ کر ملازمت میں آیا تھا' اُسے بعد میں ایسے کام سے واسطہ پڑا جو پہلے سے بھی زیادہ دردناک تھا۔ ایک پٹواری کی حیثیت سے اُس نے کاشت کاروں' مزدوروں اور مزارعوں کو زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں لٹتے دیکھا۔ اُس نے سرسبز کھیتوں میں بھوک اُگتی ہوئی دیکھی۔ چنانچہ اُس نے اِس نظام کے خلاف بھی بغاوت کر دی اور اپنے قلم کو مزدوروں اور کسانوں کے لئے وقف کر دیا جس پر حکومتِ کشمیر نے اُسے لداخ کے دور افتادہ علاقہ میں تبدیل کر دیا کیونکہ اُس نے اپنے مرشد کے اِس شعر

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

کی تقلید میں کشمیری زبان میں ایسے ہی پر جوش شعر کہتے تھے جو حکومت وقت کے لیے ایک خطرہ سے کم نہ تھے۔ علامہ اقبال مرشد کامل کی طرح اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ مہجور ہر لحظہ اپنے مرشد سے رہنمائی حاصل کرتا رہا اور اُن کے افکار و اشعار کو کشمیری زبان کے سانچے میں ڈھالتا رہا۔ جب علامہ اقبال کی نظم "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" چھپی تو مہجور نے بھی اِس کی تقلید کی اور "خطاب بہ مسلم کشمیر" کے عنوان سے ایک دردناک نظم لکھی جو ۶ جون ۱۹۲۴ء کے اخبار کشمیر میں شائع ہوئی۔

اِس کے چند اشعار یہ ہیں:

بتا اے مسلم کشمیر کبھی سوچا بھی ہے تو نے
تو ہے کس گلشن رنگین کا برگ شاخ عریانی

شکستہ حالی بغداد پہ تھا نوحہ خواں سعدی
ہے اندلس کے لئے اقبال محو مرثیہ خوانی
مگر صد حیف اجزا گلشن اسلام کشمیر میں
کوئی کرتا نہیں جز آب شبنم اشک افشانی

مہجور نے صرف آزادی و حریت اور وطن سے محبت کا درس ہی اقبال سے نہ سیکھا بلکہ اقبال نے جس جس موضوع پر لکھا، مہجور نے بھی کشمیری زبان میں اس کی ترجمانی کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ مہجور علامہ اقبال کے کلام و پیام کے کشمیری زبان میں ترجمان ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے احترام نسواں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اعلیٰ انسانی اقدار اور عظمت انسانی کا مظہر ہے۔ اقبال نے عورت کے وجود کو عظیم، جلیل اور جمیل قرار دیا ہے اور یہاں تک کہا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اور پھر اقبال نے ماں کی عظمت و بلندی بیان کی ہے۔ وہ اسلامی تعلیم و شعار کی آئینہ دار ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ مہجور نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے:

اولیانہ دیوتا میئے کن آئے

ترجمہ: میں نے اس دنیا کو رونق بخشی اور اولیا اور دیوتا میرے ہی بطن سے جنم لیتے ہیں۔"

اقبال کے ہاں اقوام مشرق کو بیدار کرنے کا درس بدرجہ اتم ملتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں یہ شرف صرف علامہ اقبال ہی کو حاصل ہے کہ جنہوں نے اپنے فکر و شعر کو صرف اپنی ہی قوم یا خطہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُن کا کلام آفاقی اور عالمگیر ہے۔ مہجور کی شاعری کا مرکز و محور اُس کی قوم و وطن ہے اور وہ اپنے کشمیری بھائیوں کو آزادی اور حریت کا پیام دیتا ہے اور خواہاں ہے کہ کشمیری نہ صرف بیدار ہوں بلکہ یہ اقوام مشرق کی رہبری و رہنمائی بھی کریں۔ وہ پیش گوئی کرتا ہے:

سحر ہے، باغ ہے، مستی بھرا دل ہے، جوانی ہے
کون سے درد کی طالب مری شعلہ بیانی ہے

یہ بے برگ و نوا شاخیں یہ بے صورت و صدا چشمے
دلیل ابر گوہر بار میری نغمہ خوانی ہے
سرورِ زندگی میں بیخودی درجۂ خرابی ہے
خودی ہے ریزہ ریزہ یہ حصارِ بدگمانی ہے
یہی کشمیر مشرق کو بہارِ بے خزاں دے گا
مرا پیغام شرحِ سوز و سازِ زندگانی ہے

مہجور جب تک زندہ رہا حریت و آزادی کے گیت گاتا رہا اور حقیقت یہی ہے کہ کشمیر میں جتنی مقبولیت اور عزت مہجور کو حاصل ہے اتنی کسی اور کشمیری شاعر کو حاصل نہ ہو سکی۔ مہجور ایک باعمل انسان تھا۔ اُس نے وطن کی آزادی کے لئے گیت بھی کہے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ کلامِ مہجور اور پیامِ مہجور چھپ چکے ہیں۔ کئی کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں انتقال کر گئے۔ مہجور نے حضرت علامہ اقبال کی وفات حسرت آیات پر یہ تاریخ کہی تھی:

آہ اقبال آفتابِ آسمانِ شاعری
۱۹۳۸ء

اور کسی حد تک کشمیر کے حوالے سے یہ بات ہم مہجور کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔

حواشی

۱۔ زرگی: ص ۱۳
۲۔ تاریخ اقوام کشمیر ص ۳۰۹
۳۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد اول ص ۳۰۷
۴۔ اقبال اور کشمیر: ص ۷۰
۵۔ کلیات مکاتیب اقبال ۲: ۳۳۷۔۳۴۰
۶۔ کلیات مکاتیب اقبال ۲: ۳۴۱

علامہ محمد اقبالؒ اور چودھری خوشی محمد ناظر

علامہ محمد اقبال اور چودھری خوشی محمد ناظر ہم عصر اور ہم جلیس تھے۔ دونوں فکری و نظری اعتبار سے سر سید احمد خاں اور مولانا الطاف حسین حالی کے پرستار اور معتقد تھے۔ دونوں پنجاب کی "چار یاری" میں شامل تھے اور بقول مولانا عبدالمجید سالک:

"چودھری خوشی محمد ناظر کی خدمت میں مجھے صرف ایک دو دفعہ حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور وہ ملاقاتیں بھی بے حد مختصر تھیں۔ لیکن وہ پنجاب میں شاعری کی اِس "چار یاری" کے ایک رکن تھے جس کے باقی ارکان — اقبال، نیرنگ اور اعجاز، تسلیم کئے جاتے تھے۔ اُن چاروں نے "مخزن" میں مجلس شعرا کو آراستہ کیا — چاروں اللہ کے حضور حاضر ہو چکے —"(۱)

علامہ محمد اقبال اور چودھری خوشی محمد ناظر ابتدا ہی سے لاہور کی اُن ادبی مجلسوں میں شریک ہوئے تھے جو اول اول بازار حکیماں میں حکیم شہباز الدین کے مکان پر جمتی تھیں اور جن میں خان احمد حسین خان اور نواب محبوب سبحانی (خلف شیخ امام الدین گورنر کشمیر) بھی حصہ لیتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک اپنی کتاب " — ذکر اقبال۔" میں خان احمد حسین خان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

" (علامہ) اقبال جو کچھ بھی پڑھتے تھے اُس میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دیتے تھے۔ اِس سے پیشتر مشاعروں اور جلسوں میں نظمیں گا کر پڑھنے کا دستور نہ تھا۔ اقبال کو اِس معاملے میں اولیت حاصل ہے۔ اِس کے بعد ترنم

بالکل متعدی ہو گیا اور شعرائے کرام گا کر کلام سنانے لگے —— یہاں تک کہ عبدالمجید وکیل (لاہور) اور چودھری خوشی محمد ناظر (کشمیر) بھی آواز واجبی ہونے کے باوجود گا کر پڑھتے تھے۔" (۲)

اس سلسلہ میں "کشمیر میں اُردو" کے مصنف حبیب کیفی لکھتے ہیں۔

"ناظر جلسوں میں شرکت کے باوجود اپنی نظمیں خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ نظموں کو ترنم سے پڑھنے کے لیے ایک خوش الحان نغمہ خواں کو ملازم رکھا ہوا تھا۔" (۳)

اِنہی ابتدائی مجلسوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اپنی کتاب "اقبال کی صحبت میں" میں لکھتے ہیں:

"دہلی دروازے سے جو تنگ سی سڑک اکبری منڈی کی طرف جاتی ہے۔ اُس کے کونے پر "یادگار آفس" کے نام سے اُن (منشی دین محمد) کا ایک دفتر ہوتا تھا جہاں ہر اتوار کو آٹھ نو بجے کے قریب شعراء کی محفل گرم ہوتی تھی اور شہر کے چیدہ چیدہ شعرا اور اہل ذوق حضرات یہاں جمع ہوتے تھے۔ راقم نے بھی اکثر اُن محفلوں میں شرکت کی ہے اور علامہ اقبال کو بھی یہاں دیکھا ہے۔ دیگر شعراء کے علاوہ خواجہ دل محمد صاحب اور ناظر صاحب جوگی بطور خاص اِن مجالس میں اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔" (۴)

"دانائے راز" میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

"ناظر سے محمد اقبال کی ملاقات کب ہوئی یہ معلوم نہیں، لیکن ناظر کا شمار بہت جلد اِس حلقے میں ہونے لگا جو مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور میر ناظر اور پھر آگے چل کر مخزن کی بدولت لاہور میں قائم ہوا جس میں آزاد اور حالی کی کوششوں کا بھی دخل ہے۔ جیسے بازار حکیماں کی محفلوں، انجمن حمایت اسلام کے جلسوں اور آگے چل کر مخزن کو بھی۔ ناظر کا کلام مخزن میں چھپتا —— جب میاں شاہ دین ہمایوں سے بھی اُن کے تعلقات تھے۔ چنانچہ میاں صاحب کی ایک نظم [illegible] ۱۹۰۱ء میں مخزن میں شائع ہوئی [illegible] ہوتا ہے کہ محمد اقبال کی شاید اُن سے پہلے ناظر سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اُن

سے ادبی روابط قائم تھے۔ میاں محمد شاہ دین ہمایوں صاحب کہتے ہیں:

اعجاز ! دیکھ تو سہی یہ کیا سماں ہے آج
نیرنگ ! آسماں و زمیں کا نیا ہے آج
اقبال ! تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
ناظر کمانِ فکر سے مار ایک دو فرنگ (۵)

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ محمد اقبال اور چوہدری خوشی محمد ناظر کا تعلق ابتدائے عمر ہی سے تھا اور دونوں میں خاصا خلوص اور لگاؤ تھا اور جیسا کہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا ہے کہ "ابتدائی دور کے "ہم ادب" ساتھی سر عبدالقادر اور میر غلام بھیک نیرنگ اور میر اعجاز حسین تھے۔ بعد میں خوشی محمد ناظر اور منشی سراج الدین کشمیر والے بے تکلف ادبی دوست تھے۔" (۶)

علامہ محمد اقبال سیالکوٹ کے مشن کالج (اب مرے کالج) سے ایف اے کا امتحان پاس کر کے ستمبر ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے اور اُسی زمانے میں اُن کے غلام بھیک نیرنگ سے تعلقات استوار ہوئے اور یہی وہ زمانہ ہے جب حکیم امین الدین کے مکان پر مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی غزل پہلی مرتبہ اِس مشاعرہ میں پڑھی جس کا مشہور شعر ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک علامہ اقبال اُن مجلسوں میں ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں اپنی نظم "ہمالہ" بھی پڑھ چکے تھے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ۱۸۹۶ء میں یعنی اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی کشمیری برادری کی تنظیم "مجلس کشمیری مسلمانان لاہور" کے رُکن بن گئے تھے۔ جہاں تک چودھری خوشی محمد ناظر کا تعلق تھا، وہ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں [illegible] سے بی۔ اے کیا فارسی اور انگریزی میں آنرز کا امتیاز حاصل کیا۔ ایک طلائی تمغہ اور میڈل الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے تمام مسلمان طلبہ میں اول رہنے پر ملا اور طلائی کالج کی طرف سے فرسٹ ڈویژن آنے اور کالج میں اول آنے پر دیا۔

علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد چودھری خوشی محمد ناظر دو سال تک نواب محروث کے اتالیق رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال کے ساتھ اُن کا نام بھی لاہور کے ادبی مجالس میں آنے لگا —— اِس کے بعد ۱۹۰۱ء میں آپ ریاست جموں کشمیر سے وابستہ ہو گئے —— اور شیخ غلام احمد وزیر مال کے پرسنل اسسٹنٹ رہے۔ شیخ غلام احمد خان بھی انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ اٹھارہویں سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۷-۲۸ فروری اور یکم مارچ ۱۹۰۳ء کی صدارت آپ نے ہی کی تھی جس میں علامہ محمد اقبال نے "فریادِ اُمت" کے عنوان سے نظم پڑھی تھی۔ اُن جلسوں میں چوہدری خوشی محمد ناظر بھی شریک ہوتے تھے۔

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان چلے گئے اور ۱۹۰۸ء تک بیرون ملک قیام پذیر رہے۔ یعنی وہ زمانہ علامہ محمد اقبال کی شاعری کا دوسرا دور کہلاتا ہے۔ اُن کے لندن روانہ ہونے سے قبل چودھری خوشی محمد ناظر حکومت جموں کشمیر سے وابستہ ہو چکے تھے اور یہ وابستگی ۱۹۲۳ء تک بہ سلسلہ ملازمت قائم رہی۔ کشمیر سے چلے آنے کے بعد بھی اُن کے روابط ریاست سے قائم رہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا تھا۔ آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر (۱۹۴۶ء - ۱۹۴۸ء) اور کشمیر اسمبلی میں مسلم کانفرنس پارٹی کے لیڈر چودھری حمیداللہ خان مرحوم اِن کے فرزند ارجمند تھے۔ آزاد کشمیر کی ایک سابق حکومت کے وزیر مہاجرین مشاہد حمید، چودھری حمیداللہ خان کے بیٹے تھے —— کشمیر چلے جانے کے بعد بھی چودھری خوشی محمد ناظر کا تعلق علامہ محمد اقبال سے بدستور قائم رہا —— یہ وہ دور تھا جب سرینگر میں بقول ناظر ——

"تیسرا دور کشمیر جنت نظیر کے قیام سے شروع ہوا اور میری بعض شگفتہ اور معقول نظمیں اِسی دور کی پیداوار ہیں۔ اُس زمانے میں ہم نے چند ادب دوست احباب کی ایک لمیٹڈ کمپنی یا انجمن بنا رکھی تھی جس کا نام انجمن "مفرح القلوب" تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک یہ انجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نعمت بکھیرتی رہی —— "انجمن مفرح القلوب" کے روحِ رواں خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی کشمیر ریذیڈنسی تھے۔ اُس میں چودھری خوشی محمد ناظر، صادق علی اور نور الدین ممبر شامل تھے اور بیرونِ کشمیر سے جو

افراد اُس میں شامل ہوتے تھے اُن میں جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں، سر محمد شفیع، سر شیخ عبدالقادر، پروفیسر اکبر منیر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں جب علامہ محمد اقبال سرینگر تشریف لے گئے تو اُنھوں نے اِس انجمن کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں نے اپنی نظم شالامار باغ کشمیر کے مقطع میں، ناظر، علامہ اقبال اور عبدالقادر شیخ کا یوں ذکر کیا ہے ۔

ناظر بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو

چوہدری خوشی محمد ناظر کے مجموعہ کلام "نغمہ فردوس" میں ایک مثنوی "ہیر رانجھا" ہے۔ یہ طویل نظم انجمن ارباب ذوق لائل پور (اب فیصل آباد) کی تحریک سے لکھی گئی اور ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ ناظر نے اِس مثنوی کی ابتداء یوں کی ہے۔

دیکھ کر رسم و راہ دورِ زمن
عاشقوں نے اک بنائی انجمن
صدر مجلس حضرت اقبال تھے
جو غم الفت سے مالا مال تھے
سرگروہ حلقہ اصرار عشق
منکشف جن پر ہوئے اسرار عشق
عشق کا حضرت نے احیا کر دیا
عشق کے کشتوں کو زندہ کر دیا
کشتگانِ خنجر و تسلیم کی
تازہ ہو جاتی ہے ہر دم زندگی

یہ مثنوی بڑی دلچسپ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جھنگ سے آ کر رانجھا بھی شریک مجلس ہوتا ہے اور صدر مجلس سے کہتا ہے۔

صدرِ مجلس سے کہا اصرار سے
بندہ پرور مجھ کو رخصت کیجئے

اِس پر صدرِ مجلس نے فرمایا

ہنس کے فرمایا یہ سر اقبال نے
صدرِ بزم اہل حال و قال نے
کس لئے رانجھا میاں دلگیر ہے؟
کیا خیال ہیر دامن گیر ہے؟

لیکن رانجھا کہتا ہے کہ ہیر خیال نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور اس کی زندگی اُسی سے وابستہ ہے۔

عرض کی رانجھے نے اے سلطان عشق
ہیر سے رانجھے کا ہے پیمانِ عشق
میں خیال ہیر کیوں کر چھوڑ دوں
کس طرح پیمانِ ازل کا توڑ دوں
ہیر قسمت ہے، میری تقدیر ہے
وہ جبین عشق کی تحریر ہے

"دانائے راز" ہی میں سید نذیر نیازی اقبال و ناظر کے تعلقات کے حوالہ سے لکھتے ہیں: "تنقید ہمدرد" میں جب ایک صاحب نے محمد اقبال کے کلام پر زبان اور محاورے کی رُو سے کچھ اعتراضات کئے تو اُن کے ساتھ ساتھ ناظر کو بھی اپنی زد میں لے آئے۔ سید ممتاز علی اور میر نیرنگ نے "تنقید" کا جواب لکھا — میر نیرنگ ابنالوی کے نام سے مضامین لکھتے — محمد اقبال نے بھی "تنقید ہمدرد" میں اس طرف اشارہ کیا ہے — ناظر ملازمت سے سبکدوش ہو کر چک جھمرہ میں سکونت پذیر ہوئے — انتقال اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ (۷)

علامہ محمد اقبال جب تک زندہ رہے اُن کا چودھری خوشی محمد ناظر سے رابطہ رہا۔ علامہ محمد اقبال کا انتقال ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا جبکہ چودھری خوشی محمد ناظر نے اکتوبر ۱۹۴۴ء میں وفات پائی اور اُن کی تدفین سرینگر میں ہوئی۔ وہ جھیل ڈل کے کنارے رہتے تھے۔ یہ علاقہ وادیٔ کشمیر کے خوبصورت ترین نظاروں سے بھرا پڑا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ "تنقید ہمدرد" نے علامہ اقبال اور ناظر کے کلام پر اعتراضات کئے تھے۔ علامہ اقبال نے جواب میں — اردو زبان پنجاب میں" کے عنوان

سے ایک دندان شکن مضمون لکھا اور ناظر کے کلام پر تنقید کو نہایت مدلل انداز سے رد کر دیا — یہ مضمون "مخزن" کے اکتوبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اِس میں علامہ اقبال نے لکھا:

"مجھے اساتذہ کی برابری کا دعویٰ نہیں۔ اگر اہل پنجاب مجھے یا حضرت ناظر کو — باہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے جہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے —" اور آخر میں لکھا، راقم مشہدی نے میرے دل کی بات مکمل کی ہے

نسیم من در شما بلبلاں اما بہ ایں شادوم
کہ من ہم در گلستاں قفس مشت پرے دارم

علامہ اقبال اور چودھری خوشی محمد ناظر میں خط و کتابت بھی رہی۔ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ مولانا غلام قادر گرامی کے ایک دوست صفدر علی شاہ کا کوئی کام تھا، اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے چودھری خوشی محمد ناظر کو خط لکھا۔

علامہ اقبال گرامی کو لکھتے ہیں:

"کشمیر میں چودھری خوشی محمد کو لکھا تھا۔ وہاں سے بھی مایوس ہوئی۔ یہ خط چودھری صاحب کا ہے۔ شاہ صاحب کو دے دیجئے۔" (۸)

علامہ محمد اقبال نے اُسی کام کے لئے نواب سر ذوالفقار علی خان کو بھی کہا تھا مگر وہ کام نہ ہو سکا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ سید صفدر علی شاہ صاحب کا کام نہ ہو سکا مگر نواب صاحب نے تو اپنا فرض پوری طرح ادا کیا، اُن سے کوئی شکایت نہیں۔" (۹)

جب علامہ محمد اقبال اِس جہاں رنگ و بو کو چھوڑ گئے تو اِس عظیم سانحہ پر چودھری خوشی محمد ناظر نے ہفت روزہ "حمایت اسلام" لاہور کے ۲۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء کے شمارہ "اقبال نمبر" میں ایک مرثیہ لکھا

الوداع اقبال اے محبوب دوراں الوداع
الوداع اے قوم کے نجم درخشاں الوداع

الوداع اے بلبل خوش خوان گلزارِ وطن
الوداع اے باغِ ملت کے غزل خواں الوداع
اے ریاضِ خلد کے مرغ خوش الحاں الوداع
درس گاہ عشق کے تلمیذ رحماں الوداع
الوداع اے غمگسار خاکساراں الوداع
الوداع اے روز دارِ چرخ گرداں الوداع
الوداع اے محفل توحید کے چشم و چراغ
الوداع اسلام کے خورشید رخشاں الوداع
الوداع اے ساربانِ ناقۂ بیت الحرم
اے حجازی کاروانوں کے حدی خواں الوداع
الوداع اے شمع ناقوسِ شبستانِ وجود
الوداع اے جان پاک اے جسم بے جاں الوداع
آج نعش اقبال کی مسلم کے زیب دوش ہے
بزمِ ملت کی یہ شمع آخری خاموش ہے

ماتم اقبال میں ہم اس قدر رویا کریں
سال و ماہ و روز و شب و صبح و مسا رویا کریں
اپنے، بیگانے کے دل پر ہے تیری فرقت کا داغ
آشنا رویا کریں، نا آشنا رویا کریں
بلبلیں صحن چمن میں مرثیہ خوانی کریں
غنچہ و گل شبنم و بادِ صبا رویا کریں
یاد میں تیری نوائے روح پرور کی مدام
ہم سخن رویا کریں اور ہم نوا رویا کریں
مسجدوں میں متقی پڑھتے رہیں تجھ پر درود
خانقہ میں صوفیائے باصفا رویا کریں

تیرے میخانے میں وہ جام و صبو باقی نہیں
تجھ کو مستانے تیرے اے ساقیا رویا کریں
گنج مسجد میں شہید قوم کی ہے خواب گاہ
سب نمازی اس پہ پڑھ کر فاتحہ رویا کریں
مصر و کنعاں آج جس کے غم میں نیلی پوش ہے
یوسف ملت کو اہل قافلہ رویا کریں
وہ کرشمہ روح پرور وہ ادائیں دل نواز
تیری کس کس بات پہ اے دل ربا رویا کریں
صبح نو کی تیری شام زندگی، تمہید ہے
وہ تیری جاوید منزل زندۂ جاوید ہے
سوز دل سے نبض جو مسلم کی تڑپاتا رہا
ہائے وہ اسلام کا قلب تپاں جاتا رہا
قلعہ کوہ ہمالہ سے پیامِ زندگی
مصر و شام و روم و ایراں تک وہ پہنچاتا رہا
دل سے جو اقبال کے اٹھی صدائے دردناک
کاشغر سے باختر تک اس کو دہراتا رہا
فطرت بے تاب سے اپنی شرار آرزو
عرصہ عالم کو مظلوموں سے سلگاتا رہا
سینہ سوزاں میں مخفی تھے جو شعلے طور کے
ان سے شرق و غرب کی دنیا کو چمکاتا رہا
اس کی تھی ہر شاخ میں پنہاں شمیم زندگی
جس سے وہ معمورۂ ہستی کو مہکاتا رہا
وہ سرورِ زندگانی بخش اسرار و رموز
وہ خودی کی راگنی ہر رنگ میں گاتا رہا
پھونک دی مفلوج جسم قوم میں روح عمل

شاہبازی کبک کہساری کو سکھلاتا رہا
وہ فقیر خانقہ مست مے عرفاں رہا
عشرت میری کے میخانوں کو ٹھکراتا رہا
تھا کبھی محو تماشا سیر میں افلاک کی
عرش اعظم کے بھی پردوں کو سرکاتا رہا
مرتبہ انسان خاکی کا کیا اتنا بلند
عالم لاہوت سے ناسوت ٹکراتا رہا
برتر از ادراک اہل بزم یہ مست الست
کنج خلوت میں سرور سرمدی گاتا رہا

زندگی اقبال کی ہے جاودانی زندگی
کشتگان عشق کی ہے غیر فانی زندگی

زندگی اس کی ہے اب عرش آشیانی زندگی
خلد منزل زندگی جنت مکانی زندگی
زندگی اس کی مسلسل ہے ازل سے تا ابد
وہ تھی فانی زندگی جاودانی زندگی
برتر از قید مکاں ہے برتر از قید زماں
عالم لاہوت کی یہ لامکانی زندگی
کس قدر ہنگامہ آرا قرن حاضر میں رہی
یہ اویس عصر کی صاحب قرانی زندگی

اس سرود ساربان سے کس قدر سرمست ہے
کارواں قوم کی یہ کاروانی زندگی
زندگانی اس کی تھی پیہم رواں پیہم دواں
بانچوں کی سیر، دریا کی روانی زندگی

داستانِ آسمان و ماورائے آسمان
مہر و ماہ و بزمِ انجم کی کہانی زندگی
تھی نویدِ شادمانی زندگی اقبال کی
شعرِ مشرق میں رہی نم کی کہانی زندگی
ہائے وہ حسن آشنا، فطرت کی تحمیلِ جمیل
ہائے وہ عشق آفریں، جاں جہانی زندگی
ناظرِ مہجور کی ہے تربتِ اقبال پر
دیدۂ خونابہ سے گوہر فشانی زندگی
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا (۱۰)

چودھری خوشی محمد ناظر نے نہ صرف کہ مندرجہ بالا مرثیہ لکھا بلکہ قطعہ تاریخ بھی کہا۔ یہ دونوں نادر ہیں اور چودھری خوشی محمد ناظر کی "نغمہ فردوس" میں شامل نہیں یہ قطعہ تاریخ وفات "محب کسان گجرات" میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا:

وائے قسمت چل بسا علامہ حکمت پناہ
افتخارِ خاوران و نازشِ شہر و دیار
وہ علومِ عقلی و نقلی کا بحرِ بیکراں
وہ فنونِ شرقی و غربی کا دریا بے کنار
وہ معلم تھا خودی کا، حریت کا پاسباں
اور ایمان و یقیں کا ایک مستحکم حصار
خود نگر، خود گر، خود آموز، خود آگہ، خود شناس
اور تخیل عرش پیما اس کا تھا یزداں شکار
شاعری میں اس کی تھا اک پرتو پیغمبری
عقل کا آموزگار اور عشق کا پروردگار
کر رہا تھا قوم کے زخموں کی جو بخیہ گری
جامۂ ہستی کیا اس کا اجل نے تار تار

مصرعِ تاریخ مجھ پہ غیب سے نازل ہوا
سالِ رحلت کا ہوا ہاتف سے جب میں خواستگار
آہ کا نکلا الف ناظر زبانِ خامہ سے
مسجد شاہی بنی اقبالِ ملت کا مزار

۱۳۵۷ھ ۱۳۵۸ھ

۱۹۳۸ء

غرضیکہ اقبال و ناظر — دو ایسے وجود تھے جن کی روحیں ملت اسلامیہ کے لئے تڑپتی رہیں — اُن کی کتاب "نغمہ فردوس" گو دوبارہ شائع ہوئی ہے مگر اس میں اقتباس والی نظم اور قطعہ تاریخ درج نہیں۔ یہ اس مجموعہ میں شامل ہونی چاہئے — "جوگی" کے عظیم شاعر اور علامہ اقبال کے ہم جلیس کا کلام نئی نسل کے لئے پھر سے سامنے آ جائے جو اُن کی رہنمائی کا موجب بن سکتا ہے کیونکہ ناظر کی یہ بات عہد حاضر کی سیاسی اور معاشرتی حالت پہ پوری طرح صادق آتی ہے کہ

ناظر یہیں تم بھی آ بیٹھو اور بن میں دھونی رما بیٹھو
شہروں میں گرو پھر چیلوں کو کوئی ناچ نچانے والے ہیں

حواشی

۱۔ سرگذشت صفحہ ۵۰۳
۲۔ ذکر اقبال صفحہ ۲۷
۳۔ کشمیر میں اردو ص۔ ۵۳۲
۴۔ اقبال کی صحبت میں۔ ص ۴۳۹
۵۔ اقبال کا فکر و فن صفحہ ۱۱۸
۶۔ دانائے راز صفحہ ۱۹۷
۷۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص۔ ۲۰۳
۸۔ ایضاً
۹۔ ہفت روزہ حمایت اسلام ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء

اقبالؒ اور خواجہ عبدالصمد ککروؒ

راولپنڈی کے راستے کشمیر جاتے ہوئے بارہ مولا کا مشہور قصبہ آتا ہے جو سطح سمندر سے ۵۲۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ دیو قامت چٹانیں اور اُونچے اُونچے پہاڑ سڑک کے دونوں جانب ایستادہ ہیں اور دریائے جہلم دامن کوہ سے نکل کر سڑک کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے جو اِس علاقے کی سرسبزی اور خوبصورتی میں بے حد اضافہ کرتا ہے۔ حقیقت میں یہیں سے حسین و جمیل وادی کشمیر شروع ہوتی ہے۔ یہ قصبہ وادی اور پنجاب و سرحد کے درمیان تجارت کے اعتبار سے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون کشمیر کی ہر مذہبی، سیاسی اور اصلاحی تحریک کا اثر سب سے پہلے اِسی علاقے میں پہنچتا ہے اور پھر وادی میں بسنے والے بیرونی دنیا کے حالات و کوائف سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ظہورِ اسلام سے قبل یہ علاقہ ہندوؤں اور بدھ مت کے پیرو کاروں کی آماج گاہ تھا اور اپنی عبادت گاہوں کی وجہ سے یہ خاص و عام کی توجہ کا مرکز بھی تھا۔ مگر کشمیر میں مسلمانوں کی آمد اور تبلیغ و اشاعت سے اِس بستی کے مکین حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ساری بستی توحید کے نور اور عشق رسولؐ سے روشن و مزین ہو گئی۔ چنانچہ جن بزرگوں اور علمائے کرام کی مساعی جمیلہ سے یہاں اسلام پھیلا، اُن میں خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم کے آباؤ اجداد بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ریاست میں ککرو خاندان کو نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

ممتاز کشمیری مورخ منشی محمد الدین فوق "تاریخ اقوامِ کشمیر" میں لکھتے ہیں:

"بارہ مولا کا ککرو خاندان کسی زمانہ میں بڑے عروج پر رہا ہے۔ اِس

عروج کی آخری جھلک راقم مولف نے بھی بارہ مولا میں دیکھی ہے۔ حاجی خواجہ عبدالصمد ککرو کا دیوان خانہ، اُن کا باغ، مہمان خانہ، سری نگر میں اُن کے بنگلے، خواجہ غفار جو ککرو اور اُن کے برادران خواجہ امیرالدین ککرو اور قادر جو ککرو کی مہمان نوازیاں، اُن کے عالی شان مکانات اور اُن کی بزم آرائیاں اب تک آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ خواجہ امیرالدین مرحوم نے لنگیٹ میں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ عرصہ دراز تک تحصیل داری کی ہے۔ حاجی عبدالصمد ککرو کے حلقہ احباب کی وسعت کشمیر کے علاوہ پنجاب، ہندوستان اور برما تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور اور علی گڑھ کے اسلامی جلسوں میں وہ قریباً ہر سال شامل ہوتے رہے ہیں۔ جامع مسجد بارہ مولا، گو بہت قدیم تھی لیکن بہت خستہ حال تھی، اُنہی کی سعی جملہ سے ۱۳۱۳ ہجری میں از سرنو تعمیر ہوئی۔ اُن کا فرزند کلاں خواجہ غلام نبی دو سال سے آنکھوں سے معذور ہو چکا ہے۔ اُن کے دو اور صاحبزادے ہیں — خواجہ عنایت اللہ ککرو (۱) اور خواجہ حبیب اللہ ککرو (۲) دونوں بارہ مولا میں ابھی زیر تعلیم ہیں۔ خواجہ عزیز جو ککرو اِس خاندان کے متمول بزرگوں میں تھے۔ لاہور میں حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار کے ساتھ جو عالی شان مسجد ہے اُسی بزرگ کی دینی حمیت کی یادگار ہے۔ آج کل اِس خاندان میں صرف خواجہ محمد مقبول ہی قابل ذکر ہیں جو قومی، اسلامی اور اصلاحی کاموں میں خوب دلچسپی لیتا ہے" (۳)

خواجہ عبدالصمد ککرو نے کاروبار سنبھالا تو بارہ مولا کی اراضی و باغات اور دوسرے کاموں کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے عظیم باپ کی روایات کو بھی گلے سے لگائے رکھا بلکہ واقعات گواہ ہیں کہ اُن کے بعد تعلقات کو وسیع تر ہی کیا اور سخاوت میں باپ کے نقش قدم پر ایسے چلے کہ کئی لوگوں کو حج بیت اللہ شریف کرا دیا۔ جس وقت خواجہ عبدالصمد ککرو نے کاروبار سنبھالا وہ دور ریاستی مسلمانوں کے لیے بے حد اذیت ناک تھا۔ غریب دہقانوں اور محنت کشوں پر ناروا مظالم توڑے جاتے تھے۔ مسجدوں اور خانقاہوں پر پہرے لگے تھے اور اذانیں تک بند تھیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی تحریک چل رہی تھی۔ چنانچہ خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم نے ریاست میں

سب سے پہلے اصلاحی تحریک کا آغاز کیا اور اپنی تحریک کا نصب العین اشاعت دین اسلام ٹھہرایا۔ جامع مسجد بارہ مولا کی تعمیر اپنی گرہ سے کی۔

اس ضمن میں مصنف "شباب کشمیر" لکھتے ہیں:

"یہ معلوم نہیں کس سال بادشاہ نے بارہ مولا کی جامع مسجد تعمیر کی لیکن اِس قدر سب مورخ لکھتے ہیں کہ 'بنائے اُوش از بڈ شاہ بود'۔ بڈ شاہی خاندان تک اِس کی حالت اچھی تھی۔ چکوں کے عہد میں مسمار ہونے لگی۔ جب مغل حکومت کا یہاں دور دورہ ہوا تو اِس کی از سر نو مرمت ہوئی۔ سکھوں کے زمانے میں شیخ محی الدین 'ناظم کشمیر' نے اِس کی چھت کو درست کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں کثرتِ بارش و ژالہ باری نے اُس کو سربہ تجود کر دیا۔ ۱۳۱۲ ہجری تک یہی حالت رہی۔ ۱۳۱۳ ہجری میں خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم رئیس بارہ مولا نے اُس کو پھر زندہ کر دیا۔ مرمت مسجد کا قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے:

سجدۂ شکر سر کن اے سامع ۔۔۔ کاختر انما شدہ لامع
کرد اندر بنائے مسجد جد ۔۔۔ خواجہ عبدالصمد زہے جامع
زہد بند اہلم از سر تعمیر ۔۔۔ گشتہ معمور مسجد جامع" (۴)

۱۳۱۳ھ

خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم نے جامع مسجد سری نگر کی مرمت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، انجمن اسلامیہ بارہ مولا' کی بناو رکھی، اور انجمن اسلامیہ قلم روجموں کی، جب تک زندہ رہے' امداد فرماتے رہے۔ اِسی طرح انجمن اسلامیہ سیالکوٹ' کے سالانہ جلسوں میں شرکت کرتے اور چندہ دیتے۔ خواجہ صاحب مرحوم کے ایک ہم نشین اور عزیز خواجہ محمد عبداللہ ککرو مرحوم نے چند سال پیشتر راقم الحروف کو ایک خط میں لکھا تھا:

"خواجہ صاحب پابند صوم و صلوۃ ہونے کے علاوہ صدقات و زکوۃ کی رقم یتیموں' بیواؤں اور نادار رشتہ داروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ زیادہ تر یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کے دلدادہ تھے۔ مدرسہ نصرۃ اسلام سری نگر کے بانی حضرت مولانا غلام رسول شاہ صاحب (سرسید ثانی) پدر بزرگوار الحاج مولوی محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم (میرواعظ کشمیر) کے دوش بدوش قلمے،

قدمے اور درمے کام کرتے رہے اور مدرسہ کے لیے سری نگر اور مفصلات میں چندہ فراہم کرنے اور گورنمنٹ سے گرانٹ حاصل کرنے میں جس مستعدی اور سرگرمی سے وہ اپنا قیمتی وقت صرف کرتے تھے۔ دیگر رؤسا کے لئے قابلِ رشک تھا۔ بارہ مولا میں زیرِ صدارت الحاج شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب مرحوم ایک دینی درس گاہ قائم کی تھی، جہاں علم تفسیر، حدیث، فقہ اور مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔"

خواجہ عبدالصمد ککرو ریاست کے اُن لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی اسلام دوستی، عشق رسول مقبول ﷺ اور علم پروری کی وجہ سے مشہور تھے۔ آپ خود عالم دین تھے اور عالموں کے قدردان بھی۔ فارسی زبان اور اُردو علوم و ادبیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انگریزی زبان میں بھی گفت و شنید کر سکتے تھے۔ اپنے لوح یا کتبہ مرقد کے بارے میں فرمایا:

اگر مدبرم کن تو مقبل مرا　　بپایِ محمدؐ شفیع الوریٰ
بتو ہست موجود ہر نیک و بد　　کلامت صحیح است الصمد

فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مقبل اور اُردو میں صمد تخلص کرتے تھے۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ادبا اور شعرائے کرام سے ذاتی مراسم تھے اور اپنی مہمان داری اور وضع داری کے لیے ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ وادی میں جب بھی کوئی ممتاز غیر ملکی آتا تو سب سے پہلے خواجہ صاحب مرحوم خوش آمدید کہتے، اپنے پاس ٹھہراتے، خاطر تواضع کرتے اور عزت و احترام سے رخصت کرتے۔ مولانا محمد الدین فوق جب بھی کشمیر جاتے تو نہایت التزام کے ساتھ خواجہ صاحب کے ہاں جاتے اور اُن کے مہمان بنتے۔ چنانچہ اُنہوں نے کئی نظمیں خواجہ صاحب کے دیوان خانہ میں بیٹھ کر لکھیں، بلکہ کئی بار خواجہ صاحب ہی کی تحریک پر اشعار کہے۔ اِس سلسلے میں "کلامِ فوق" کے صفحہ ۸۶ لکھا ہے:

"۲۷ ستمبر ۱۹۰۱ء کو بارہ مولا میں اُن کا افتتاحی جلسہ تھا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ، رزیڈنٹ، اور مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے علاوہ تمام امراء، وزرا اور اعلیٰ عہدے دار اُس جلسہ میں موجود تھے۔ خواجہ عبدالصمد صاحب ککرو، رئیس بارہ مولا، مرحوم کی تحریک سے

مہاراجہ صاحب کے بنگلہ پر ہی چند شعر میں نے لکھے:

جامۂ علم و ہنر ہر جسم کی زینت ہے آج
رشک دستارِ فضیلت سر پہ ہر دستار ہے
گر یہی تیری توجہ ہے تو پھر کشمیر میں
میہمانِ چند روزہ نکبت و ادبار ہے

اِسی سال فوق نے خواجہ صاحب کے دیوان خانہ میں یہ چند اشعار کہے:

کشمیر میں اسلام کا کچھ حال نہ پوچھ
غفلت ہے مسلمانوں میں غفلت سے زیادہ
تعلیم سے، تہذیب سے، تمیز سے نفرت
اُلفت ہے مگر اُن کو جہالت سے زیادہ

اِس قوم میں ایسے بھی ہنر رکھتے ہیں اکثر
جو چشم فلک نے کبھی دیکھے نہ دکھائے
کچھ ملک کی خدمت میں کمر بستہ کھڑے ہیں
بیٹھے ہیں غم قوم میں کچھ سر کو جھکائے
پیدا بہت ہو گئے اللہ کے بندے
جو خواب میں ہیں اُن کو بھی اللہ جگائے"

خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم ہر جمعرات کو ختم دلاتے، درس میں شرکت فرماتے اور آنحضرت ﷺ کے مولود پر مجلس منعقد کراتے۔ مقصد یہی تھا کہ اہل وادی اسلام کی حقیقی روح سے آگاہی حاصل کریں۔ نہ صرف گفتار کے غازی تھے، بلکہ باعمل انسان تھے۔ چنانچہ اِس غرض کے لیے بارہ مولا میں مدرسہ فیض عالم جاری کیا جہاں اسلامی تعلیمات کے سلسلے کا آغاز کیا۔ اِس مدرسے کے اساتذہ برصغیر کے بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کو شرکت کی دعوت دیتے اور اُن کے درس و مواعظ کا انتظام فرماتے۔ آپ خود بے نظیر مقرر تھے اور عظیم الشان اجتماعوں میں دورانِ تقریر طبع زاد شعروں سے حاضرین کو مسرور کرتے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ دیو بندی سے خاص محبت اور عقیدت تھی۔ وہ اکثر آپ ہی کے پاس ٹھہرتے۔ مولانا جب دیو بند کی تعلیم اور مدرسہ امینیہ دہلی کی ملازمت سے فارغ ہو کر وطن واپس آئے تو بہت افسردہ خاطر تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم نے اِس جید عالم اور فاضل اجل انسان کی قلبی واردات کو محسوس کر لیا اور اُسی وقت مولانا اور دیگر نو افراد کو ساتھ لے کر سوئے حجاز روانہ ہو گئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اِس قافلے کا سارا خرچ خواجہ صاحب مرحوم نے اپنی جیب سے برداشت کیا۔ حضرت مولانا انور شاہ کے ذکر جمیل میں مولانا محمد الدین فوق مرحوم فرماتے ہیں:

"۱۳۲۳ھ میں خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس بارہ مولا اور کشمیر، مردان علی رئیس گڑھی جیب اللہ ہزارہ کی رفاقت میں زیارتِ حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ سفرِ حجاز میں طرابلس، بصرہ اور مصر اور بعض دوسرے مقامات کے حضراتِ علما نے آپ کی بڑی قدر کی۔

"سفرِ حجاز سے واپس آکر خواجگانِ بارہ مولا خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو کے اصرار سے آپ نے بارہ مولا میں مدرسہ فیض عالم کی بنیاد ڈالی اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب کرتے رہے۔" (۴)

خواجہ عبدالصمد ککرو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی رکن تھے۔ ہر اجلاس میں شرکت فرماتے اور اپنے ہم وطنوں کی مشکلات کا تذکرہ کرتے تھے۔ آپ کا شمار آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے کیونکہ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جو ابتدائی اجلاس ہوا تھا آپ اِس میں شریک تھے۔ اِس پلیٹ فارم سے اُنہوں نے حکومت ہند کی توجہ ریاستی مسائل کی طرف مبذول کرائی اور اہل خطہ کے نکبت و ادبار سے آشنا کیا۔ اُنہی کے رفقائے کار خواجہ سعید الدین شال، خواجہ نور شاہ نقشبندی، میر واعظ مولوی محمد احمد اللہ ہمدانی اور میر واعظ مولوی رسول شاہ مرحوم نے وائسرائے ہند کو میمورنڈم پیش کیا اور اذیتیں اُٹھائیں جن میں جلا وطنی شامل تھی۔ یہ بات ۱۹۲۴ء کی ہے۔ گو خواجہ صاحب کا انتقال اِس سے قبل ہو چکا تھا مگر حقیقت یہی ہے کہ اُن کشمیری رہنماؤں کا برصغیر کے سیاست دانوں اور دانش وروں سے تعارف خواجہ صاحب نے ہی کرایا تھا۔

خواجہ صاحب مرحوم کے تعلقات سر سید احمد خاں مرحوم، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر

انصاری، مولانا حالی، حکیم محمد اجمل خاں، نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حسرت موہانی، مولانا مولوی سید میر حسن شاہ سیالکوٹی اور علامہ اقبال سے اُسی دور میں بڑھے۔ ۱۹۰۸ء میں نواب محسن الملک کا انتقال ہوا تو بقول فوق مرحوم، جب یہ خبر سری نگر پہنچی تو ۲۱ اکتوبر کی سہ پہر کو خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی، ریذیڈنسی، ماسٹر صادق علی خاں ہیڈ ماسٹر مرحوم، خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم اور مولوی عتیق اللہ صاحب، سیکرٹری، انجمن نصرت الاسلام، سری نگر، کی سعی سے اسلامیہ ہائی سکول کے وسیع صحن میں ایک ماتمی جلسہ ہوا۔"

اِس جلسہ میں فوق نے جو نظم پڑھی اُس کے چند شعر یہ ہیں:

مٹ گیا جورِ فلک سے قوم کا محسن بھی آج
آہ پھر گم کردہ رہ یہ کارواں ہونے کو ہے
قوم کا خادم بھی تھا، سید بھی تھا، مہدی بھی تھا
رونقِ بزمِ جہاں زیبِ جناں ہونے کو ہے
کیا بتائیں ہم بقولِ داغ کیا جاتا رہا
جو بھروسہ تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا

آپ کشمیری باشندہ ہونے کے باوجود انجمن حمایت اسلام کے بانی رکن تھے اور ہر اجلاس میں شرکت کرتے اور ہر بار حسب توفیق انجمن کی امداد فرماتے رہے۔ انجمن حمایت اسلام کے دیرینہ کارکن آج بھی خواجہ صاحب مرحوم کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ سید نذیر نیازی فرماتے ہیں: "خواجہ صاحب ہر سال انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرتے، مالی امداد بھی فرماتے اور تقریر بھی کرتے۔ میں نے خود اُن کی تقریریں اور اشعار سنے ہیں۔"

خواجہ عبدالصمد ککرو علامہ اقبال سے سیالکوٹ سے ہی آشنا تھے، کیونکہ خواجہ صاحب کے تعلقات اُن کے استاد گرامی شمس العلما مولوی میر حسن سیالکوٹی اور اُن کے والد ماجد شیخ نور محمد مرحوم سے تھے۔ خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم اور علامہ اقبال کی گہری دوستی قائم ہو گئی اور اُس نوعیت کا تعلق ہوا کہ وہ علامہ اقبال کے دکھ درد، مسرت و انبساط کے ہر موقع پر شریک رہتے۔ علامہ اقبال بھی اُن کے دکھ کو اپنا غم جانتے اور اُن کے

مسائل و معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔

خواجہ عبدالصمد ککرو کے بڑے فرزند خواجہ غلام حسن نے، جو پابند صوم و صلوٰۃ اور ذہین طالب علم تھا، علامہ اقبالؒ کی زیرِ نگرانی اُن کے پاس لاہور میں رہ کر میٹرک کی تیاری کیا اور لاہور ہی میں امتحان دیا۔ جب اِس کا نتیجہ نکلا تو علامہ اقبال نے بارہ مولا خواجہ صاحب مرحوم کو مبارک باد کا تار دیا، مگر سوئے اتفاق سے جب تار بارہ مولا پہنچا اُس وقت خواجہ صاحب اپنے اِس جواں سال بچے کو سپردِ خاک کر کے واپس آ رہے تھے۔ اُس واقعہ پر خواجہ نے اُف تک نہ کی اور اعلیٰ پایہ کا شاعر ہونے کے باوجود ایک لفظ تک نہ لکھا کہ مبادا غیرتِ الٰہی جوش میں آ جائے۔ صبر و تحمل سے کام لیا۔ جب علامہ اقبال کو سانحے کا علم ہوا تو آپ نے "ماتم پسر" کے عنوان سے نوحہ لکھا جو "مخزن" جولائی ۱۹۰۲ء میں سر عبدالقادر مرحوم کی اِن سطور کے ساتھ شائع ہوا:

"ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا، علاقہ کشمیر، خواجہ عبدالصمد ککرو ہیں۔ اُنہیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم اور علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طباع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں مگر اِس رنج نے اُن کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور اُنہیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال نے اُن کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔"

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اُڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار نظر سے جو وہ گُل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور میں راہ میں غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر مرے صبر کا امتحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جاں ستاں دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اِس غضب کا خزاں نے کیا بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا

کسی نوجواں کی جدائی میں قد جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جدائی میں نالاں ہوں بلبل نہ کیوں وہ گل زیبِ باغِ خباں ہو گیا
وہ سرخی ہے اشک شفق رنگ میں حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ذر ذر کے جو آشیاں وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا
دیا چین کے وہ غم فلک نے اُسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا"

اِس ضمن میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"خواجہ عبدالصمد قومی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں آتے تھے تو خوب چندہ دیتے تھے۔ خود بھی تقریریں کرتے تھے۔ نیز شاعروں اور مقرروں کی حوصلہ افزائی میں بھی سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ اقبال سے اُنھیں بے حد محبت تھی۔ اقبال نے اُسی تعلق کی بنا پر یہ نوحہ کہا تھا جو خواجہ عبدالصمد کی زبان سے ہے۔ خواجہ غلام حسن مرحوم کا نام تھا۔" (۵)

خواجہ عبدالصمد ککرو کو علامہ اقبال سے کس قدر عقیدت و ارادت تھی، اِس کا اندازہ انجمن حمایت اسلام کے اٹھارویں سالانہ جلسہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء، یکم مارچ ۱۹۰۳ء کی روداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ اِس کے تیسرے اجلاس میں جو جناب خان بہادر غلام احمد خاں صاحب، مشیر مال، ریاست جموں و کشمیر، کی صدارت میں ہوا، ڈاکٹر علامہ اقبال نے "فریادِ اُمت" کے عنوان سے نظم پڑھی۔ چنانچہ اِس سلسلے میں روداد ۱۹۰۳ء میں لکھا ہے:

"اقبال صاحب کو جیسی خدا نے لیاقت عطا فرمائی ہے ویسے ہی قدرت نے اُن کو گلا بھی عطا کیا ہے اور ایسی بلند اور شیریں اور پُر درد آواز کی نعمت مرحمت کی ہے جو اُنھیں کا حصہ ہے۔ اِس قدرتی عطیہ کی امداد سے اُن کے کلام کا جو فی ذاتہ نہایت عمدہ اور پُر معنی ہوتا ہے اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ اُس نظم کے پڑھے جانے پر لوگوں نے چندہ دیا اور پانچ روپے فی کاپی خریدی۔

چنانچہ اِس قابلِ دید نظم کے بہت سے نسخے فروخت ہو گئے۔ خواجہ عبدالصمد ککرو نے شیخ محمد اقبال صاحب کو اِس نظم کے صلے میں ایک نقرئی تمغہ پہنایا جو خواجہ صاحب کشمیر سے بنوا کر لائے تھے۔"(۶)

سید نذیر نیازی نے راقم کو بتایا کہ جب حضرت علامہ اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" پڑھی تو اُس کے اختتام پر خواجہ عبدالصمد ککرو جو جلسہ گاہ میں موجود تھے اور ایک بیش قیمت کشمیری شہ توشہ (شال) اوڑھے ہوئے تھے اپنی جگہ سے اُٹھے اور وہ شال حضرت علامہ کے شانوں پر ڈال دی اور فرطِ جذبات سے حضرت علامہ سے بغل گیر ہو گئے۔ ازاں بعد اِس شال کو جلسہ گاہ میں نیلام کیا گیا جسے ایک مخیر انسان نے خریدا۔ روپیہ انجمن کے چندہ میں دے دیا گیا۔

خواجہ عبدالصمد ککرو پچاسی سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ علامہ اقبال ۱۹۲۱ء میں جب کشمیر گئے تو تعزیت کے لیے بارہ مولا گئے۔ علامہ نے ایک بار اُن کے بارے میں فرمایا:

خواجہ خواجگاں صمد ککرو
آنکہ دارد قیام در کشمیر

حواشی

۱۔ خواجہ عنایت اللہ ککرو ریاست جموں و کشمیر کے مشہور سیاست دان ہیں۔ اُنھوں نے تحریک پاکستان کے لیے ریاست میں بہت کام کیا۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کے بھارت سے الجھنے اور گرفتار ہونے پر اُن کے ہم نوا بنے اور کئی برس بھارتی قید میں رہے۔ آج کل مقبوضہ علاقہ میں مقیم ہیں۔

۲۔ خواجہ حبیب اللہ ککرو، تحریک پاکستان کے روحِ رواں، مشہور کاروباری ادارہ جیسن کے مالک، آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔

۳۔ محمد الدین فوق، "تاریخ اقوام کشمیر" جلد اول ص ۲۶۵

۴۔ محمد الدین فوق۔ شباب کشمیر۔ ص ۱۱۹

۵۔ مشاہیر کشمیر ص ۶۳

۶۔ "سرودِ رفتہ" ص ۱۶۵

۷۔ محمد حنیف شاہد، "اقبال اور انجمن حمایت اسلام"، ص ۷۸

علامہ اقبال — ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور کشمیر

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ محمد اقبال پر ایک طویل مسدس نما نظم لکھی ہے جو کلام حکیم کے صفحہ ۱۲۲ سے لے کر صفحہ ۱۲۷ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اِس نظم میں خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ محمد اقبال کی شخصیت، سیرت و کردار، علم و فن، دانش و بصیرت اور فکر و نظر کی جس خوبصورتی سے عکاسی کی ہے، وہ شعر و فن کی دنیا میں مثالی ہے۔ خاص طور پر اُنہوں نے علامہ محمد اقبال کی سبھی خوبیوں اور صلاحیتوں کا مرکز اُن کا عشق قرار دیا ہے فرماتے ہیں ؎

وہ عشق جو انسان کی ہمت کو اُبھارے
وہ عشق جو دنیا میں بگڑتے کو سنوارے
جس عشق سے اغیار بھی بن جاتے ہیں پیارے
جس عشق کے اشکوں سے فلک پر بنے تارے
وہ عشق تھا تیرے دل و جاں میں، رگ و پے میں
جس طرح نشہ مے میں ہے اور نغمہ ہے لے میں

علامہ محمد اقبال کیا تھے اور کن کے ہم آہنگ تھے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

تھے صاحب دل رومی و عطار و سنائی
تھی جن کی خودی آئینہ راز خدائی
لے عالم ارواح کی انسان کو سنائی
کچھ لذت وصل اِس میں ہے کچھ درد جدائی

ایسے ہی فقیروں کا ہم آہنگ تھا اقبال
مردانِ خدا دوست کا ہم رنگ تھا اقبال

اور حقیقت ہے کہ خود خلیفہ عبدالحکیم بھی علامہ محمد اقبال کے ہم آہنگ ہم آواز اور ہم نشین تھے اور پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کلام حکیم کے دیباچہ میں درست لکھا ہے کہ:

"تیسرے باب (خاک و افلاک) کی نظموں میں حیات و کائنات ارتقاء کے بنیادی اُصولوں پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ یہاں خلیفہ صاحب کے ہمہ گیر فکر و تخیل کے ہاتھوں کہیں تو قدیم فلسفے کے ڈانڈے جدید ترین نظریات زمان و مکان سے مل گئے ہیں کہیں ویدانیت کی ماورائیت اسلامی ذہن و شعور کی حقیقت پسندی کے آگے سر بہ سجود ہے اور کہیں حافظ شیرازی اور علامہ اقبال سے بغل گیر نظر آتے ہیں۔"(۱)

خلیفہ عبدالحکیم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا تاجور نجیب آبادی نے لکھا تھا:

"خلیفہ صاحب پنجاب کے اُن قابل قدر ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جن پر علمی دنیا ناز کرے گی۔ قدرت کی فیاضیاں دیکھئے کہ خلیفہ صاحب کو شاعری کی دنیا میں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو جہانِ فلسفی میں ڈاکٹر اقبال کو حاصل تھا، جن کے بعد پنجاب بھر میں آپ سے بہتر کوئی شاعر نہیں۔"(۲)

اور جب یہی شاعر اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین کشمیر میں پہنچتا ہے تو یہ بھی علامہ محمد اقبال کی مانند تڑپ اُٹھتا ہے۔ اگر ایک طرف وطن عزیز کی رعنائیوں اور شادابیوں کو دیکھتا ہے تو دوسری جانب اپنے ہم وطنوں کی محکومی پر نوحہ خواں ہوتا ہے اور اُنھیں آزادی کے لئے جدوجہد کی ترغیب دیتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے بھی کشمیر کے حسن و جمال کی تعریف کے بعد وہاں کے رہنے والوں کو درس حریت دیا ہے اور یہی عمل خلیفہ عبدالحکیم نے اختیار کیا۔

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تار سبز

پیڑ اِس طرف سبز ادھر کوہسار سبز
یاں فوج سبز پوش ہے واں ہے، حصار سبز
نوخیز برگ رقص کناں شاخ سبز پر
نے سبز اور اِس پہ چڑھائے سوار سبز
ہر برگ نخل پر ہے انا الحق سرا ہوا
منصور سبز پوش ہیں اور چوب دار سبز
سبزے سے ہے جو خاک کا عنصر بدل گیا
ہے توسنِ نسیم سے اُٹھتا غبار سبز
خامہ تھا چوب خشک جو محو بیاں ہوا
ذکر بہار سے ہوا پھر ایک بار سبز

سرینگر کی جھیل ڈل کے بارے میں لکھا:

شام کو رنگ شفق ہے جلوہ فگن آب میں
سخت حیراں ہوں یہ گل خن ہے کہ گلشن آب میں
ہے سفینہ شعر کا اور شاعری خامہ بدست
ناؤ پر چپو لئے بیٹھی ہے ہانجن آب میں
بازی موج نسیم ایسی نشاط انگیز ہے
یاد آ جاتا ہے بوڑھوں کو بھی بچپن آب میں
ہر دیئے کی جگمگاتی ہیں شعائیں تہ تلک
اور ہو جاتی ہے بینہ چشم روشن آب میں

مناظر فطرت اور مشاہدۂ حسن و جمال کے بعد جب اپنی قوم پر نظر پڑتی ہے تو تڑپ اُٹھتے ہیں:

جس قوم کے ہاتھوں میں رہتی ہے شمشیر
اے خطہ کشمیر
کھوتی نہیں وہ کونین میں سب عزت و توقیر
اے خطہ کشمیر

پڑھ دہر کے اوراق پہ یہ خون کی تحریر
اے خطہ کشمیر
تلوار مجاہد کی ہے قرآن کی تفسیر
اے خطہ کشمیر
وادی تری ایمن ہے تو پربت تیرے سینا
اے خطہ کشمیر
اس پر یہ غلامانہ مشقت کا پسینا
افگار ہے سینہ
سب قوم کے سینے میں اُٹھے گرم فغاں ایک
دل ایک، زباں ایک
مقصود رکھیں قوم کے سب پیر و جواں ایک
ہو سیل رواں ایک
لازم ہے کہ ہو قوم عیاں ایک نساں ایک
سب خورد و کلاں ایک
وابستہ ہو باہم صفت حلقہ زنجیر
اے خطہ کشمیر
کچھ لعل تری کان کے بیرون وطن ہیں
جو فخر زمن ہیں
بیرون چمن بھی ترے کچھ سرو سمن ہیں
اور تابہ دکن ہیں
جن نافوں کی خوشبو سے معطر ہوئے بن ہیں
بیرون ختن ہیں
ماتم میں ترے صورت گل سینہ دیا چیر
اے خطہ کشمیر

علامہ محمد اقبال سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو ایک روحانی تعلق تھا اور تمام عمر اُن

کے افکار و نظریات کی تشریح میں سرگرداں رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم "اقلیم اقبال" کے خلیفہ اول تھے اور اُن کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز حسن نے خوب لکھا ہے کہ:

"خلیفہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ عہد حاضر کے فکر و فلسفہ کی روشنی میں اسلامی اقدار کی وضاحت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اُن کے کسی خیال یا رائے سے اتفاق نہ ہو لیکن اُن کا علمی کام بجائے خود اتنا اہم ہے کہ اقبال کے بعد اسلامی فکر اور فلسفے کے میدان میں اُن کا ہم پایہ مشکل سے دکھائی دے گا۔ انہوں نے اپنے شگفتہ اسلوب اور عام فہم انداز تکلم سے فلسفے کے خشک اور دقیق مضامین کو عوام و خواص کے لئے آسان اور قابل فہم بنا دیا ہے۔ وہ اسلامی اقدار اور مذہبی نکات و رموز کو روایتی علماء سے بہتر سمجھتے تھے اور بہتر سمجھا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے لئے اُن کی تحریریں ایک قابل قبول رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔" (۳)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ علامہ اقبال اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم دونوں کے آباؤ اجداد کا تعلق خطہ کشمیر سے تھا۔ دونوں کے بزرگ ترک وطن کر کے پنجاب میں آن بسے۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم میں منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں:

"اِس خاندان کے شجرہ نسب پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس نے پنجاب میں آنے کے بعد بیک وقت بہت سے قابل افراد پیدا کیے جو اِس بات کی دلیل ہے کہ اگر کشمیریوں کو استبداد کے پنجے سے چھڑا کر آزاد ماحول میں نشو و نما کا موقع دیا جائے تو وہ اپنی فطری ذہانت اور غیر معمولی قابلیت کے جوہر دکھا سکتے ہیں" (۴)

خلیفہ عبدالحکیم کی تاریخ پیدائش عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کے ریکارڈ کے مطابق یکم جولائی ۱۸۹۳ء لاہور ہے اور جب ۱۹۱۵ء میں اُنہوں نے بقول مولانا عبداللہ قریشی پنجاب یونیورسٹی میں اول آکر فلسفہ کا ریکارڈ قائم کیا تو اِسی امتیاز پر آپ کو تعلیمی وظیفے کے علاوہ مہاراجہ قاسم بازار کا تمغہ ملا۔ یہ ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کا واقعہ ہے کیونکہ ایم اے (فلسفہ) کا امتحان آپ نے ۱۹۱۷ء میں سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے پاس کیا

تھا۔ بہرحال اُن دنوں یہاں سر فضل حسین مرحوم اسلامیہ کالج لاہور کے سیکرٹری اور خواجہ جمال الدین بی اے انسپکٹر مدارس کشمیر تھے۔ اول الذکر نے آپ کو کالج میں پروفیسری کا عہدہ پیش کیا اور مؤخر الذکر نے کہا کہ شیخ مقبول حسین ریونیو منسٹر آپ کو اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی اُن کو اپنے آبائی وطن سے ملازمت کا پیغام ملا لیکن یہ عجیب کشش اور تعلق تھا کہ اگست ۱۹۱۸ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی کالج قائم ہوا تو آپ ۱۹۱۹ء میں علامہ اقبال کی سفارش پر فلسفہ اور منطق کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے۔

اِس ضمن میں خلیفہ عبدالغنی کا بیان ہے:

> "جب یہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو علامہ اقبال کو فلسفے کی پروفیسری کی پیش کش کی گئی۔ علامہ اقبال نے خلیفہ عبدالحکیم سے فرمایا کہ چیف منسٹر سر اکبر حیدری کا خط آیا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کھلی ہے اور انہیں فلسفے کے لئے پروفیسر کی ضرورت ہے۔ اِس کا جواب میں نے سر اکبر حیدری کو لکھا دیا کہ میں ایسا آدمی بھیجنا چاہتا ہوں جس کی بابت آپ محسوس کریں کہ وہ اقبال ہے۔" (۵)

لاہور میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اوائل عمر میں ہی علامہ محمد اقبال کے نام سے آشنا ہو چکے تھے اور وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اُن کی نظمیں سنا کرتے تھے اور جب یہ آشنائی عمر کے ساتھ ذاتی روابط تک بڑھی اور اُدھر "اسرار خودی" چھپ کر آئی تو خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں "میں اِس زمانے میں ایم اے فلسفہ میں پڑھتا تھا اور جب بھی موقع ملتا فیض صحبت کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ آپ نے منشی طاہر دین کو بلایا اور کہا کہ اُن کو ایک نسخہ دے دو لیکن اُن سے قیمت نہ لینا" (۶)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ اقبال کے فکر و فن پر ایک مستند کتاب فکر اقبال لکھی ہے جسے اقبالیات میں بے حد اہمیت حاصل ہے اور پروفیسر حمید احمد خان نے درست لکھا تھا کہ فکر اقبال اِس خاص موضوع ہمیشہ ایک مستند کتاب مانی جائے گی دراصل ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم خود بھی ایک بہت بڑے فلسفی تھے اور وہ علامہ محمد اقبال کی مانند ایک مذہبی سکالر بھی تھے۔ لہٰذا اُن سے بہتر اقبال کے فلسفہ کا شارح اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۱۹۴۳ء میں امر سنگھ ڈگری کالج

سرینگر کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ازاں بعد ڈائریکٹر محکمہ تعلیمات بنائے گئے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۴۴ء میں جس وقت قائداعظم محمد علی جناح کشمیر کے دورے پر آئے تو اُس وقت ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سرینگر میں موجود تھے اور وہاں کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ اُن کے مراسم کشمیری سیاست دانوں بالخصوص شیخ محمد عبداللہ سے بھی تھے جو کانگریس کے بہت قریب تھے گو اُنہوں نے بھی قائداعظم محمد علی جناح کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی اور قاضی کنڈ کے مقام پر اُن کی جماعت کے کارندوں نے قائداعظم محمد علی جناح کا استقبال ہی نہیں کیا تھا بلکہ یہی تنظیم اُنہیں لے کر پرتاپ پارک میں پہلے استقبالیہ جلسہ میں لائی تھی اِس کے بعد قائداعظم محمد علی جناح مسلم کانفرنس کے اجتماع میں گئے تھے۔

درحقیقت یہ دور کشمیری سیاسیات میں بے حد اہم تھا۔ ریاست کی دو بڑی سیاسی تنظیمیں اپنے نظریات کی بنا پر اختلاف کا شکار تھیں۔ مسلم کانفرنس کے قائدین میں چودھری غلام عباس اور میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ تھے جبکہ نیشنل کانفرنس کی قیادت شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھوں میں تھی جو کانگریس کی ہم نوائی کر رہے تھے اور قائداعظم محمد علی جناح اُن کو سمجھاتے رہے اور بقول شیخ عبداللہ قائداعظم محمد علی جناح اُنہیں دو قومی نظریہ کی حمایت کا کہتے رہے اور کانگریس کی ہندو نوازی سے آگاہ کیا۔

ریاست کے دو بڑے مسلمان لیڈروں کے اختلافات کو خلیفہ عبدالحکیم نے محسوس کر لیا تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کی کوشش تھی کہ کسی طرح قائداعظم محمد علی جناح اور شیخ محمد عبداللہ کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے۔ گو آپ ایک سرکاری آفیسر تھے مگر اُنہوں نے اِس کا حل نکال لیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کے ایک کزن خان صاحب منشی سراج الدین (میر منشی ریذیڈنسی کشمیر) تھے اور اُن کا خاندان کشمیر میں رہتا تھا۔ اُن کے ایک داماد شیخ محمد انور مرحوم تھے جو ریاست میں اکونٹس آفیسر تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور خلیفہ صاحب سے اُن کے مراسم تھے۔ منشی سراج الدین کے دوسرے داماد شیخ محمود احمد تھے جو آزاد کشمیر کے ناظم تعلیمات رہے اور اُنہوں نے جاوید نامہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور پاکستان میں ماہر اقتصادیات کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے شیخ محمد انور کو یہ مشورہ دیا کہ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل کشمیری طلباء کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح کو امر سنگھ کلب میں دعوت دیں اور بحیثیت اولڈ بوائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شیخ محمد عبداللہ بھی اِس میں آئے گا اور یوں دونوں لیڈروں کی ملاقات ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اِس موقع کی جو تصویر شائع ہوئی ہے اُس میں قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ خلیفہ عبدالحکیم اور جسٹس نذیر الدین ہیں اور اُن کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ بیٹھے ہیں راقم کو یہ بات خود شیخ محمد انور نے بتائی تھی اور خواجہ بدر نے درست لکھا ہے:

"کشمیر میں قیام کے دوران میں خلیفہ صاحب کے شیخ عبداللہ سے گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں اُنہوں نے کچھ سیاسی قسم کی پیغام رسانی بھی کی۔ گویا آپ نے بالواسطہ سیاست میں حصہ لیا۔ شیخ عبداللہ نیشنل کانفرنس سے تعلق رکھتے تھے اور کانگریس کے حامی تھے مسلم کانفرنس قائداعظم اور مسلم لیگ سے وابستہ تھی اور اُن دونوں کے درمیان شدید اختلاف تھے خلیفہ صاحب چاہتے تھے کہ اُن دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے۔"[۷]

خلیفہ عبدالحکیم کی جن کوششوں کا ذکر اُوپر ہوا ہے وہ ۱۹۴۷ء کی ہیں بلکہ ۱۹۴۴ء میں بھی جب قائداعظم محمد علی جناح تقریباً دو ماہ تک سرینگر میں مقیم رہے انہوں نے ایسی کوششیں کی تھیں۔ افسوس ریاستی لیڈروں نے سمجھوتہ نہ کیا اگر ۱۹۴۴ء میں کوئی سمجھوتہ ہو جاتا تو ۱۹۴۷ء میں مسئلہ کشمیر پیدا ہی نہ ہوتا۔

سرینگر میں خلیفہ عبدالحکیم نے نسیم باغ میں ایک بنگلہ تعمیر کرایا چونکہ آپ کو پشتینی باشندہ ریاست قرار دے دیا گیا تھا اِس لئے آپ ریاست میں جائیداد خرید سکتے تھے۔ آپ کو اپنے دوستوں اور احباب سے بہت لگاؤ تھا۔ جموں میں ایک سکول کا معائنہ کرنے لگے تو ایک سکول ماسٹر آپ کا ایم اے کا ہم جماعت تھا۔ اِس نے جب آپ کو یاد دلایا تو آپ نے اِسے کہا کہ میرے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں جب جی چاہے آ جایا کرو۔

اُن کا ایک اور واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ جب آپ کشمیر میں بطور پرنسپل مقرر

ہوئے تو اپنے لئے ایک کوٹھی پسند کی۔ اِن دنوں کشمیر کا ایک وزیر حویلی رام تھا۔ اتفاقاً وہی کوٹھی اِسے بھی پسند آئی اور اس نے اُسے خرید لیا۔ خلیفہ صاحب کی طبیعت پر یہ بات بہت گراں گزری آپ نے فوراً یہ اشعار لکھ کر حویلی رام کو بھیج دیئے:

حویلی لے گیا لالہ حویلی
غریبوں کا بھی اللہ بیلی
خدا بھی لامکاں بندہ بھی بے گھر
اِس کی یہ صفت میں نے بھی لے لی

حویلی رام نے جب یہ اشعار پڑھے تو اُسی وقت وہ کوٹھی خلیفہ صاحب کے نام کر دی۔

خلیفہ عبدالحکیم کی یہ خواہش تھی کہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد باقی ماندہ زندگی سرینگر میں نسیم باغ کی کوٹھی میں لکھنے پڑھنے میں گزار دیں گے۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کشمیر آگ و خون کے سنگم پر کھڑا ہو گیا۔ خلیفہ صاحب پاکستان آ گئے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں ترجمہ و تصنیف کیں جن میں اسلامی نظریہ حیات، حکمت رومی، فکر اقبال، داستان دانش، افکار غالب، نفسیات واردات روحانی، اسلام اور کیمونزم، تشبیہات رومی، اسلام کی بنیادی حقیقتیں، اقبال اور ملا قابل ذکر ہیں اور یوں مادر کشمیر کا یہ مایہ ناز فرزند ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو عارضہ قلب کے حملہ سے اِس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

حواشی

۱۔ کلام حکیم ص۔ و
۲۔ مخزن نومبر ۱۹۱۸ء ص ۲
۳۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص ح۔ط
۴۔ تاریخ اقوام کشمیر ۳: ۱۶۶
۵۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۵
۶۔ مقالات حکیم جلد دوم ص ۵۸
۷۔ اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء

علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ڈاکٹر محمد رفیع الدین برصغیر کے نامور ماہر اقبالیات، اسلامی مفکر اور ماہر تعلیم تھے۔ انہوں نے اُمت مسلمہ کی نشاۃ الثانیہ اور اس کے لئے صحیح نظریاتی جہت متعین کرنے کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں ــــ آپ کا سلسلہ نسب قطب شاہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ کا نام سکندر تھا۔ وہ موضع سکندر پور ضلع گجرات میں رہائش پذیر تھے۔ موضع سکندر پور کے واحد مالک تھے۔ اُنہی کے نام گاؤں کا نام مشہور ہو گیا۔ پیشہ زمینداری تھا اور ذات کے ملک اعوان تھے ــــ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو نہ صرف علم کی دولت بلکہ اسلام کی محبت بھی ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے دل میں اسلام سے محبت و ارادت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ نہ صرف صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے بلکہ ذکر صبح گاہی سے بھی آشنا تھے۔

آپ کے چچا حضرت مولوی محمد حسن جن کا آبائی گاؤں کوٹ بھوانہ داس ضلع گوجرانوالہ تھا، ایک بلند پایہ صوفی بزرگ تھے۔ ریاست جموں و کشمیر کے بیشتر علاقوں میں اپنے زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے مشہور تھے۔ اِس ریاست میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اُن کے مرید تھے ــــ اور اپنے چھوٹے بھائی مولوی فقیراللہ کے ساتھ جموں آتے تھے ــــ مولوی فقیراللہ، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے والد ماجد تھے۔ اُنہوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور بعد میں مہاراجہ کی سرکار میں ملازم بھی ہوئے ــــ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۱۹۰۶ء میں جموں میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں سری رنبیر ہائی سکول جموں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان فزکس، کیمسٹری، ریاضیات اور عربی کے مضامین کے ساتھ اور ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے کا امتحان

اکنامکس، عربی اور اردو کے مضامین کے ساتھ پاس کیا۔ عربی کے مضمون میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے ایم۔اے عربی کا امتحان اورینٹل کالج لاہور سے پاس کیا اور سری پرتاب کالج سرینگر میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے — ۱۹۳۰ء میں آپ نے فارسی میں آنرز کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۳۲ء میں آپ کا تقرر پرنس آف ویلز کالج جموں میں عربی اور فارسی کے پروفیسر کے طور پر ہوا جہاں آپ چودہ سال تک پڑھاتے رہے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں میں اپنے قیام کے دوران آپ کالج کے سب سے سینئر ممبر ہونے کی حیثیت سے کالج کی ہر قسم کی سرگرمیوں مثلاً سوشل، لٹریری اور کھیلوں کے بھی انچارج رہے۔

آپ نہایت خوش لباس تھے۔ بہترین کپڑے کے عمدہ سلے ہوئے انگریزی سوٹ زیب تن فرماتے تھے اور سر پر رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ علمی اعتبار سے نہایت قابل ہونے کے علاوہ آپ اعلیٰ درجہ کے منتظم بھی تھے۔ پروفیسر ایس۔ ار۔ سوری جو اُس وقت پرنس آف ویلز کالج کے پرنسپل تھے، طالب علموں کے انضباط (Discipline) پر آپ کی بہت تعریف کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ جب آپ کلاس میں طلباء کو پڑھاتے ہیں تو کلاس کے کمرہ میں "پن ڈراپ سائی لینس" (Pin Drop Silence) ہوتا ہے۔ آپ کی ذہانت اور علمی بلندی کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی فلسفہ کے طالب علم نہ ہونے کے باوجود ۱۹۴۲ء میں فلسفہ پر ایک معرکتہ الآرا کتاب بعنوان Ideology of future لکھ ڈالی اور اُسے اپنے خرچ پر چھپوا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کر دیا — آپ کے بقول اُسے لکھنے سے پہلے خیالات کا تندوتیز طوفان اُن کے ذہن میں سمٹ آیا تھا۔ بے چینی نے اُن کے اعصاب کو متاثر کیا اور شدید علیل ہو گئے — اِنہیں دنوں اپنے ایک عزیز کے ہمراہ جموں میں سیر کو نکلے۔ ایک پہاڑی کے قریب ایک نورانی چہرہ والے بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ بے اختیار اُن کی طرف بڑھے۔ اُن بزرگ نے اِنہیں مخاطب ہو کر کہا کہ کتاب لکھنا شروع کر دیں۔ اِس مشورہ کو سنتے ہی اُنہیں یوں محسوس ہوا کہ دل سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ سکون کا سانس لیا اور یوں محسوس کیا کہ روح کو قرار آ گیا ہے۔ قلم اُٹھایا تو دو تین ہفتوں میں ایک کتاب تیار ہو گئی کہ اُنہوں نے اِس کا مسودہ مرے کالج سیالکوٹ کے پروفیسر لل کو جو کہ فلسفہ میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں دکھایا تو اُنہوں نے مشورہ دیا کہ اِسے کسی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے لئے پیش کر دیں۔ کتاب مکمل ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب مرحوم کی

صحت بحال ہو گئی۔ نہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کی ضرورت رہی نہ کسی دوا کی —"[۱]

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب کے لئے پروفیسر لل، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور سید ظفر الحسن ممتحن مقرر ہوئے — ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اعتراف کیا کہ یہ مقالہ علمی دنیا میں ایک ٹھوس اضافہ ہے۔ ڈاکٹر ظفر الحسن کی رائے یہ تھی کہ آج تک فلسفہ کی کوئی کتاب ان کی نظر سے ایسی نہیں گزری جو اسلام کے اِس قدر قریب ہو — پروفیسر لل نے اِس کو فرائڈ — ایڈلر — کارل مارکس اور میگڈوگل کے نظریات کا حتمی ابطال قرار دیا — اِس کتاب کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ میں جب یہ کتاب ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ڈگری کے لئے پیش ہوئی تو سنڈیکیٹ میں شامل بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ چونکہ ڈاکٹر صاحب فلسفہ میں ماسٹرز ڈگری کے حامل نہیں ہیں، اِس لیے اُنھیں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں ملنا چاہیے۔

اُس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک موجود تھے۔ اُنھوں نے اِس اعتراض کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اگر کوئی شخص فلسفہ میں ماسٹرز ڈگری کا حامل ہوتے ہوئے بھی فلسفہ میں ایسی معرکتہ الآرا کتاب نہیں لکھ سکا تو ڈاکٹر صاحب کو جنھوں نے فلسفہ میں ماسٹرز ڈگری حامل نہ ہونے کے باوجود ایسی کتاب لکھی ہے — ڈاکٹریٹ ضرور ملنی چاہیے۔ یہ اُن کی ذہانت اور علمی بلندی کا ایک بہت بڑا اعتراف تھا۔

آپ ۱۹۴۶ء میں سری کرن سنگھ کالج میرپور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ایک سال تک یہ خدمت انجام دی — ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کر لی — اِس اثنا میں حکومت پنجاب نے لاہور میں ایک ادارہ (Department of Islamic Reconstruction) قائم کیا تو ڈاکٹر صاحب اِس میں ریسرچ آفیسر مقرر ہوئے — اور ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک اِس ادارہ سے منسلک رہے۔ اِس کے بعد ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور میں خدمات سرانجام دیں — اِس دوران میں حکومت پاکستان نے آپ کو سول سروس اکیڈمی لاہور میں پروفیسر آف اسلامک سٹڈیز کے عہدہ کی پیش کش کی مگر اِس سے پہلے کہ آپ اِس عہدے کا چارج لیتے یہ آسامی ہی ختم کر دی گئی

۱۹۵۳ء میں حکومت پاکستان نے کراچی میں اقبال اکادمی پاکستان قائم کی تو ڈاکٹر

صاحب اِس کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ آپ ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک اقبال اکادمی پاکستان کے ڈائریکٹر رہے — اور ۱۹۶۵ء میں یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔ اقبال اکادمی میں ملازمت کے دوران آپ نے کئی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ایک "Manifesto of Islam" ہے۔ اِس کتاب کا عربی اور فارسی ترجمہ دمشق اور مشہد سے شائع ہو چکا ہے — اِس عرصہ میں آپ نے فلسفہ تعلیم پر "تعلیم کے ابتدائی اصول" — "First Principles of Education" کے نام سے ایک اور بلند پایہ کتاب تصنیف کی جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کو بھی دنیا بھر کے علمی حلقوں میں سراہا گیا۔ اِس علمی کام کے اعتراف کے طور پر ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی نے آپ کو فلسفہ تعلیم میں ڈی۔ لٹ کی ڈگری دی — یاد رہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں صرف دو ہی Doctors of Literature in Phicosophy تھے۔ پہلے ڈاکٹر رادھا کرشنن اور دوسرے ڈاکٹر رفیع الدین۔ اُن کی دوسری تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن اور علم جدید (اُردو)

۲۔ روح اسلام

۳۔ اسلامی نظریہ تعلیم

۴۔ Fallacy of Marxism

۵۔ پاکستان کا مستقبل

۶۔ حکمت اقبال

۷۔ اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار

۸۔ اسلام اور سائنس

۹۔ The meaning and purpose of Islamic research

۱۰۔ Potential contribution of Islam to World Peace

ڈاکٹر رفیع الدین کے پورے فکر کے دو ہی مرکزی خیال ہیں — جن کے گرد آپ کی تمام تصانیف کا تانا بانا قائم ہے — یعنی یہ کہ انسان کا صحیح نصب العین ایک ہی ہے — اور وہ ہے محبت خداوندی اور دوسرے یہ کہ نوع انسانی جس سمت سفر کر رہی ہے اِس کی بھی بس ایک ہی منزل ممکن ہے اور وہ ہے اسلام —

— آپ کے نزدیک مستقبل کی عالمگیر ریاست اسلام کی عطا کردہ سچی خدا پرستی کی بنیاد پر ہی قائم ہوگی اور یہ ریاست پاکستان ہی ہے — آپ کا یہ موقف واضح اور محکم تھا کہ یہاں نفاذ اسلام کے لئے اسلام کی صرف وہی تشریح کام دے گی جو علامہ محمد اقبال نے کی ہے۔ کیونکہ اسلام کی یہی تعبیر دورِ حاضر میں قابل عمل ہے بلکہ اِسی تعبیر میں یہ استعداد ہے کہ وہ مستقبل کی عالمگیر ریاست کی فکری اساس کا کام دے سکے۔

— ڈاکٹر رفیع الدین کو علامہ محمد اقبال سے والہانہ عشق تھا — اور اُن سے رابطہ ابتدا ہی سے قائم ہو گیا تھا — "اقبال نامہ" میں علامہ اقبال کا ایک خط ڈاکٹر رفیع الدین کے نام موجود ہے جو درج ذیل ہے —

۲۲ ستمبر ۳۲ء

جنابِ من! السلام علیکم

مجھے معلوم ہے اِس قسم کے دستاویز آپ کے پاس ہیں۔ لیکن اگر وہ پوشیدہ رہیں تو اُن کا کیا فائدہ ہے؟ مجھے آپ اُن کے اصل بجھوا دیجئے تو میں اُن سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی صورت نکالوں اور تصفیہ بعض اُمور کے جن کی تشریح اِس خط میں ضروری نہیں، وہ تمام کاغذات آپ کو واپس دے دوں گا — محمد اقبال

(یہ کاغذات قضیہ کشمیر سے متعلق تھے) (۲)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ۱۹۶۶ء میں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کی بنیاد ڈالی اور اپنی زندگی کے آخری دو سال اُس ادارہ کی ترقی و ترویج کے لئے وقف کئے رکھے — اُس ادارہ کا بنیادی مقصد تعلیم کو اسلامی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لئے علمی تدابیر وضع کرنا اور اُنھیں حکومت تک پہنچانا اور اُن کے نفاذ کے لئے عملی کوشش کرنا ہے — آپ نومبر کی ۱۹۶۹ء میں کراچی میں ٹریفک کے ایک اندوہناک حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہِ راجعون

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اِن کی وفات پر کہا تھا کہ اقبال کا صحیح نمائندہ وفات پاگیا۔ اُنھوں نے علامہ محمد اقبال کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین کو عظیم فلسفی کا درجہ دیا۔

ممتاز دانش ور ڈاکٹر ضیاء الدین سردار کے نزدیک:

"— علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین بیسوی صدی کے عظیم فلسفی ہیں۔ اُنہوں نے اپنی کتاب "اسلامی مستقبلیات" "Islamic Future" میں لکھا ہے کہ علامہ اقبال کی کتاب "ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام" اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تصنیف (Ideology of the future) اسلامی علم و حکمت کے دو ایسے کارنامے ہیں جن سے بہت زیادہ اغماض برتا گیا ہے۔ دونوں اپنے وقت سے برسوں آگے تھے۔ اُنہوں نے ایسی کتابیں لکھی ہیں جو مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہیں۔ اِس لٹریچر کی تخلیق کی تحریک الغزالی کی احیاء العلوم الدین سے ہوئی جو گیارہویں صدی کی تصنیف ہے اور جس کے ذریعے الغزالی نے اپنی بصیرت کے ذریعے مسلم تہذیب کی تعمیرِ نو کے لئے اسلام کی اصل روحانی اور اخلاق اقدار کا احیا کرنا چاہا — الغزالی کی زندگی اور اُن کے عہد میں مسلم تہذیب اپنے داخلی مسائل میں اُلجھی ہونے کے باوجود دنیا کی ایک نمائندہ تہذیب تھی۔ لہٰذا الغزالی کے لئے روحانی اور سماجی معاملات پر توجہ دینا ایک قدرتی امر تھا۔ لیکن علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کو اپنے دور کے مسلمانوں کے لئے لکھنا پڑا جن کا معاشرہ اپنی اساس سے ہی محروم ہو چکا تھا اور مسلمان ایسے اجنبی ڈھانچوں۔ معاشرتی نظاموں۔ ثقافی ماحولوں اور پیداواری ڈھانچوں اور طریقوں کی صورتِ احوال میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جن کی اسلامی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اِس اعتبار سے اُن کا کام کرنا زیادہ مشکل تھا۔"

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کہنا ہے کہ انسان کی اصل خودی ہے — لکھتے ہیں:

"— اِس طرح انسان کی خودی (Human self consciousness) جو اِس کے مخصوص قویٰ اور اوصاف اور افعال کا منبع اور ماخذ ہے اور جس کا ظہور انسان کے ارتقاء کا آخری نتیجہ ہے۔ اسی کائنات کی خودی کی صورت میں انسان کی اصل بھی ہے۔ وہ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے بھی موجود تھی۔ اِس نے اپنے اوصاف کے اظہار کے لئے کائنات کے درخت کو ارتقائی منازل سے گزارا ہے — اِس ارتقا کے آخری نتیجہ کے طور پر اِس

درخت میں ایک پھول کا ظہور ہوا ہے۔ جسے ہم انسان کہتے ہیں اور جس میں خودی کائنات کے اوصاف کا عکس موجود ہے۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے ۳۱

یعنی ڈاکٹر محمد رفیع الدین — اقبال کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں — اِس سلسلہ میں اپنی کتاب "پاکستان کا مستقبل" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

" — میں نے اپنی کتاب "آئیڈیالوجی آف فیوچر" میں اقبال کے تصورِ خودی کی منظم تشریح کرتے ہوئے اُس کو اُس کے آخری نتائج تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا تو رجحانات ارتقاء کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ حقائق فطرت ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ زود یا بدیر عالمِ انسانی میں ایک ایسی ریاست وجود میں آئے گی جو نہایت اخلاص کے ساتھ اسلام کے بنیادی اُصولوں کو اپنا سیاسی نظریہ بنائے گی اور پھر یہ ریاست رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور اِس کے ذریعے سے آدم اپنے انتہائی عروج کو پہنچے گا — " ۳۲

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب "پاکستان کا مستقبل" کا عندیہ یہ ہے کہ کس طرح اسلام ایک کامل اور پائیدار نظام تصورات ہے جو آخرکار اشتراکیت اور دوسرے نظام ہائے تصورات کو مٹا کر دنیا میں پھیل جائے گا۔ مسلمانوں کے موجودہ انحطاط کے حقیقی اسباب کیا ہیں اور کیونکر پاکستان اِس انحطاط کو بدل کر اسلام کی آخری فتح اور دنیا کی مستقل نجات کا موجب ہو گا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے اُن خیالات و نظریات کو بیان کریں جو وہ علامہ محمد اقبال کے حوالہ سے اسلام اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں رکھتے ہیں — ڈاکٹر رفیع الدین لکھتے ہیں:

" — اِس زمانہ میں مغرب کے غلط تصورات کے خلاف اسلام کا قدرتی ردِ عمل اقبال کے فلسفہ خودی کی صورت میں نمودار ہوا ہے اور اِس کا مقصد یہ ہے کہ اِن تصورات کو مردہ اور بے آخر کر کے دنیا کی آخری قوم کو ایک نئی زندگی اور نئی قوت دی جائے اور پھر اِس سے موجودہ دنیا کی اصلاح کا

کام لیا جائے۔ فلسفہ خودی کی صورت میں حق زمانہ کے باطل کے خلاف نبرد آزما ہوا ہے تاکہ اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دے — اور صرف اسلام کو نہیں بلکہ تمام دنیا کو اِس سے نجات دلائے چونکہ باطل نے فلسفہ کی صورت اختیار کی تھی اِس لئے حق نے بھی ایک فلسفہ کی صورت اختیار کی اور چونکہ باطل تازہ علوم اور جدید طرزِ استدلال سے آراستہ تھا اِس لئے حق بھی اِس کے مقابلہ میں تازہ علمی حقائق اور علمی طرزِ استدلال سے آراستہ ہوا ہے تاکہ باطل کو اِس کے اپنے ہی آلات اور اسلحہ کی مدد سے شکست دے۔"

اقبال میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو خاتم النبیین کی اُمت کے کس فرد کو اِس زمانے کا غلط تصورات کے خلاف حق و صداقت کے قدرتی عمل کا آلہ کار بننے کے لئے موزوں بنا سکتی تھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مغرب کے فلسفیانہ تصورات کے تار و پود سے بخوبی واقف تھا اور یہ واقفیت اِسے اِن تصورات کے نیک و بد کی پہچان کے اہل بناتی ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

جز تو اے دانائے اسرار فرنگ
کس نکو ننشست در نارِ فرنگ
طلسم علم حاضر را شکستم
ربود دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم
بہ نارِ او چہ بے پردہ نشستم

دوسری بات یہ ہے کہ تصوف اور خدا پرستی کے ساتھ ایک خاندانی مناسبت رکھنے کی وجہ سے اِسے دین کا علم (جو درحقیقت ایک قسم کی روحانی استعداد ہے اور مطالعہ کتب پر موقوف نہیں) حاصل تھا۔ اقبالؒ سے آتش سینہ عشق — ذوق نگاہ، تب و تاب، بادۂ ناب وغیرہ الفاظ سے تعبیر کر کے اِس کا مدعی ہے ؎

حلقہ گردِ من زنید اے پیکران آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

....

عشق و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

....

اے پسر ذوقِ نگاہ از من بگیر
بعد زیں ناید چو من مرد فقیر

....

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں

یہ عشق یا ذوقِ نظر اقبال کی اہم ترین اور سب سے زیادہ مایہ ناز استعداد تھی کیونکہ اِس کے بغیر مغربی فلسفہ کی واقفیت اُسے فائدہ نہ دے سکتی اور وہ مغربی تصورات کا صحیح تجزیہ نہ کر سکتا۔ اقبال اِس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ دنیا کے آخری اور عظیم ترین فلسفہ کا موجد ہے تاہم اپنے آپ کو فلسفی نہیں کہتا بلکہ ایک درویش، مرد فقیر، یا قلندر کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اِس کا فلسفہ کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں بلکہ وہ اِس کے جذبہ ایمان کی عقلی توجیہ اور تشریح ہے لیکن دنیا کے اعلیٰ ترین اور عقلی اور منطقی طور پر صحیح ترین فلسفہ کا امتیازی نشان بھی یہی ہے۔

تیسرے اُسے شعر کا ملکہ حاصل تھا جس کی بدولت وہ اپنے مطلب کا اظہار نہات موثر طریق سے کر سکتا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ شعر کی وجہ سے اِس کا فلسفہ اِس کی زندگی میں ایک منظم صورت اختیار نہ کر سکا۔ لیکن اگر اقبال اپنے خیالات شعر میں بیان نہ کر سکتا تو اِس کی تعلیم اِس سرعت کے ساتھ دلوں پر اثر انداز نہ ہوتی جس کی اِس وقت قوم کی خطرناک حالت کے پیش نظر ضرورت تھی۔ جس قدر مرض شدید اور گہرا تھا، ضروری تھا کہ اِس کا علاج بھی اِس قدر طاقتور اور سریع الاثر ہوتا۔ پس قدرت نے دوا کی تاثیر کو اِس بدرقہ یعنی شعر کے ساتھ اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ اقبال خود کہتا ہے۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقہ بے زمام را

اقبال نے اسلام کے نئے ظاہر ہونے والے فلسفہ کو گایا اور شعر کے اثر سے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو فی الفور جمع کر دیا۔ اگرچہ ابھی طلسم فرنگ پوری طرح سے نہیں ٹوٹا اور ہمیں نہ اپنی منزل اور نہ اپنی راہ صاف طور پر دکھائی دیتی ہے — لیکن ہم کسی منزل کی طرف چل نکلنے کے لئے اکٹھے ضرور ہو گئے ہیں — قریب ہے کہ ہم راہ کو بھی — ڈھونڈ نکالیں اور منزل کا نشان پا کر اس کی طرف چل نکلیں اب جب کہ ہماری موت کا فوری خطرہ ٹل گیا ہے۔ فلسفہ خودی زیادہ منظم اور زیادہ واضح صورت میں سامنے آئے گا — اسلام کا وہ قدرتی رد عمل جس کا آغاز اقبال کی ذات میں ہوا تھا — جب تک اپنے کمال کو نہ پہنچے اور اپنے مقصد کو نہ پا لے، رک نہیں سکتا — بلکہ اب اقبال ایسے شارحین کو اپنا آلہ کار بنائے گا۔ جن پر وہی قلبی واردات نازل ہوں گی جو اقبال پر نازل ہوئی تھیں — اور متواتر بڑھتا اور زور پکڑتا رہے گا تا آنکہ مغرب کے بیہودہ فلسفیانہ تصورات نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ صفحہ عالم سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔ (ترجمہ)

بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں۔ پس وہ باطل کو کچل ڈالتا ہے تا آنکہ باطل ناگہاں مٹ جاتا ہے (قرآن حکیم) اور قدرت نے اقبال ہی کی معرفت اس کے ہمراز شارحین کی آمد کے لئے زمین ہموار کی ہے — تاریخ گواہ ہے کہ ہر بڑے فلسفی کو اس کے شارحین نے ہی عظمت کا جامہ پہنایا ہے — یہ بات اقبال کی صورت میں بھی پوری ہو گی — اقبال کے کئی اشعار ایسے ہیں جن میں وہ بڑے درد اور اشتیاق کے ساتھ اپنے رازدان شارحین کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔ یہ رباعی جو اس کے آخری اشعار پر مشتمل ہے اس کے درد بھرے انتظار کا پتہ دیتی ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید (۵)

اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین بلاشک و شبہ اقبال کے "دگر دانائے راز" تھے۔

حواشی

۱۔ راقم کے نام اُن کے بیٹے صلاح الدین محمود کا خط۔
۲۔ اقبالنامہ ۲: ۲۴۳
۳۔ اسلام کا نظریہ تعلیم صفحہ ۲۲۔ ۲۳
۴۔ "دیباچہ" پاکستان کا مستقبل
۵۔ پاکستان کا مستقبل صفحات ۷۵ تا ۸۰

علامہ اقبال — ڈاکٹر تاثیر — اور کشمیر

اگر آغاز گفتگو میں ہی یہ کہہ دیا جائے کہ ڈاکٹر تاثیر کا اوائل عمر ہی میں کشمیر سے تعلق پیدا ہو گیا تھا تو غلط نہ ہو گا اور یہ تعلق تازیست قائم رہا۔ تاثیر امرتسر سے لاہور بارود خانہ میں اپنی خالہ صاحبہ کے ہاں آئے تو اُس وقت "انجمن کشمیری مسلمانان" قائم ہو چکی تھی اور علامہ محمد اقبال بھی اِس انجمن کے ایک رکن تھے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے خالو کا نام میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور تھا جو ممتاز افسانہ نگار ایم اسلم مرحوم کے والد ماجد اور میاں امیر الدین کے تایا اور خسر تھے اور بقول عبدالرحمن چغتائی میاں نظام الدین نے تاثیر کی پرورش کا ذمہ اُٹھایا تھا وہ خود ایک بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ خدا نے اُنہیں تدبر اور نیکی عطا کی تھی، عربی، فارسی اور اُردو کے وہ فاضل تھے، عبادت اُن کی زندگی کا ایک اعلیٰ مشغلہ تھا۔ یہ تمام اوصاف اُن کی تربیت نے نو عمر محمد دین کو ودیعت کئے تھے اِس اعتبار سے کشمیر اور کشمیریوں کے مسائل و معاملات سے آگاہی ڈاکٹر تاثیر کو شروع میں ہی ہو گئی تھی کیونکہ اُن کا گھر کشمیری سیاسیات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

"انجمن کشمیری مسلمانان" نے کشمیر کے قحط اور سیلاب سے ستائے ہوئے مسلمان طلبہ کو تعلیمی وظائف دیئے۔ علامہ محمد اقبال کا "بارود خانہ" میں آنا جانا تھا۔ اِس ضمن میں خود ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں "اُن دنوں اکبر و اقبال کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ علامہ اقبال ہمارے گھر کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک دفعہ اُن کے سامنے جنبہ داری کے انداز میں اکبر کی مبالغہ آمیز تعریف کی تو اُنہوں نے میرے ذوقِ شعر کی تعریف کی۔ اِس پر مجھے بڑی ندامت ہوئی۔"[1]

یہ وہ دور تھا جب محمد الدین فوق مرحوم کشمیر کے موضوعات پر رسائل اور کتابیں لکھتے تھے اور علامہ اقبال نے اُنہیں "مجدد الکشامرہ" کا خطاب دیا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا کشمیر سے تعلق آبائی تو تھا ہی، وہ بھی اوائل عمر ہی سے کشمیر کے اُمور و مسائل سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اِنہی ایام میں شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے تعلیمی وظیفہ پر اسلامیہ کالج لاہور میں بی ایس سی میں داخلہ لیا۔ اُن کا اِس کالج میں قیام ۲۵ء سے ۱۹۲۶ء کے اواخر تک رہا اور اُنہی دنوں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا اسلامیہ کالج میں بطور لیکچرار کے تقرر ہوا تھا اور یوں ان دونوں کے استاد، شاگرد کے تعلقات قائم ہوئے۔ پھر ڈاکٹر محمد دین تاثیر ہی نے شیخ محمد عبداللہ کو لاہور میں علامہ اقبال سے متعارف کرایا۔ اپنے قیام لاہور کے دوران شیخ محمد عبداللہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور اِسی ماحول نے اُن کے سیاسی شعور کو جلا بخشی۔

۱۹۳۰ میں جب تحریک حریت کا آغاز ہوا تو اُس وقت بھی ڈاکٹر تاثیر سرگرم عمل تھے۔ چونکہ اُن کا علامہ اقبال سے تعلق تھا اور ۱۹۲۷ء کے انتخابات میں جب علامہ اقبال پنجاب کونسل کی نشست کے لئے کھڑے ہوئے تو ڈاکٹر تاثیر کے سپرد پبلسٹی اور دفتر کا کام تھا۔ پھر جب آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم ہوئی تو ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں

"میں اِس کمیٹی کی روئداد لکھا کرتا تھا اور امام جماعت قادیان سے تعلقات بگڑنے کے مراحل بغور دیکھے۔"[۲]

۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک علامہ اقبال کشمیری سیاسیات سے دلچسپی لیتے رہے۔ اِن مہ و سال میں یعنی ۱۹۳۳ء کے اواخر میں ڈاکٹر تاثیر اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن تشریف لے گئے جہاں سے ۱۹۳۷ء میں واپس آئے اور ایم، اے او کالج امرتسر میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۱ء کے اواخر میں آپ کا تقرر سری پرتاب کالج سری نگر میں بحیثیت پرنسپل ہو گیا۔ اِس وقت ریاست کے وزیر داخلہ نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی تھے۔ پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ لکھتے ہیں کہ جب ڈاکٹر تاثیر کے تقرر کی خبر پہنچی تو ہندو پریس اور مقامی ہندو لیڈر سب چوکنے ہو گئے اور ہندو مہا سبھائی حلقوں نے تیاری کر لی کہ کالج کے اسی فی صد طالب علم ہندو ہوں اور پرنسپل مسلمان، اِس اندھیر کا مقابلہ ہونا چاہئے۔ طے یہ پایا کہ ڈاکٹر تاثیر کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کیا جائے۔ مقامی سیاست پر

اُس وقت شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کا اثر بہت نمایاں تھا۔ شیخ صاحب نے ڈاکٹر تاثیر کے تقرر کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر تاثیر ترقی پسند ادیب اور سوشلسٹ نظریات کے حامی، فسطائیت اور آمریت کے مخالف تھے۔ بس یہ خوبیاں شیخ صاحب کی خوشنودی کی ضمانت تھیں۔

پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ لکھتے ہیں کہ:

پروفیسر طلبہ اور اراکین عملہ نے تاثیر صاحب کی پرزور حمایت کا فیصلہ کر لیا اور گرمئ محفل کا یہ حال دیکھ کر برادرانِ وطن کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ تاثیر جب آئے اور چارج لے کر اِس اطمینان سے کام شروع کر دیا گویا وہ مقامی حالات و مزاج سے برسوں سے واقف ہیں۔ تاثیر صاحب کا پرنسپل دور ایک یادگار دور بن گیا۔ مسلمان تو اُن کی ہمدردی و شفقت کے ممنون تھے، ہندو سٹاف اور مقامی ہندو راہنما بھی اُن کی عالمانہ حیثیت اور مدبرانہ قابلیت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک استاد کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کی تحریک پر طے ہوا کہ کالج کے روز افزوں کثرتِ تعداد طلبہ کے پیش نظر ڈگری کلاسیں الگ کر دی جائیں اور ایک نیا کالج قائم کر دیا جائے۔ حکومت سے منظوری ہوئی اور ہفتہ بھر میں سب انتظام مکمل ہوئے۔ امر سنگھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی وسیع عمارت میں کالج قائم ہوا۔ تاثیر صاحب اِس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔"

تاثیر صاحب نے کالج کا چارج سنبھالتے ہی مسلمان طلبہ کی تعداد میں اضافہ کی مہم شروع کر دی۔ اِس میں اُنھیں جناب شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقاء کی وجہ سے مقامی مسلمان والدین سے پورا تعاون حاصل ہوا، وظائف، فیسوں کی معافی، کتابوں اور کپڑوں کے لئے امداد، ہوسٹل میں مفت کھانے کا انتظام، سب کچھ ہوا اور یہ راز نہ کھل سکا کہ اِس قدر دریا دلانہ امداد کا منبع کیا ہے؟"

ریاست جموں و کشمیر میں ڈاکٹر تاثیر کے طلبہ کے ساتھ ہمدردی کے قصے اب زبانِ زد خواص و عام بن چکے ہیں۔ اُنھوں نے کالجوں میں ادبی ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے ادبی مجلسوں کا اجرا کیا۔ اِس سلسلہ میں مولانا محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں"

"جن دنوں ڈاکٹر محمد دین تاثیر سری پرتاب کالج سرینگر کشمیر کے پرنسپل

تھے انھوں نے کالج میں اُردو سبھا قائم کی اور اپنے علم اور تجربے سے اُسے اُردو کے لئے ایک زبردست انجمن بنا دیا۔ ۱۹۴۲ء میں اُن کی تجویز سے اُردو سبھا نے ایسے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو طلبہ کے لئے نظم و نثر کا نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ اُس میں ایک جدت یہ بھی تھی کہ کلامِ اقبال پر چند مروجہ اعتراضات مشہور ادیبوں کی خدمت میں بھیج کر اُن سے جوابات طلب کئے۔" (۳)

کشمیر میں تعلیمی محاذ پر گرانقدر خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں بھی مصروفِ عمل رہے اور بقول پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ جب ۱۹۴۲ء میں نیشنل کانفرنس نے اپنا آئینی منصوبہ "نیا کشمیر" کے نام سے تیار کیا تو اُردو زبان کو ریاست جموں و کشمیر کی واحد قومی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ اِس منصوبہ کے مصنف مشہور کمیونسٹ بی، پی، ایل بیدی (بی، اے آکسن) تھے لیکن اِس کے تمدنی حصہ کی ترتیب میں تاثیر صاحب کے مشوروں کو بہت دخل تھا۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں ڈاکٹر تاثیر کشمیر سے واپس آئے۔ حکومت ہند نے اُنہیں ڈائریکٹر کی حیثیت سے جنگ عالمگیر کے ایام میں جوابی پروپیگنڈا کے لئے لے لیا تھا اور ۱۹۴۷ء تک دہلی میں مقیم رہے۔ مگر اِس عرصہ میں کشمیری سیاسیات میں جو اہم واقعات ہوئے۔ اُن میں ۱۹۴۴ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی کشمیر میں تشریف آوری ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ریاست کی سیاسیات میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی حمایت کی اور نیشنل کانفرنس کے اندازِ سیاست کو پسند نہ کیا جو بقول مولانا عبدالمجید سالک کے کہ شیخ محمد عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی اور پسِ دیوارِ زنداں چلے گئے۔

اُن ایام میں ڈاکٹر تاثیر نئی دہلی میں مقیم تھے اور لاہور میں اُن کے دوست شیخ محمد عبداللہ کی تحریک کی حمایت کر رہے تھے بلکہ بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق تو لاہور میں آ کر تحریک کشمیر چھوڑ دو کا پراپیگنڈا کر رہے تھے جن کی ترقی پسند مصنفین حمایت کر رہے تھے۔

اُدھر دہلی میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر مقیم تھے اور وہ قائداعظم محمد علی جناح سے وقتاً

نوتتا ملتے رہتے تھے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر تاثیر نے اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا ہے کہ تیسری بار دہلی میں حاضر ہوا۔ اِس وقت وہ قائداعظم تھے۔ دہلی میں کشمیر کے سلسلہ میں بات ہوئی۔ مجھے اُنکے طریق کار سے اطمینان نہیں تھا اور اِسے خلاف مصلحت سمجھا۔" (۴)

ڈاکٹر تاثیر کے کشمیری سیاسیات میں کردار کے بارے میں مولانا عبدالمجید سالک نے یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے کشمیر کے سلسلہ میں نہایت قیمتی خدمات انجام دیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ کبھی وقت آئے گا تو معلوم ہو گا کہ اگر تاثیر کے مشورہ پر عمل کر لیا جاتا تو کشمیر کا قضیہ پیدا نہ ہوتا۔ (۵)

بہرحال اپریل ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر تاثیر دہلی سے لاہور آئے۔ پھر ۳ جون ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا اعلان ہو اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور مہاراجہ جموں کشمیر جو اپنی ریاست کو آزاد خود مختار رکھنا چاہتا تھا نے پاکستان سے "جوں کا توں" معاہدہ کر لیا مگر بھارت نے ایسا معاہدہ نہ کیا البتہ گاندھی جی سرینگر گئے اور اُنہوں نے مہارانی کشمیر کی وساطت سے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرا لیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ رہا کر دیئے گئے اور جب ڈاکٹر تاثیر کو اِس بات کا علم ہوا تو اُنہوں نے مسلم لیگ کی حکومت کو کہا کہ شیخ محمد عبداللہ سے بات کرنا چاہئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں تحریک "کشمیر چھوڑ دو" کی اگر کھل کر مخالفت نہیں کی تھی تو اُس کی حمایت بھی نہیں کی تھی جبکہ کانگرس نے اِس تحریک کا پورا پورا ساتھ دیا تھا اور پنڈت جواہر لال نہرو سرینگر گئے تھے اور آصف علی نے شیخ محمد عبداللہ کے مقدمہ بغاوت کی پیروی کی تھی۔ بہرحال ڈاکٹر تاثیر اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر سرینگر پہنچے اور ۲ اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ کو اُن کی رہائش گاہ سورہ میں ملے۔ پھر دوسری میٹنگ میجسٹک ہوٹل میں ہوئی جس میں خواجہ غلام محمد صادق اور خواجہ غلام محی الدین قرہ شامل ہوئے۔ ڈاکٹر تاثیر نے تیسری ملاقات ریاست کے ممتاز صحافی اور سیاست دان پنڈت پریم ناتھ بزاز ایڈیٹر "ہمدرد" سے کی جو ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی تھے۔ بہرنوع ڈاکٹر تاثیر ۳ اکتوبر کو جب واپس لاہور آئے تو اپنے ساتھ خواجہ غلام محمد صادق کو لائے تاکہ وہ پاکستانی لیڈروں سے بات چیت کریں اور مسلم لیگ ہائی کمان سے شیخ محمد عبداللہ کے مذاکرات کی راہ ہموار کریں۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ اُس وقت لاہور کے اخبارات جن میں "زمیندار" سرفہرست

تھا یہ لکھ رہا تھا کہ "شیر کشمیر کو گرفتار کر لو" — اور — "کشمیر پر یلغار کر دو" اِس صورت حالات سے شیخ محمد عبداللہ پریشان تھے۔ اِس ضمن میں مولانا عبدالمجید قریشی ایڈیٹر جمہور جموں لکھتے ہیں:

"۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو امیرا کدل میں مولوی محمد سعید سعودی (جنرل سیکرٹری نیشنل کانفرنس) کا یہ پیغام ملا کہ شیخ محمد عبداللہ کا یہ حکم ہے کہ میں فوراً لاہور روانہ ہو جاؤں اور اِس گفتگو میں حصہ لوں جو لاہور میں جی ایم صادق اور مسلم لیگی حکومت میں ہو رہی ہے اِس کے ساتھ ہی شیخ صاحب کی یہ ہدایات بھی مجھے بتلائی گئیں کہ اِس گفتگو کو کسی قیمت پر بھی ٹوٹنے نہ دیا جائے۔"

قریشی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

"۲۲ اکتوبر کو جب میں راولپنڈی سے لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا تو یہ خبر آئی کہ قبائلی لشکر کشمیریوں کی امداد کے لئے مظفر آباد پہنچ گیا ہے۔ میں ۲۲ اکتوبر کو لاہور پہنچ گیا لیکن میرے پہنچنے سے ایک گھنٹہ قبل قبائلیوں کے داخلے کی خبر سن کر خواجہ غلام محمد صادق وغیرہ ہوائی جہاز میں دہلی جا چکے تھے۔"

فیض احمد فیض کا یہ کہنا ہے کہ

"صادق صاحب تاثیر کے ساتھ لاہور آ گئے۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں حفیظ جالندھری صاحب کے یہاں ٹھہر گئے لیکن دن بھر وہ ہمارے دفتر میں رہے۔ ہم نے ممدوٹ صاحب وغیرہ سے اُن کی ملاقات کا انتظام کیا۔ ہماری خواہش یہ تھی کہ وہ قائداعظم سے ملیں کیونکہ اِس سطح پر کوئی بامقصد بات ہو سکتی تھی۔ لیاقت علی خاں نے بھی یہی کہا تھا کہ اتنے اہم معاملہ پر جناح صاحب کو ہی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے لیکن بعد میں لیاقت علی خاں اور قیوم خاں وغیرہ گھبرا گئے۔ وہ دراصل اِس سارے سلسلے کو سبوتاژ کرنے کے ارادے باندھ چکے تھے چنانچہ صادق صاحب کو اعلیٰ پاکستانی قیادت سے ملانے کی ہماری کوششیں جاری ہی تھیں اور جناح صاحب کا کوئی جواب نہیں ملا تھا کہ لیاقت علی خاں نے قبائلیوں کے ذریعے کشمیر پر حملہ کرا لیا۔ ایسا اِس لئے کیا گیا تاکہ

بات چیت کا یہ سارا سلسلہ ختم ہو جائے۔"

۱۹۴۸ء میں اُنہیں وزارت اُمور کشمیر میں پبلسٹی ڈائریکٹر مقرر کیا گیا اور آپ آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خاں کے ہمراہ ادارہ اقوام متحدہ میں گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سردار محمد ابراہیم خاں نے لکھا ہے کہ کشمیری جدوجہد میں تاثیر کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے۔ لیک سیکس (امریکہ) میں یو این او کا اجلاس ہو رہا تھا۔ پاکستانی وفد میں چوہدری محمد علی بھی تھے جو اِس وقت حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے اور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک لاہور اسلامیہ کالج میں شیخ محمد عبداللہ کے ہم جماعت بھی تھے اور دونوں ہوسٹل کے ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے لیک سیکس میں اُن دونوں کی خفیہ میٹنگ کرا دی۔ اِس سلسلہ میں شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے بیگم بلقیس تاثیر کو اگست ۱۹۸۰ء میں سرینگر میں بتایا کہ تقسیم ملک کے بعد میری امریکہ میں ڈاکٹر تاثیر سے دوسری ملاقات تھی۔ تاثیر خود کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُنہیں کشمیر سے بہت محبت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ پر امن ذرائع سے حل ہو جائے مگر اِس وقت یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا بلکہ اب تک حل طلب ہے۔

ڈاکٹر تاثیر کے کشمیر میں سماجی تعلقات ہر طبقہ کے لوگوں سے تھے۔ البتہ اُن کے ذاتی دوستوں میں شیخ محمد عبداللہ اور ڈاکٹر نور حسین مرحوم تھے جو وہاں پر ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز تھے اور نہایت عالم فاضل اور سخن شناس انسان تھے۔ خواجہ محمد صادق اور ڈی۔ پی دھر بھی اُن کے مداحین میں سے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر گرمیوں کی تعطیلات میں اکثر کشمیر جاتے تھے اور اُن کا قیام گلمرگ میں ہوتا تھا۔ اُن کو کشمیر سے کس قدر محبت تھی اُس کا اظہار اُنہوں نے اپنی ادبی تحریروں میں بھی کیا ہے اپنے ایک افسانے "شاہکار" میں اُن کے ایک جملہ سے اُن کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کاؤسہ مجھے اُمید ہے کہ کسی نہ کسی دن میں سرینگر جا کر ڈل کی تصویر اُتاروں گی۔"

ڈاکٹر تاثیر نے ایک ناول بھی لکھا تھا جس کا نام "کنول" ہے اِس میں ڈاکٹر تاثیر نے ۱۹۴۷ء اکتوبر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ راقم چونکہ اُن دنوں وہاں ہی تھا اور اُسی جگہ کا مکین ہے جس کا ذکر ڈاکٹر تاثیر نے کیا ہے اِس لئے جو تصویر کھینچی ہے وہ ہو

بھو اُسی ماحول کی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب پونچھ میں مجاہدین نے سرگرمیاں شروع کر دی تھیں اور ڈوگرہ حکومت حریت پسندوں کو پکڑ پکڑ کر لا رہی تھی اور ریاست میں پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے ناول کے ہیرو کی زبانی یہ کہا ہے کہ

"ہوا یہ کہ ۱۹۴۷ء کی گرمیوں میں حسب عادت میں کشمیر پہنچ گیا۔ اکیلا آدمی آج گل مرگ تو کل پہلگام۔ کبھی وادیوں میں۔ کبھی پہاڑوں پر، برف زاروں، دریاؤں، جھیلوں، باغوں اور بنگلوں کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ ایک دن سرینگر میں گھوم رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ایک لاری میں کچھ لوگ بند ہیں۔ اُن پر مسلح فوجی پہرہ ہے اور وہ لوگ بار بار پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ معلوم ہوا پونچھ کے لوگ ہیں۔ اُنہیں یہاں کے قید خانے میں لے جا رہے ہیں کیونکہ پونچھ کے قید خانے بھر گئے ہیں۔ اُن میں جگہ نہیں رہی۔ ایک لاری کے گزرنے کے بعد دوسری لاری آئی اور اُس میں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ بلند ہوا تو امیرا کدل کے چوک میں کھڑے ہو کر میں نے بھی وہی نعرہ دہرایا۔"

ڈاکٹر تاثیر نے "مناجات" بہ انداز شکوہ اقبال لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی ہے۔

اے خدا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں
التجا عرض تمنا میں کروں یا نہ کروں

اِس مناجات میں بھی وہ کشمیر کو نہیں بھولے فرماتے ہیں،

ان سے جمہور نپٹ لیں گے کسی دن یارب
ان کو معقول سزا دیں گے کسی دن یارب
آج تقدیر نے کچھ اور طرح ڈالی ہے
یعنی کشمیر نے کچھ اور طرح ڈالی ہے
اے خدا تجھ کو قسم ہے تیرے دیوانوں کی
تیرے محبوب کے انوار کے پروانوں کی
قوم کی راہ میں مر جانے کے ارمانوں کی
یہ بتا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

ادارہ اقوام متحدہ سے واپسی کے بعد ڈاکٹر تاثیر اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہاں پر اُنہوں نے کشمیری مہاجر طلباء کی ہر طرح سے امداد و اعانت کی۔ کشمیری

لیڈر اُن سے صلاح و مشورہ کے لئے برابر تشریف لاتے رہے۔ لیکن افسوس ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنا للہ و اِنا علیہ راجعون

علامہ اقبالؒ اور صاجزادہ محمد عمر (نور الٰہی)

جموں و کشمیر کے مایہ ناز فرزند صاجزادہ محمد عمر مرحوم کا شمار زبانِ اُردو کے اُن چند عظیم المرتبت ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا ہے جن کا قلم اُردو ادب میں صنف ڈراما کو اِس کا جائز مقام دلانے کے لئے عمر بھر چلتا رہا۔

جس زمانے میں صاجزادہ محمد عمر نے اُردو ڈراما کی طرف توجہ مبذول کی، اُس وقت سٹیج ڈراما کی باگ ڈور "میراثیوں اور بھانڈوں" کے ہاتھوں میں تھی جو نہ صرف یہ کہ اِس صنف سخن کی فنی خوبیوں سے ناواقف تھے بلکہ اُنھیں زبان کی ندرت، مکالمہ کی ادائیگی، کہانی کے نقطۂ عروج اور کردار نگاری کا علم تک نہ تھا۔ اُن کا مقصد محض اپنے ناظرین کو سوقیانہ مذاق، عجیب و غریب قصوں اور رقص و سرود سے محظوظ کرنا ہوتا تھا۔ یہ باتیں عام لوگوں کے لئے تو کسی حد تک تفریح طبع کا سامان مہیا کر دیتی تھیں مگر ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔ چنانچہ ڈراما کے فن کی اصلاح کے لئے جن ادیبوں نے اِس موضوع پر سب سے پہلے قلم اُٹھایا اُن میں مولوی محمد حسین ساکن جماسرائیں، علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی، مولانا ظفر علی خاں، لالہ کنور سین، چیف جسٹس جموں و کشمیر ہائی کورٹ، صاجزادہ محمد عمر اور اُن کے رفیق قلم منشی نور الٰہی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اُن بزرگوں کے مضامین ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک برصغیر کے مختلف ادبی اور علمی رسائل و جرائد میں طبع ہوتے رہے، جن میں "منروا" امرتسر، "سرسوتی" لاہور، "دکن ریویو" حیدر آباد دکن اور "تحریک" لاہور کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ محققین فن ڈراما اور ادبی ناقدین نے اُنکی تحریروں اور کاوشوں کو اُردو ڈراما کے نئے دور کی

بنیاد ٹھہرایا ہے۔

اِس ادبی تحریک نے بلاشک و شبہ نئے لکھنے والوں کے ذہنوں پر گہرے نقوش مرتب کئے اور اُنھوں نے اِس کام کو آگے بڑھایا۔ یہ بات درست ہے کہ جب ہم اُردو ڈراما کا موازنہ کسی غیر ملکی زبان کے ڈراما سے کرتے ہیں تو ہمیں اپنا ادبی اثاثہ اور معیار مثالی نہیں دکھائی دیتا، مگر دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اِس میدان میں ہمارے فن کاروں کی محنت، کاوش اور ریاضت کی عمر کتنی ہے اور یہ کن حالات اور نشیب و فراز سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔

"اُردو ادب کی تاریخ" کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اِس صنف ادب کو ایک باقاعدہ شکل اور روپ دینے کا آغاز متذکرہ صدر تحریک ہی سے ہوا جس میں صاحبزادہ محمد عمر اور اُن کے شریک کار منشی نور الٰہی فن ڈراما کے اولین نقاد بن کر سامنے آئے اور پھر دیگر ادیبوں، نقادوں اور ڈراما نگاروں نے اِس فن کو حسن بھی بخشا اور معیار بھی۔

صاحبزادہ محمد عمر کے ذکر میں منشی نور الٰہی کا تذکرہ ناگزیر ہے اور جب تک اُن دونوں قلم کاروں کا ذکر مشترک طور پر نہیں کیا جائے گا یہ داستان ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی، کیونکہ جس کتاب "ناٹک ساگر" نے اُردو ڈراما کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کیا وہ اُن دونوں ادیبوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے، اور بقول بابائے اُردو مولوی عبدالحق:

> " —— اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اِس فن [یعنی ڈراما] پر ایک ایسی جامع حیثیت سے لکھی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے درحقیقت ایک ساگر ہے جو دلچسپ اور مفید معلومات سے بھرپور ہے۔ لائق مصنفین کی تحقیق اور کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔ اِس سے پہلے کبھی اس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ کسی نے اِس موضوع پر بحث نہیں کی تھی۔"[۱۱]

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے "ناٹک ساگر" کے مقدمہ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

> " —— پچھلے دس سالوں میں جو مساعی ناٹک کو اُردو ادب کا ایک اہم جزو قرار دینے میں بروئے کار لائے گئے اُن میں میاں نور الٰہی صاحب اور صاحبزادہ محمد عمر صاحب کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ اور اب یہ ناٹک ساگر، تو ناٹک کے لئے اُن کی دلچسپی اور شفیقانہ مساعی کا گرانڈیل ثبوت ہے۔ میں

مصنفین کو اِس تاریخی تصنیف پر مبارک باد دیتا ہوں اور اُن کی تلاش اور عرق ریزی، مبصرانہ جانچ اور ژرف نگاہی قابلِ داد ہے۔ آج تک ہندوستان میں کسی زبان میں ایسی بسیط اور ہمہ گیر کتاب نہیں لکھی گئی۔ اُردو ادب میں یہ ایک مہتم بالشان اضافہ ہے اور ایسا اضافہ ہے جس کے لئے اُردو دنیا مصنفین کے احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتی۔"

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، نے لکھا ہے:

"حضرات محمد عمر اور نور الٰہی کی کتاب ناٹک ساگر اُردو ڈراما نگاری پر پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ اِس میں بے شمار غلط بیانیاں موجود ہیں اور یہ متعصبانہ رنگ میں لکھی گئی ہے، پھر بھی اِس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" (۲)

اِس سلسلہ میں راقم کا خیال ہے کہ جب بھی کوئی "انقلابی" یا "اجتہادی" قسم کی کتاب لکھی جاتی ہے تو مصنف یا مولف کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اِس سے اِس کے حریفوں پر کیا گزرے گی اور اِس کا ردِ عمل پرانے لوگوں پر کیا ہو گا؟ اُن کے سامنے تو نئی راہیں اور عہد حاضر کے فنی تقاضے ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ "ناٹک ساگر" کا اندازِ بیان جرات مندانہ بھی ہے اور محققانہ بھی، اور فاضل مصنفین نے جہاں ڈراما کی ابتدائی تاریخ اور مختلف ممالک میں ڈراما کی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، وہاں تحقیق و جستجو کی راہیں بھی کھولیں۔ چنانچہ اِس کی اشاعت سے بحث و مباحث کے در کھل گئے جو کہ ایک صحت مند ادبی رجحان کی غمازی کرتے تھے، اور بقول صاحبزادہ حسن شاہ:

"مولانا عبدالحق کے اصرار پر صاحبزادہ صاحب نے وفات سے چند سال قبل "ناٹک ساگر، پر نظر ثانی شروع کر دی تھی تاکہ مزید تحقیق سے اِن مباحث میں رد و قدح سے اور اضافے کیے جائیں۔" (۳)

صاحبزادہ حسن شاہ کے اِس بیان کی تصدیق خود صاحبزادہ محمد عمر کی ایک تحریر سے بھی ہوتی ہے جو "حشر کا ڈراما" کے عنوان سے "آج کل" دہلی کے ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے شمارے میں جگیشور ناتھ بیتاب کے مضمون کے جواب میں شائع ہوئی تھی۔ صاحبزادہ محمد عمر لکھتے ہیں:

"میں بیتاب صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے ایک بھولا بسرا

موضوع یاد دلایا۔ اِس ضمن میں "ناٹک ساگر" میں میں نے بہت کچھ لکھا تھا مگر ہنوز وہ تشنہ تکمیل چلا آتا ہے۔"

جہاں تک "ناٹک ساگر" کی علمی و ادبی حیثیت کا تعلق ہے، اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ علامہ اقبال"، مولانا ابوالکلام آزاد" دیا نرائن نگم، لالہ کنور سین اور مولوی عبدالحق نے اُسے بے حد سراہا ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے اُسے جہاں ادیب فاضل کے نصاب میں شامل کیا وہاں مصنفین کو ساڑھے سات سو روپیہ کا انعام بھی دیا تھا۔

صاحبزادہ محمد عمر ایک بلند پایہ مورخ اور صاحب طرز ادیب ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے محقق و نقاد بھی تھے۔ وہ ایک ایسے نقاد تھے جن کی طبیعت ہر لحظ تحقیق و جستجو کے لئے بے چین رہتی تھی۔ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ خود تحقیق کرتے اور فن ڈراما سے متعلق ہر اُس شخص سے ملتے جو اِس کے بارے میں کچھ جانتا اور سمجھتا ہو اور جہاں کچھ پا لیتے اُسے تاریخ اور حقائق کی روشنی میں پیش کر کے بحث و نظر کے دروازے کھول دیتے۔ اِس سلسلہ میں راقم نے اُن کے ایک مضمون میں ایک اشارہ دیکھا ہے جس کی مزید تحقیق ہو تو فن ڈراما سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی ایک بڑی غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔

رسالہ "آج کل" دہلی کے ۱۵ مئی ۱۹۴۵ء کے شمارے میں جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی نے لکھا کہ:

> "—— وہ [آغا حشر کاشمیری] بڑے فخر کے ساتھ اِس امر کا اعتراف کرتے تھے کہ انہوں نے ناٹک نویسی کا درسِ اولین 'چترا بکاولی' کے مصنف سے لیا ہے۔ مرحوم اُن کا بھلا سا نام بتلاتے تھے جو اُس وقت یاد نہیں آتا اور یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ بریلی کے ساکن تھے۔ کٹرہ مان رائے میں کسی جگہ اُن کا مکان تھا۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں وہ رائے روشن لال مرحوم رئیس اعظم کی کمپنی کے روحِ رواں تھے۔ راقم الحروف [بیتاب صاحب] نے اُن کا پتا لگانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔"

"آج کل" دہلی میں اِس موضوع پر صاحبزادہ محمد عمر نے قلم اٹھایا تو زیر بحث ڈراما "چترا بکاولی" کے خالق کی حقیقت یوں بیان کی جس سے اصل بات سامنے آگئی:

"آپ بھول گئے کہ 'چترا بکاولی' کا مصنف کون ہے؟ میں بھی بھٹک گیا کہ 'ناٹک ساگر' میں میں اِس کی تصنیف کا سہرا حسینی میاں ظریف کے سر باندھ دیا، لیکن بعد میں احسن مرحوم نے بتایا کہ اُردو زبان کے اِس بہترین ڈراما کے مصنف منشی کریم الدین بریلوی ہیں اور یہ اُن کا شاہکار ہے اور فرمایا کہ وہ اِس کے روحانی استاد ہیں۔ آغا سے بھی اِسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ اِس لئے 'چترا بکاولی' کے مصنف منشی کریم الدین آپ کے ہم وطن ہیں اور آغا صاحب نے اسے سراہا تو خوب کیا۔" (۴)

صاحبزادہ محمد عمر مرحوم کی زندگی کا بیشتر اور بہترین حصہ ریاست جموں و کشمیر میں گزرا۔ وہ اُسی کی خاک سے اُٹھے اور اُسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ وہ جب تک حیات رہے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور پرورشِ لوح و قلم بھی کرتے رہے۔ آپ کے جد امجد خواجہ فیض اللہ رام پور کے روہیلہ دربار میں قلعہ دار تھے اور اپنی دین داری اور شرافت و اخلاص کے سبب حضرت شاہ جمال اللہ نقشبندی ؒ کے ایسے منظور نظر ہوئے کہ شاہی ملازمت چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی اور پھر اِس خاندان کے بزرگوں کی وساطت اور تبلیغ دین سے موہڑہ شریف، آلو مہار شریف اور علی پور سیداں میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن ہوئیں۔ چنانچہ ایسی ہی روشنی کی کرن صاحبزادہ دیدار شاہ کی صورت میں جموں شہر میں چمکی اور صاحب احساس انسانوں کے لئے وجہ کشش بنی۔ شہر جموں کے رئیس میاں لعل دین نے، جو خود ایک متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، اپنی بیٹی صاحبزادہ دیدار شاہ کے عقد میں دے دی جن کے بطن سے ۱۸۸۸ میں صاحبزادہ محمد عمر پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں والدین کی شفقت اور سایہ سے محروم ہو گئے اور پھر ساری زندگی نشیب و فراز اور تگ و دو سے پُر رہی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے ہر عہد میں اپنی عزت و وقار، شانِ استغنا اور ادبی حیثیت میں اضافہ کیا اور تا دمِ مرگ اپنی خاندانی وضع داری اور فیاضانہ رکھ رکھاؤ کو قائم رکھا۔ آپ کے فرزند ارجمند پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ کا بیان ہے کہ "آپ کو خالہ نے گود لے لیا۔ نیک خاتون خود تعلیم یافتہ تھیں اور عادت و پرہیزگاری میں اپنی مثال آپ تھیں۔ آپ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے صاحبزادہ کی اِس شفقت و محبت سے پرورش کی کہ آپ مہرِ مادری بھول گئے۔"

صاحبزادہ محمد عمر نے اپنی ابتدائی تعلیم سری رنبیر سنگھ ہائی سکول، میں حاصل کی۔ ڈراما سے دلچسپی کا آغاز بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور جس ماحول میں اُنھوں نے پرورش پائی اِس کا اثر اُن کی طبیعت پر ہوا جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا۔ آپ کے نانا میاں لعل الدین مہاراجہ پرتاب سنگھ کے خاص مقرب تھے۔ مہاراجہ کشمیر ایک ظالم اور سخت گیر حکمران ہونے کے ساتھ ہی ساتھ علم و فن کا شیدائی بھی تھا اور کرکٹ کے کھیل کا شوقین بھی۔ اِسی طرح وہ ناٹک کمپنیوں کو بھی ریاست میں بلاتا تھا۔ ابھی صاحبزادہ محمد عمر جماعت دوم کے طالب علم تھے کہ ریاست میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی جس نے "اکبر اعظم" کے نام سے ایک کھیل کھیلا۔ اِس کھیل کے نقش صاحبزادہ مرحوم کے ذہن میں مرتسم ہو گئے اور یہ ذوق و شوق ایف۔ سی۔ کالج لاہور، میں ایک ڈراما نگار اور ایکٹر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ لاہور کی علمی، ادبی اور ثقافتی فضا نے اِس گوہر آبدار کو خوب چمکایا اور اِسی دور میں شعر بھی کہنے لگے۔ اِن کا تخلص حزیں تھا۔ ایف۔ سی۔ کالج، لاہور کے ماحول نے صاحبزادہ محمد عمر کی ادبی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا اور اُنھوں نے ایک انگریزی ڈراما کا اُردو ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ یہاں پر ہی آپ کی اداکاری کے جوہر بھی کھلے۔

قیام لاہور ہی کے دوران اُن کی ملاقات اپنے ادبی رفیق میاں نور الٰہی سے ہوئی جو گورنمنٹ کالج، لاہور، کے طالب علم اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے اور اعلیٰ پایہ کے انشا پرداز بھی تھے۔ اُن کے بزرگوں کے مراسم صاحبزادہ مرحوم کے خالو میاں غلام رسول سے تھے۔ چنانچہ خاندانی تعلقات کے علاوہ جب مہاراجہ پرتاب سنگھ نے میاں نور الٰہی کو ریاست کی کرکٹ ٹیم کے لئے منتخب کیا اور ساتھ ہی محکمہ کسٹم میں ملازمت دی تو یہ تعلقات پھر سے ایک جا ہو جانے پر اور زیادہ مضبوط ہو گئے اور یوں اُن دو دوستوں نے فکری اور علمی یگانگت سے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ریاست جموں و کشمیر میں اُن محفلوں کو رونق بخشی جو اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے کام کر رہی تھیں۔ اِسی دوران صاحبزادہ محمد عمر کی شادی میاں نور الٰہی کے برادرِ اکبر میاں فضل الٰہی، بار ایٹ لا، کی دختر سے ہو گئی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ کشمیر ہائی کورٹ میں بہ حیثیت مترجم ملازم ہوئے۔ یہیں سے آپ کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مترجم کی حیثیت سے صاحبزادہ مرحوم نے "جنرل کلاز ایکٹ" اور "پرتاب کوڈ" کا ترجمہ اِس خوش اسلوبی سے کیا

کہ سب آپ کی قابلیت اور طرزِ تحریر کے قائل ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں آپ کی خدمات برطانوی ہند کے شعبہ تعلقاتِ عامہ نے لے لیں، جہاں اپنی ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر کئی اعزاز حاصل کیے، مگر شانِ استغنا کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر ان سندات کا نہ تو کسی سے تذکرہ کیا اور نہ ہی انہیں باعث کشش جانا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی روح حریت پسند اور حریت نواز تھی اور وہ ریاست میں اُن تحریکوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرتے تھے جو جہالت، غلامی اور ظلم کے خلاف چل رہی تھیں۔ آپ ایک عرصہ تک انجمن اسلامیہ قلمرو جموں کے سرگرم کارکن رہے۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم ریاست کی وزارتِ قانون سے وابستہ تھے۔ وہ مجسٹریٹ درجہ اول کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ کچھ عرصہ وکالت کی اور ساتھ ہی اُردو ادب کی ترقی کے لئے ایک ادارہ محمود ایجنسی کے نام سے جاری کیا، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُن کے اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے تمام منصوبے اُدھورے رہ گئے اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو قضائے الٰہی سے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ "اِنا للہ و انا الیہ راجعون"

میاں نور الٰہی بھی ریاست کی ملازمت میں رہے اور وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) کے عہدے تک پہنچے اور کئی ادھورے ادبی کام چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کی وفات لاہور میں ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، مہاراجہ پرتاب سنگھ اپنی تمام تر آمریت اور ظلم پرست طبیعت کے باوجود ایک رنگین مزاج اور شوقین انسان بھی تھا اور ریاست میں اپنے ظلم و ستم کو چھپانے کے لئے ایسی مجلسیں منعقد کراتا رہتا تھا جن میں رقص و سرود بھی ہوتا اور ناٹک اور ڈرامے بھی۔ چنانچہ اُس نے ایک تھیٹریکل کلب قائم کیا جو موسم گرما میں سری نگر اور موسم سرما میں جموں میں ڈرامے سٹیج کرتا۔ ریاست کے پڑھے لکھے افراد اِس کلب کے ڈراموں میں حصہ لیتے۔ سرکاری پذیرائی کے سبب بیرونِ ریاست سے بھی تھیٹریکل کمپنیاں آنے لگیں۔ اُسی زمانے میں جموں میں "رام ناٹک کلب" بنا اور ازاں بعد یہی "امیچر ڈرامائیک کلب" کی شکل اختیار کر گیا۔ اِن کلبوں کی سرگرمیوں میں صاحبزادہ محمد عمر، میاں نور الٰہی اور اُن کے ہم عصروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صاحبزادہ محمد عمر نے انگریزی اور فرانسیسی ڈراموں کے تراجم کیے اور انہیں اُردو زبان کے قلب میں ڈھالا۔ اِن

ڈراموں میں بیشتر ریاست اور بیرونِ ریاست سٹیج کیے گئے۔ پھر یہی ڈرامے ایک کتاب کی صورت میں طبع ہوئے جن میں مندرجہ ذیل بے حد مشہور ہوئے: "روحِ سیاست"۔ "بگڑے دل"۔ "ظفر کی موت"، "جانِ ظرافت"۔ "تین ٹوپیاں اور قزاق"۔

صاحبزادہ محمد عمر آغا حشر کاشمیری کے مداح ہی نہ تھے بلکہ اُنہیں اِس میدان میں رستم جانتے تھے۔ چنانچہ آغا حشر کاشمیری جموں بھی تشریف لائے اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ریاست میں اُن کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ اُن کے جانے کے بعد جموں میں کئی ڈراما کلب بن گئے۔ صاحبزادہ محمد عمر کے ایک ہم عصر اور دوست ماسٹر غلام حیدر کاشمیری نے ریاست میں ڈراما کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے اِن کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ افسوس ریاست کا یہ دوسرا ممتاز ڈراما نگار ہجرتِ وطن کے بعد کراچی میں وفات پاگیا:

ع "موت سے کس کو رستگاری ہے۔"

۱۹۴۵ء میں لالہ ملک راج صراف، ایڈیٹر "رنبیر" جموں، نے "راج محل" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جس نے صاحبزادہ محمد عمر کے اُردو ڈراموں کا مجموعہ "مدھم پنچم" کے نام سے شائع کیا۔ اِن ڈراموں میں سے بیشتر مختلف ریڈیو سٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔ صاحبزادہ محمد عمر کی تصنیف "ناٹک ساگر" اور "مدھم پنچم" کے علاوہ کئی اور کتابیں بھی ہیں جن میں سے بعض غیر مطبوعہ ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب جموں میں فسادات برپا ہوئے تو اُن میں بیشتر چیزیں ضائع ہو گئیں۔ مگر اِن کے بیٹے صاحبزادہ حسن شاہ کی کوشش اور توجہ سے کئی مسودات مل گئے جو اُنہوں نے پاکستان آنے کے بعد پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر چودھری محمد علی کے سپرد کر دیے تاکہ یہ علمی و ادبی سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ اُن مسودات کی طباعت کے حقوق صاحبزادہ خالد شاہ کو حاصل تھے مگر چند سال ہوئے مختصر سی علالت کے بعد وفات پا گئے۔ اگر اِس ضمن میں صاحبزادہ حسن شاہ کوئی عملی قدم اُٹھائیں تو اُردو ادب ایک عظیم ادیب اور ڈراما نگار کی نگارشات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔ دیگر تصانیف میں "نواب سراج الدولہ" بہت مشہور ہے جسے انجمن ترقی اُردو دہلی نے شائع کیا تھا۔

صاحبزادہ محمد عمر کے علامہ اقبالؒ سے ذاتی تعلقات تھے، جن میں عقیدت اور خلوص شامل تھا۔ جن دنوں صاحبزادہ مرحوم نے جان ڈانک والٹر کے ڈراما "ابراہام لنکن" کا

اُردو ترجمہ "روحِ سیاست" کے نام سے کیا تو علامہؒ نے اُن کو مبارک باد پیش کی اور "ناٹک ساگر" کی تصنیف کو بھی سراہا۔ علامہ اُن کی تحریروں میں گہری دلچسپی کا اظہار فرماتے تھے۔ علامہ سے اُن کے تعلقات لاہور کے قیام کے دوران میں استوار ہوئے اور بقول ظفر ہاشمی:

"حضرت علامہ کو محمد عمر سے بے حد پیار تھا اور اُن کا ذکر اُن کی زبان پر آتا رہتا تھا۔ ایک دن [علامہ] کہنے لگے کہ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھا تو محمد عمر صاحب کو اِن دنوں بھی ادب کا ذوق تھا، مگر شریر بہت تھے۔ اُن کی شرارت کا ایک دلچسپ قصہ جو ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا اُنہوں نے سنا دیا، وہ یہ تھا کہ اُن کا ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کس طرح محمد عمر نے حاصل کر کے لکھنؤ کے رسالہ 'اتحاد' میں چھپوا دیا جس کے ایڈیٹر مولوی عبدالحلیم شرر تھے۔ چونکہ اِس میں بے شمار غلطیاں تھیں اِس پر تمام ہندوستان کے شاعروں اور ادیبوں نے خاص کر مولانا حسرت موہانی نے بہت لے دے کی اور علامہ اقبال کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔" (۵)

اِس قصے کو ظفر ہاشمی صاحب نے محمد عمر کے اپنے ہی الفاظ میں درج کیا ہے جسے حبیب کیفوی نے اپنے مضمون "ذرامی" میں یوں نقل کیا ہے:

"کون ہے جس نے علامہ اقبال کی وہ نظم جس کا عنوان 'ہندوستان ہمارا' سنی یا پڑھی نہ ہو، مگر ہے کوئی شخص جو یہ بتائے کہ یہ ترانہ کس طرح کہا گیا۔ حضرت اقبال پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں مگر یہ کسی نے نہ لکھا کہ یہ نظم کیسے عالم وجود میں آئی اور اِس پر کیا کیا ہنگامے بپا ہوئے؟ جنہیں اِس کا علم تھا وہ قوتِ بیان سے محروم تھے اور جو اُسے بتانے کی اہلیت رکھتے تھے اُن بچاروں کو اِس کا علم نہ تھا کہ یہ کام مجھے ودیعت ہوا اور مجھ کو ہی کرنا پڑا۔ آپ تو اِس کو دیکھ کر خوش ہوں گے مگر مجھ سے پوچھئے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ کاش یہ ترانہ نہ لکھا جاتا۔ اگر حضرت علامہ کو لکھنا ہی تھا تو اِس وقت نہ لکھتے جس وقت لکھا۔ آپ تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں مگر اِس کی مہربانی سے جو کچھ مجھ پر گزری وہ میں ہی جانتا ہوں۔ یہ ۱۹۰۴ء کا حادثہ ۱۹۱۳ء

تک میرے لئے سوہانِ روح بنا رہا۔ اب سنئے اِس معرکہ کی کیفیت اور میری حالت زار پر ہنسئے یا روئیے جو آپ کو پسند ہو۔"

"لاہور میں ۱۹۰۴ء میں صرف ایک کلب وائی۔ ایم۔ سی۔ اے تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں لکچرار تھے۔ اُن کی طبع جولانی پر تھی اور اُن کی لازوال شاعری کا آغاز ہو رہا تھا۔ لالہ ہردیال سے اُن کے تعلقات دوستانہ تھے۔ ہردیال نے اپنی کلب کا افتتاحی جلسہ کیا تو علامہ اقبال کو صدارت کے لئے مدعو کیا جو انہوں نے قبول کر لیا۔ جب یہ جلسہ شروع ہوا تو آپ نے بجائے خطبہ ارشاد کرنے کے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' پڑھنا شروع کیا۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ علامہ ترنم سے پڑھ رہے تھے اور لوگ جھوم رہے تھے۔ مگر ہم جو روزانہ بلاناغہ شام کو حاضر خدمت ہوا کرتے تھے حیران تھے کہ یہ نظم کب کہی گئی؟ وہ نظم پڑھتے گئے اور میں پنسل سے کاغذ پر اُتارتا چلا گیا۔ میں اُن دنوں ایف۔ سی کالج میں پڑھتا تھا۔ اگر یہ قصہ یہیں ختم ہو جاتا تو میری آئندہ کوفت کم ہو جاتی، مگر وفورِ عقیدت کہیے یا حماقت کہ میں نے اپنے ہوسٹل میں پہنچ کر اسے صاف کر کے لکھا۔ اُن دنوں مولوی عبدالحلیم شرر اپنے رسالہ 'اتحاد' میں ہندو مسلم اتحاد کے گیت الاپ رہے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' یہ نظم برائے اشاعت بھیج دی۔ اُمنگ یہ تھی کہ میرا نام بھی رسالے میں چھپ کر نکلے۔ اِس لیے اپنا نام شائع کرنے کی بڑی تاکید کی۔ مولانا شرر نے نظم تو شائع کر دی مگر میرا نام نہ لکھا۔ بات آئی گئی ہو گئی اور رسالے کا انتظار ہونے لگا۔ میں نے حضرت قبلہ سے ذکر نہ کیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں جب رسالہ آئے تو لے کر اُن کی خدمت میں جاؤں گا۔ وہ اپنا چھپا ہوا کلام دیکھیں گے تو میری خدمت کی داد دیں گے۔ میں رسالے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ ایک دن حسب معمول آپ کے مکان پر گیا جو اب بھی بھاٹی دروازہ لاہور میں زندہ شہادت دینے کو موجود ہے، تو محفل پر مردنی چھائی ہوئی اور علامہ غصے کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ میں نے چپکے چپکے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ جو نظم کلب کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی اِسے کسی نے رسالہ 'اتحاد' لکھنؤ میں شائع کرا دیا ہے۔ اِس میں بہت سی غلطیوں کو سامنے رکھ کر مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ 'اُردوئے معلیٰ' میں اہل پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہیں۔ کوئی مہذب و غیر مہذب گالی اُٹھا نہ رکھی گئی اور مجھے بھی

سینہ پر پتھر رکھ کر اُس دشنام دہی میں شریک ہونا پڑا۔ فرمائیے میرے دل و جگر کی کیا کیفیت ہو گی۔ اگر یہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا تو میں یہ سب کچھ پی جاتا مگر اب علامہ بضد ہوئے کہ اِس شخص کا کھوج لگایا جائے جس نے ایسی حرکت کی ہے۔ اِس کی میں نے بڑے زور سے تائید کی اور اِسی روز سے اپنے چہرے کے رنگ کو اُڑانے سے روکا۔ اسلامیہ کالج کے ایک 'قل اعوذیے' نے کہا کہ وہ شخص یوں تو ملنے کا نہیں، مولانا شرر ہی سے پوچھا جائے کہ یہ نظم اُنہیں کس نے ارسال کی تھی؟ سب نے اِس تجویز کی تائید کی۔ میں ظاہر میں تو اِس تجویز کی تائید کر رہا تھا مگر باطن میں تجویز کنندہ کو بددعائیں دے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ نے جھٹ مولانا شرر کو خط لکھ مارا۔ چونکہ ڈاک خانہ میرے ہوسٹل سے قریب تھا، اِس لیے ڈاک میں پوسٹ کرنے کی سعادت بھی میرے سپرد ہوئی۔ میرے وارنٹ اور میرے ہی ہاتھوں اِس کی تعمیل، سبحان اللہ! قدرت کے کھیل۔ میں بھاٹی دروازہ سے چلا اور سیدھا نیلا گنبد پہنچنے تک میں نے کئی ایک فرار کی صورتیں پیدا کیں اور مٹا دیں۔ یہ خیال کہ شیخ صاحب کا خط ہی غتر بود کر دیا جائے۔ آسان تو تھا مگر اِس میں آخرکار پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ پھر یہ سوچا کہ اِسی لفافہ کی پشت پر لکھ دوں کہ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ تجویز بھی نامعقول تھی۔ ایک لڑکا اپنے گھر سے دور، جس کا نہ کوئی مونس نہ غمگسار، نہ کوئی رہبر نہ مشیر کار۔ اِس کی حیرانی کی کسک کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں اپنے گھروں سے دور ہوسٹلوں میں رہنا پڑتا ہے۔ پھر طبیعت اِس بات پر ٹھہری کہ مولانا شرر کو علیحدہ خط لکھا جائے کہ میرا نام نہ بتائیں۔ چنانچہ میں ہوسٹل میں گیا، خط لکھا اور دونوں خطوط ڈاک کے حوالے کر دیے۔ مجھے خطوط کی جنگ میں فتح و ظفر کی اُمید کم تھی۔ کہاں کالج کا ایک پروفیسر اور کہاں فسٹ ایر کا ایک ادنیٰ طالب علم۔ دو چار دن بڑی پریشانی میں بسر ہوئے۔ خدا مولانا شرر کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اُنہوں نے شیخ صاحب کے خط کا جواب دیا اور لکھا کہ لاہور سے کسی نے یہ نظم بھیجی تھی۔ مسودہ بہت تلاش کیا مگر نہ ملا۔ نام یاد نہیں۔ میں تو اِس عذاب سے چھوٹا مگر اور پھنس گئے۔

"حسرت موہانی کی اِس تعریف نے یو۔ پی۔ اور پنجاب کے ادیبوں میں ایک طویل بحث کا دروازہ کھول دیا۔ 'اُردوئے معلیٰ'' اور 'مخزن' میں محاذ قائم ہوئے۔ خوب گولہ باری ہوئی۔ گھمسان کے معرکے پڑے۔ آخر چھ سات مہینوں کے بعد فریقین تھک کر چور ہو

گئے۔ نہ کوئی جیتا نہ کوئی ہارا۔ یہ راز مدتوں سربستہ رہا۔ شیخ صاحب تعلیم کے لئے ولایت چلے گئے۔ واپس آئے اور میں سمجھا کہ نظم والی بات اُن کے ذہن سے اُتر گئی ہو گی۔ جب آپ ۱۹۱۳ء میں سری نگر تشریف لائے اور مولوی احمد دین، منشی نور الٰہی اور اُن دو ایک موکل اور راقم الحروف آپ کے پاس ہاؤس بوٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک 'شکارا' ہمارے پاس سے گزرا۔ اِس میں دو تین بچے یہی نظم گا رہے تھے۔ اِس غیر شعوری استقبال نے ایک کیفیت پیدا کر دی جس کے سرود میں حضرت علامہ نے بھی حصہ لیا اور بیان کیا کہ کس طرح یہ نظم شائع ہوئی اور کس طرح ایک ادبی طوفان بپا ہوا۔ مگر یہ پتا نہ لگا کہ یہ نظم کس نے شائع کرائی تھی۔ منشی نور الٰہی نے میری طرف دیکھا۔ میں کچھ کھو سا گیا، مگر ظالم نے بتا ہی دیا کہ یہ کارستانی میری تھی۔ سب ہنس پڑے اور حضرت علامہ بھی اِس میں شریک غالب ہوئے۔

"جی ہاں! یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جواں تھا۔" (۶)

صاحبزادہ محمد عمر نے علامہ اقبال کی کشمیر میں آمد کا سن ۱۹۱۳ء لکھا ہے جو کہ میرے خیال کے مطابق درست نہیں، کیونکہ علامہ اقبال" کشمیر اور اہل کشمیر سے فطری محبت اور اُنس رکھنے کے باوجود ۱۹۲۱ء تک کشمیر نہ دیکھ سکے تھے۔

محمد عبداللہ قریشی نے بھی اپنے ایک مضمون "اقبال اور کشمیر" میں علامہ صاحب کی کشمیر میں آمد کے سلسلے میں لکھا ہے:

"ڈاکٹر صاحب جون ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی طاہر دین مرحوم کے ہمراہ کشمیر گئے اور قریباً دو ہفتہ تک سری نگر میں رہے۔ ہاؤس بوٹ میں اُن کا قیام تھا۔" (۷)

علامہ اقبال" نے اپنے قیام کشمیر کے دوران سیر کشمیر بھی کی اور وہاں کے عوام کی سیاسی بے چارگی کو بھی دیکھا۔ صاحبزادہ محمد عمر نے یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء کے رسالہ "آج کل" دہلی میں حضرت علامہ اقبال کا "ایک غیر مطبوعہ قطعہ" شائع کرایا اور لکھا:

"اگست ۱۹۲۱ء وہ تاریخی مہینہ ہے جب حضرت اقبال آخری بار اپنے وطن مالوف کشمیر میں تشریف لائے اور اِس سرزمین کا درد بھرے دل سے مطالعہ کیا جس کے تاثرات اِن کے کلامِ مبارک میں جابجا پائے جاتے ہیں۔ مگر اِسی کے پہلو میں آپ نے فضائے کشمیر

کے متعلق جہانگیر کے زاویہ نگاہ کو نظر انداز نہ کیا۔ اُن کے مشاہدہ کا ماحصل یہ تھا کہ معاشرتی لحاظ سے اِس خطہ کے جہنم ہونے میں شک نہیں مگر مناظر فطرت کی فراوانی اور آب و ہوا کی شادابی کی رو سے جس نے کہا خوب کہا کہ زمین پر اگر فردوس ہے تو یہی خطہ کشمیر ہے۔ اِن ناقابل فراموش ایام میں ایک دن جناب مولوی احمد الدین مرحوم وکیل لاہور، منشی نور الٰہی مرحوم (میرے ادبی شریک کار) اور اِس خاکسار نے بڑی جدوجہد کے بعد حضرت والا کو جھیل ڈل کی سیر پر مجبور کیا۔ جنہیں آنخضرت کا شرف قرب حاصل ہے اُن پر مخفی نہیں کہ آپ کو کسی جگہ تشریف ارزانی فرمانے پر آمادہ کرنا کس قدر مشکل مہم تھی۔ موٹر کے ذریعہ نشاط باغ جا کر ڈل کی بہار دیکھنا، آپ نے مصنوعی (خلافِ فطرت) قرار دیا۔ اور ہم تینوں آنخضرت کے ساتھ شکارے (ایک ہلکی سی کشتی) میں بیٹھ کر ڈل کی طرف روانہ ہوئے۔ شالامار، نسیم اور نشاط باغ کو بہت پسند کیا اور 'زہد شکن' کا خطاب عطا کیا۔ کیا جامع تعریف ہے! واپس ہوئے تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ آفتاب آخر منزل پر پہنچ رہا تھا، شفق پھول رہی تھی اور یہ منظر سالم کا سالم ڈل کے شفاف پانی میں تیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک صحیفہ قدرت کے اِس سنہری ورق کا خاموشی سے مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحر فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو درِ شہوار نکال لائے۔ جناب کا ارادہ اُنہیں ایک نظم میں منسلک کرنے کا تھا، مگر طبیعت کا رجحان کسی اور طرف ہو گیا اور یہ دو اشعار میرے پاس پڑے رہے جو امانت ہیں اب میں 'آج کل' کے حوالہ کرتا ہوں:

تماشائے ڈل کن بہ ہنگامِ شام   دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبارِ سفر   زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب"

مگر اِسی واقعہ کو اُنہی الفاظ میں "ہزار داستان" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۲۲ء میں صاحبزادہ صاحب پہلے ہی بیان کر چکے تھے۔ مولوی محمد عبداللہ قریشی کی تحقیق یہ ہے کہ واقعہ اگست ۱۹۲۱ء کا نہیں بلکہ اِس سے پہلے کا ہے کیونکہ جولائی ۱۹۲۱ء کے پہلے عشرہ میں اقبال لاہور واپس آ گئے تھے۔

صاحبزادہ محمد عمر نے اپنی کتاب سراج الدولہ میں حضرت علامہ سے ایک موقع کی گفتگو بھی نقل کی ہے وہ احتراماً حضرت علامہ کو حضرت امام لکھتے ہیں:

میں نے سراج الدولہ کا ذکر حضرت امام کے حضور کیا۔ اِس تذکرے کی تہ میں مدعا

یہ تھا کہ ممکن ہے سراج الدولہ پر کوئی نظم ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ :

"سراج الدولہ کو ابھی ہندوستان نے نہیں پہچانا۔ نہیں تو مرشد آباد دوسرا اجمیر بن جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سراج الدولہ کے آخری سانس کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا چراغ گل ہو گیا۔" اِس پر مولوی احمد الدین مرحوم جناب کے بے تکلف دوست تھے، کہنے لگے "اِس سراج اور چراغ کے تلازمہ نے تناسب لفظی کو منور کر دیا۔" ڈاکٹر صاحب بہت ہنسے اور گویا ہوئے: "مجھے تو اِس کا خیال تک نہ تھا۔ مگر آپ "منور" کا لفظ استعمال کر کے سیدھے لکھنؤ پہنچ گئے۔" پھر امانت لکھنوی کا یہ شعر سنایا ۔

کیا ہے نخلِ غم تازہ یہ ٹھنڈی سانس بھر بھر کر
بڑی محنت سے میں نے یہ شجر جاڑے میں پالا ہے

... آہ وہ دِن !

حضرت نے اگرچہ سراج الدولہ کے متعلق بہ رہ راست کچھ نہیں کہا مگر۔ میر جعفر کو جو طوقِ لعنت پہنایا ہے اُس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سراج الدولہ کو کس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جا بہ جا میر جعفر پر لعنت کی ہے۔ یہ شعر ۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اِس کے علاوہ "الاماں از روحِ جعفر الاماں۔ الاماں از جعفرانِ ایں زماں" لکھ کر لفظ جعفر کو غدار کا مترادف بنا دیا اور ایسا بنایا کہ ضرب المثل ہو گیا۔ ایک مقام پر یہ بتاتے ہوئے کہ ہندوستان کی تقدیر میں اِس وقت تک غلامی لکھی ہے جب تک غدار یعنی جعفر پیدا ہوتے رہیں گے۔ فرماتے ہیں کہ ۔

کے شبِ ہندوستان آید بہ روز !
مُرد جعفر، زندہ روحِ او ہنوز !

اِس نظم میں یہ تنبیہہ ہے کہ زمانہ حال کے جعفر کی منافقت سے بچے رہنا جو مسلمانوں کے کپڑے پہن کر مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے ۔

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است

صادق غدار دکن کی نسبت حضرت اقبال کی توجہ جعفر غدار بنگال کی طرف زیادہ رہی۔ اُن کے خیال کے مطابق ایشیا کا سب سے بڑا غدار میر جعفر ہے اور رہتی دنیا تک وہی غداری کا نمائندہ رہے گا۔

حواشی

۱۔ رسالہ "اُردو"، جنوری ۱۹۲۵ء
۲۔ "اُردو ڈراما"، ص ۸۴
۳۔ "نیرنگ خیال"، جنوری ۱۹۶۷ء
۴۔ "آج کل"، دہلی ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء
۵۔ ہفت روزہ "آزاد کشمیر"، ۳۰ مارچ ۱۹۵۶ء
۶۔ مطبوعہ "کتاب"، لاہور دسمبر ۱۹۶۷ء
۷۔ "ادبی دنیا" اقبال نمبر

اقبالؒ اور خانصاحب منشی سراج الدین احمد (میر منشی)

(ا)

علامہ محمد اقبال کی ریاست جموں و کشمیر میں جن احباب و اصحاب سے خط و کتابت اور دوستانہ مراسم تھے، اُن میں خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی بھی شامل تھے جو شمس العلما مولوی سید میر حسن کے شاگرد اور کشمیر رزیڈنسی کے میر منشی تھے۔ اُن کا تعلق لاہور کے ڈار خاندان سے تھا، رشتے داری میں آپ خلیفہ عبدالحکیم کے تایا زاد بھائی تھے۔ آپ کے والد کا نام محمد اسماعیل اور خلیفہ عبدالحکیم کے والد کا اسم گرامی خلیفہ عبدالرحمن تھا۔ دونوں سگے بھائی تھے۔ منشی صاحب کے دادا کا نام رمضان ڈار تھا جو ڈوگروں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر دیگر کشمیری مسلمانوں کے ساتھ لاہور آ بسے تھے۔ اُن کی وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی۔ منشی سراج الدین کے والد منشی اسماعیل ڈار پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور اُن کا شمار اپنے دور کے معروف وکلاء میں ہوتا تھا۔

منشی سراج الدین نے اپنی ابتدائی تعلیم لاہور اور سیالکوٹ میں پائی۔ آپ کی تاریخ پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۷۶ء ہے۔ آپ کو علامہ محمد اقبال کے استادِ محترم شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے گہرا لگاؤ تھا۔ پہلے لاہور میں ایک سکول میں مدرس رہے۔ ازاں بعد کشمیر رزیڈنسی سے وابستہ ہو گئے اور میر منشی کے عہدے تک پہنچے۔ علامہ اقبال سے سلسلہ مراسلت و ارادت ابتدا سے ہی قائم ہو گیا تھا اور اُن شعری محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے جو بازار حکیماں میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ منشی سراج الدین، علامہ محمد اقبال کے دورِ اولیں کے دوستوں میں سے تھے اور علامہ محمد اقبال اِن کے سخن فہمی اور سخن پروری کے

مداح تھے۔ اپنے ایک خط میں منشی صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی۔"(۱)

(۲)

ریاست کشمیر میں ایک اور شیخ منشی سراج الدین بھی تھے جو جموں کے رہنے والے تھے اور محکمہ مال سے وابستہ تھے۔ وہ افسر مال کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ آپ نہایت متقی، پرہیزگار اور صاحب علم تھے۔ علامہ اقبال سے بھی اُن کی دوستی تھی۔ ریاست کے مشہور کاروباری خاندان کے فرد تھے۔ شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش آپ کے بزرگوں میں سے تھے۔ ریاست کے ممتاز سیاست دان اور ممبر اسمبلی شیخ محمد امین مرحوم آپ کے برادرِ نسبتی تھے۔ جب ریاست کی ایک عدالت نے ایک کاروباری مقدمے میں شیخ صاحبان کی جائیداد کی قرقی کا حکم دیا تو منشی شیخ سراج الدین، علامہ محمد اقبال کو مقدمے کی پیروی کے لئے سری نگر لے گئے۔ علامہ محمد اقبال کے ہمراہ دوسرے وکیل مولوی احمد دین تھے جو دیوانی قانون کے ماہر تھے۔ یہ جون ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ علامہ محمد اقبال نے کشمیر میں دو ہفتے قیام کیا اور جولائی ۱۹۲۱ء کے پہلے عشرے میں واپس آ گئے تھے۔

علامہ محمد اقبال نے اُنہی مقدمات کے سلسلے میں شیخ منشی سراج الدین کو خطوط لکھے۔ اِن خطوط کی تعداد ۳ ہے جو "انوارِ اقبال" میں شامل ہیں۔ اِن خطوط سے خان صاحب منشی سراج الدین (میر منشی) کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

منشی سراج الدین قیام پاکستان کے بعد کچھ وقت سرینگر اور کچھ عرصہ دہلی میں گزار کر پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ سو سال کی عمر پائی اور ۱۹۷۸ء میں کراچی ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

(۳)

خان صاحب منشی سراج الدین بھی صاحب ذوق اور خوش پوش انسان تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کے قدر دان تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں جن

لوگوں نے زبان اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے شب و روز کام کیا اُن میں منشی صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ لاہور سے سرینگر اُٹھ آنے کے بعد آپ ہندوستان کے دوسرے حصوں سے اہل سخن کو سرینگر آنے کی دعوتیں دیتے رہے اور شعرو سخن کی محفلیں جماتے تھے۔ "کشمیر میں اُردو" کے مصنف جناب حبیب کیفوی لکھتے ہیں:

"کشمیر میں منشی سراج الدین کا وجود ہی ایک ادارہ تھا جن کے گرد شعراء اور ادیبوں کا حلقہ بنا رہتا۔ منشی نور الدین عنبر، میر خورشید احمد خورشید، شیخ غلام نقشبند، مولوی صادق علی صادق، خود شاعر اور شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ موسم گرما میں سرینگر کے قیام میں ادبی مجالس منعقد کرتے جن میں ہندوستان سے سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے شاعر اور ادیب بھی شرکت کرتے۔ "مفرح القلوب" کے نام سے اُن بزرگوں نے ایک حلقہ ترتیب دیا ہوا تھا جو اتوار یا کسی اور تعطیل کے روز باغات یا دوسری سیر گاہوں پر چلے جاتے جہاں وہ ہفتہ بھر کی دفتری کوفت کو شعرو شاعری اور موسیقی سے دور کرتے۔ اکثر باہر سے آئے ہوئے معزز مہمان بھی اُن مجلسوں میں شریک کیے جاتے"۔ (۲)

اُنہی مجلسوں میں لاہور کے جسٹس شاہ دین ہمایوں اور ازاں بعد اُن کے فرزند میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں" شرکت کرتے تھے۔ اُس زمانے میں چودھری خوشی محمد ناظر بھی ریاستی حکومت سے وابستہ ہو چکے تھے۔ یہ بھی علامہ محمد اقبال اور منشی سراج الدین کے دیرینہ دوستوں میں تھے۔ پھر جب سر شیخ عبد القادر گرمیوں کی تعطیلات گزارنے سرینگر پہنچتے تو منشی سراج الدین کے ہاں شعرِ و سخن کی محفلیں جمتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں منشی سراج الدین نے نصف صدی سے زیادہ مدت تک علم و ادب اور شعرو سخن کی شمع فروزاں رکھی۔ چنانچہ اُن کی رفاقت اور تربیت میں بیسیوں شاعروں، ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں نے نام پیدا کیا۔ اُن ایام میں کشمیر رزیڈنسی سے امین حزیں سیالکوٹی بھی وابستہ تھے۔ بلکہ ایک زمانہ میں یعنی ۱۹۲۱ء میں تو مشہور شاعر و ادیب علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی بھی ریاست میں بطور معاون سیکرٹری آ چکے تھے۔ منشی سراج الدین کے دوستوں میں چودھری خوشی محمد ناظر، مولوی نذیر احمد جج ہائی کورٹ خواجہ

عبدالصمد ککرو، لالہ کنور سین جج، مولوی محمد حسین عارف جج ہائی کورٹ شامل تھے۔

منشی محمد دین فوق کی سرینگر میں آمد پر یہ شعری محفلیں اور رنگ دکھاتیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب لوگ علامہ محمد اقبال کے بے حد مداح تھے اور لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں علامہ محمد اقبال کے لئے ہی شریک ہوتے تھے۔

سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ منشی سراج الدین کی علمی و ادبی کوششوں سے اہل جموں و کشمیر برصغیر کے حالات و کوائف سے بھی آگاہ ہونے لگے یعنی کشمیریوں نے خود کو ملت اسلامیہ ہند سے وابستہ کر لیا اور اِس طرح ہندی مسلمان بھی کشمیری عوام کے مسائل و حالات میں دلچسپی لینے لگے۔ جب بھی کوئی اہم سیاسی یا سماجی اور مذہبی واقعہ رونما ہوتا ریاستی عوام بھی اِس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ چنانچہ جب اکتوبر ۱۹۰۷ء میں نواب محسن الملک بہادر مولوی سید مہدی علی خان کا انتقال ہوا اور یہ خبر سرینگر پہنچی تو بقول منشی محمد الدین فوق:

"۲۱۔ اکتوبر کی سہ پہر کو خان صاحب منشی سراج الدین احمد میر منشی ریذیڈنسی، ماسٹر صادق علی خان صادق ہیڈ ماسٹر (مرحوم) خواجہ صمد جو ککرو (مرحوم) اور مولوی عتیق اللہ صاحب سیکرٹری انجمن نصرت اسلام سرینگر کی سعی سے اسلامیہ ہائی سکول کے وسیع صحن میں ایک ماتمی جلسہ ہوا۔"

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ منشی سراج الدین اپنی سرکاری ملازمت کے باوجود قومی دینی امور سے ناآشنا اور بیگانہ نہیں تھے۔ وہ کشمیریوں میں جہاں علمی و ادبی ذوق کو پھر سے زندہ کر رہے تھے وہاں اُن کے سیاسی شعور کو ملی شعور سے بھی ہم آہنگ اور ہم رنگ بنا رہے تھے۔

(۴)

وہ شعراء کرام جو پنجاب سے کشمیر میں آئے اُن میں ایک اللہ یار جوگی بھی تھے جن کا علامہ اقبال کے فوق مرحوم کے نام خطوط میں ذکر ملتا ہے۔ جوگی کے والد صوبیدار خان محمد بہ سلسلہ ملازمت دکن میں رہے اور جوگی ۱۸۸۷ء میں پونا میں پیدا ہوئے مگر زندگی کے آخری ایام میں کچھ عرصہ ریاست جموں و کشمیر میں رہے اور "حکیم مرزا اللہ یار جوگی دکنی

کاشیری" بن گئے۔ جوگی جموں کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور بقول مولوی محمد عبداللہ قریشی : "شاید اُنھیں مہاراجہ سے کسی صلے کی اُمید تھی۔ یہاں خان صاحب منشی سراج الدین احمد میر منشی رزیڈنسی کشمیر سے اُن کی گاڑھی چھنتی تھی۔ منشی صاحب بڑے ذی علم، سخن فہم، بذلہ سنج اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے، اُنھوں نے اپنے ایک قطعہ میں جوگی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

جوگی کے ذکر معنی پہ سب لوگ ہیں مفتوں
کیا شعر دلآویز ہیں کیا تازہ ہیں مضموں
ہم دونوں سے یہ بزم بنی خطہ یوناں
میں اِس کا ارسطو ہوں تو وہ میرا فلاطوں (۳)

منشی اللہ یار جوگی علامہ محمد اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ جب علامہ اقبال ۱۹۰۸ء میں یورپ سے وطن واپس آئے تو جوگی نے استقبالیہ میں نظم کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

کدھر ہے کیف مسرت مجھے سنبھال سنبھال
کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبال

(۵)

علامہ محمد اقبال اور منشی سراج الدین کے تعلقات کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"منشی سراج الدین جو کشمیر رزیڈنسی میں میر منشی ہو گئے تھے بڑے خوش ذوق اہل علم تھے۔ اقبال سے اُن کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ منشی صاحب کو فارسی اور اُردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ اقبال نے اُن سے کسی کے لئے انگوٹھی یا انگوٹھیاں منگوائی تھیں۔ اِس تحفے کے پہنچنے پر مندرجہ ذیل مکتوب اور اشعار بھیجے جو منشی سراج الدین کی بیاض میں درج تھے۔"

ذیر سراج! دو تین روز سے طبیعت بہ سبب دورۂ درد کے علیل ہے۔

یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریہ میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغان یہی ہے۔ اِسی کو قبول کر کے مجھے مشکور کیجئے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند اُردو سطور لکھ کر "مخزن" میں بھیج دیجئے۔ والسلام

آپ کا اقبال

۱۹۰۲ء

شکریہ انگشتری

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغاں انگشتری
دے رہی ہے مہر و الفت کا نشاں انگشتری
زینت دست حنا مالیدۂ جاناں ہوئی
ہے مثال عاشقاں آتش بجاں انگشتری
تو سراپا آیتے از سورۂ قرآن فیض
وقت مطلق اے سراج مہرباں انگشتری
میرے ہاتھوں سے اگر پہنے اسے وہ دل ربا
ہو رموز بے دلی کی ترجماں انگشتری

اِس نظم کے تیس (۲۳) شعر ہیں اور مقطع ہے:

گشت اے اقبال مقبولِ امیر ملک حسن
کردہ و امارا گرہ آخر ز کار انگشتری (۴)

منشی سراج الدین کی ادبی و علمی فضیلت کے بارے میں مولانا عبدالمجید سالک اپنی کتاب "سرگذشت" میں لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ کشمیر رزیڈنسی کے میر منشی سراج الدین لاہور آئے۔ میر صاحب پنجاب کے نہایت نمایاں اور ممتاز اہل ذوق میں سے تھے۔ بزرگوں کی اکثر محفلیں اِن کے لطائف اور اُن کی شعر خوانی سے آباد تھیں۔ وہ ڈاکٹر اقبال مولوی محرم علی چشتی، مولوی سید ممتاز علی، میاں محمد شاہ دین ہمایوں وغیرہ سب کے دوست تھے اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُنھیں اُردو اور

فارسی کے ہزارہا اچھے اشعار از بر تھے اور اُنہیں بر محل استعمال کرنے کا ملکہ بدرجہ اتم حاصل تھا۔" (۵)

(۶)

"اقبال نامہ" حصہ اول علامہ محمد اقبال کے منشی سراج الدین احمد کے نام چار خط محفوظ ہیں۔ پہلا خط شکریہ انگشتری کے ضمن میں ہے، دوسرے خط میں منشی صاحب کو کسی نظم کے مل جانے پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی ترتیب اشعار کی فکر اور ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ بیان کیا ہے کہ:

"ابر گہربار کی اصل علت کی آمد آمد ہے۔" (۶)

اور اس خط میں آگے چل کر علامہ اقبال لکھتے ہیں:

" ––– ابر گہربار شروع کرنے سے پیشتر میں نے اس خیال سے کہ کوئی وہابی اِس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے دے چند باتیں تمہید میں بھی کہی تھیں۔" (۷)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ نظم "ابر گہربار" علامہ محمد اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے اٹھارویں سالانہ اجلاس میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو پڑھی تھی اور ساتھ یہ کہا تھا کہ "ابر گہربار نعت عاشقانہ جناب سرورِ کائنات و فریاد امت بر آستانہ آں ذات بابرکات"۔

اِس جلسے کی صدارت خان بہادر غلام احمد خان مشیر مال ریاست جموں و کشمیر نے کی تھی۔ اِسی خط کے ہمراہ ایک غزل جس کا مطلع تھا:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

ارسال کی تھی۔ اِسی خط میں علامہ محمد اقبال نے صادق علی خان صاحب، عنبر صاحب اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام لکھا ہے۔ صادق علی خان اور عنبر کے بارے میں کچھ بتانا بے محل نہ ہو گا۔ صادق علی خان صادق کشمیر میں بہ سلسلہ ملازمت آئے تھے اور انجمن نصرت اسلام سرینگر کے ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ صاحب علم و دانش تھے۔ "مخزن" میں اِن کا کلام بالالتزام چھپتا تھا۔ انگریزی نظموں کا خوبصورت ترجمہ کرتے تھے۔

منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر کے دوستوں میں سے تھے "خمخانہ جاوید" میں اُن کا ذکر موجود ہے۔ اُن کا ایک شعر ہے:

اب کے صادق کو بھی چشم مست کے صدقے پلا
پھر بہار آنے کو ہے، ساقی بہار آنے کو ہے

ایک اور شعر ہے:

دیکھئے اب کے برس کس کس پہ یہ بجلی گرے
گھر سے باہر برقِ حسن بے قرار آنے کو ہے

ایک ملی شعر ہے:

ہے اصل اتحاد و ارتباط ملت بیضا
اِسی میں راز ہمت اور زورِ دست قدرت ہے
اِسی کو چھوڑ کر بگڑا تھا قومیت کا شیرازہ
اِسے حاصل کرو تو پھر وہی پہلی سی عزت ہے

منشی نور الدین عنبر کا تعلق جموں سے تھا۔ نائب تحصیل داری کے عہدہ پر فائز رہے۔

(۷)

خان صاحب میر خورشید احمد خورشید جن کے نام علامہ محمد اقبال کا خط "اقبال نامہ" میں ہے منشی سراج الدین کے عزیز تھے۔ اس خاندان کے ایک فرد شیخ محمد انور اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان، منشی سراج الدین احمد کے داماد تھے۔ ۱۹۷۸ء میں اُن کا اسلام آباد میں انتقال ہوا۔ "جاوید نامہ" کے انگریزی مترجم شیخ محمود احمد بھی منشی سراج الدین احمد کے داماد تھے۔ منشی نور الدین عنبر کے تین فرزند ذکا الدین، علاؤ الدین اور ضیاالدین ہیں۔ ذکاالدین محکمہ پولیس سے وابستہ تھے اور اُنھوں نے ہی ۱۹۴۶ء میں سرینگر میں پنڈت جواہر لال نہرو کو جو شیخ محمد عبداللہ کی "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کی حمایت میں کشمیر آئے تھے، گرفتار کیا تھا۔

(۸)

منشی سراج الدین کے نام علامہ محمد اقبال کا تیسرا خط ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا محررہ ہے وہ

مثنوی سے متعلق ہے اور اس میں منشی صاحب کے ذوقِ شعر کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہرحال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اُس سے بہتر ہے۔ محض ذوقِ شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اٹھا سکتا ہے جیسا کہ خود شاعر اور تصنیف کی شدید تکلیف اُسے اُٹھانی نہیں پڑتی۔" (۸)

اِسی خط میں علامہ محمد اقبال نے لکھا ہے کہ:

"انشاء اللہ دوسرے حصے میں (مثنوی میں) دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک اُن تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے۔" (۹)

چوتھا خط "ریویو" کے بارے میں ہے جو غلطی سے "زمیندار" میں چھپ گیا تھا۔ علامہ محمد اقبال کو منشی سراج الدین احمد کی وساطت سے اور منشی محمد الدین فوق کے ذریعہ کشمیر کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال ۱۸۹۶ء سے ہی کشمیر کی سیاسیات اور حالات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اُن کا مقصد کشمیری مسلمانوں کی پسماندگی اور جہالت کو دور کرنا تھا۔ یہاں پر اِس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ۱۹۲۴ء میں معززین کشمیر نے خواجہ سعد الدین شال کی سرکردگی میں جو تاریخی میمورنڈم وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کو کشمیر میں آمد کے موقع پر پیش کیا تھا اِس کے بارے میں "تاریخ حریت کشمیر" (حصہ اول) کے مصنف رشید تاثیر نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:

"کشمیری مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے رزیڈنٹ نے اپنے ہیڈ کلرک بابو سراج الدین کے ذریعے کشمیر کے چند سرکردہ مسلمانوں کو جن میں خواجہ سعد الدین شال، خواجہ مقبول پنڈت، خواجہ نور شاہ نقشبندی، خواجہ حسن شاہ نقشبندی، میر واعظ کشمیر مولوی احمد اللہ، میر واعظ کشمیری مولوی احمد اللہ ہمدانی، خواجہ سید حسن شاہ جلالی، اور چند دوسرے اکابرین شہر شامل تھے ایک میمورنڈم وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کو پیش کرنے پر آمادہ کیا جو اُن دنوں کشمیر کی سیر کو آئے تھے۔" (۱۰)

حقیقت یہ ہے کہ میمورنڈم ریذیڈنٹ کے اشارے پر نہیں بلکہ علامہ محمد اقبال کے ایما پر لکھا گیا تھا۔ اِس کو تیار کرنے والے لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس آغا حیدر تھے جو

علامہ محمد اقبال کے گہرے دوست تھے اور اُن دنوں تعطیلات گزارنے سرینگر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی دوستی منشی سراج الدین احمد سے بھی تھی اور خواجہ سعد الدین شال کے بھی رفیق تھے۔ چنانچہ خواجہ شال صاحب نے یہ میمورنڈم علامہ محمد اقبال اور منشی سراج الدین کی مرضی ومنشا سے اپنے رفقاء کار کی معیت میں وائسرائے ہند کو، مہاراجہ پرتاب سنگھ والی کشمیر کی موجودگی میں پیش کیا اور جلاوطنی کی سزا پائی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس تین رکنی کمیٹی نے خواجہ سعد الدین شال اور خواجہ نور شاہ نقشبندی کو جلاوطنی کی سزا دی تھی اِس کمیٹی کے ایک رُکن چودھری خوشی محمد ناظر مشیر مال بھی تھے۔

منشی سراج الدین کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا اور سرینگر میں پیوند خاک ہوئے۔

حواشی

۱۔ اقبال نامہ ا: ۲۳
۲۔ ادبی دنیا۔ کشمیر نمبر
۳۔ صحیفہ اپریل ۱۹۷۲ء
۴۔ سرود رفتہ ص ۶۰
۵۔ سرگزشت صفحہ ۲۱۲
۶۔ اقبالنامہ ا: ۲۰
۷۔ اقبالنامہ ا:۲۱
۸۔ اقبالنامہ ا: ۲۳
۹۔ اقبالنامہ ا: ۲۴
۱۰۔ اقبال اکتوبر/جنوری ۱۹۹۲ء

علامہ اقبال اور خان صاحب میر خورشید احمد

"انوار اقبال" میں علامہ محمد اقبالؒ کے سات خطوط میر خورشید احمد کے نام شامل ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں لکھے گئے۔ ایک اعتبار سے یہ مکاتیب بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں علامہ محمد اقبالؒ نے دینی اعتقاد اور نسبی و نسلی "عصبیت" کا ذکر کیا ہے۔ بشیر احمد ڈار نے میر خورشید احمد کا تعارف یوں کرایا ہے۔

"مکتوب الیہ جناب میر خورشید احمد اُن دنوں حکومت ہند کے محکمہ امور خارجہ میں ملازم تھے۔ پاکستان بننے کے بعد گلگت ایجنسی میں رہے۔ آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔"

"انوار اقبال" کو اقبال اکادمی کراچی نے مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بشیر احمد ڈار نے اُن خطوط کو اکٹھا اور مرتب کرنے کا کام بہت پہلے شروع کر دیا تھا اور جس وقت کتاب شائع ہوئی، اِس وقت میر خورشید احمد وفات پا چکے تھے۔ آپ کا انتقال جنوری 1958ء میں راولپنڈی میں ہوا اور وہیں پیوند خاک ہوئے ——

علامہ محمد اقبالؒ اور میر خورشید احمد کے تعلقات کس سن میں قائم ہوئے؟ اِس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک صداقت ضرور ہے کہ میر خورشید احمد ان چند افراد میں سے ایک تھے جن کے روابط علامہ محمد اقبال سے بیس کی دہائی میں استوار ہوئے۔ اور تازیست قائم و دائم رہے!

میر خورشید احمد، جیسا کہ بشیر احمد ڈار نے لکھا ہے کہ حکومت ہند کے محکمہ امور خارجہ سے وابستہ تھے اور کشمیر رزیڈنسی سے منسلک تھے۔ علامہ محمد اقبال ۱۹۲۱ء میں پہلی اور

آخری بار کشمیر گئے۔ اِس وقت میر خورشید احمد کشمیر ریذیڈنسی میں تھے اور خان صاحب منشی سراج الدین احمد بھی۔ خان صاحب میر خورشید احمد، بقول حبیب کیفوی:

"شروع میں کشمیر ریذیڈنسی سے منسلک تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے جب وہ فارن آفس شملہ میں معین ہو گئے تو دہلی میں اِن کا قیام رہتا۔ جہاں اُنہیں نامور ادیبوں اور شاعروں کی مجلسوں میں بیٹھنے اُٹھنے کا اتفاق ہوتا رہتا۔ دہلی میں جتنی مدت بھی وہ گزارتے اُن کا قیام نواب سراج الدین سائل کے ہاں ہوتا جن سے اُن کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ حکیم اجمل خان مرحوم کے ہاں بھی دہلی کے قیام کے دوران میں اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔ اِن بزرگوں کی صحبتوں میں خورشید صاحب کا مذاق سخن بڑا نکھر گیا تھا اور وہ بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ فن شعر پر اُنہیں بڑی دسترس تھی اور اہل زبان کی مجلسوں میں بیٹھ کر اُن کی زبان اور لب و لہجہ نے بڑا خوشگوار اثر قبول کیا تھا۔ اُن کا کلام "ہمایوں" اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ جموں اور کشمیر کی ادبی مجلسوں میں بھی کبھی کبھی وہ اپنا کلام سناتے۔ فرائض منصبی کے پیش نظر شاعری کی طرف اُن کی توجہ کم رہی۔ تاہم جو کچھ کہا اچھا کہا" (۱)

اِس سے عیاں ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے میر خورشید احمد کو ایک صاحب علم و دانش پایا اور اُن کے مذاق سخن کے پیش نظر ذاتی تعلقات قائم و استوار ہوئے۔

جناب حبیب کیفوی مرحوم نے اپنی کتاب "کشمیر میں اُردو" میں لکھا ہے کہ:

"انوار اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار صاحب میں علامہ اقبال کا اُن کے نام ایک خط درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ سے اُن کی خط و کتابت تھی۔" (۲)

حقیقت یہ ہے کہ "انوار اقبال" میں علامہ محمد اقبال کے خان صاحب میر خورشید احمد کے نام ایک خط نہیں بلکہ سات خط ہیں اور ہر خط اپنے اندر کئی مضامین رکھتا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ علامہ محمد اقبال ۱۹۲۱ء میں کشمیر گئے اور ۱۹۲۲ء میں خان صاحب میر صاحب میر خورشید احمد شملہ چلے گئے۔ اور اُن کا اِس وقت تک علامہ محمد اقبال سے سلسلہ مراسلت شروع ہو چکا تھا۔ علامہ محمد اقبال اِن ایام میں اکثر سیالکوٹ تشریف لے جاتے تھے

جہاں اُن کے والدین رہائش پذیر تھے۔ "انوار اقبال" میں جو پہلا خط درج ہے وہ سیالکوٹ سے ۲۵ اگست ۱۹۲۲ء کو لکھا گیا ہے"

علامہ محمد اقبال لکھتے ہیں:

"مکرمی!

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میں شملہ میں آفتاب دیکھنے کو ترس گیا۔ اِس کے علاوہ اندیشہ تھا کہ ہوا کی رطوبت سے نقرس عود نہ کر آئے۔

شعر زیرِ بحث کے متعلق یہ عرض ہے کہ دوسری پارٹی کا خیال صحیح ہے۔ اعتقادات کی بحث نہیں بلکہ فرقہ بندی کی بحث ہے۔ بعض اسلامی فرقے (خاصتہ" احمدی) مسیح و علی مرتضیٰ کو نصاریٰ کا خدا اور شیعوں کا علیؑ کہہ کر گالیاں دے لیتے ہیں۔ خود مرزا صاحب مرحوم نیز اُن کے مرید مولوی عبدالکریم نے شیعوں کی تردید میں یہی افسوس ناک طریقہ اختیار کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بہ خیر ہو گا چودھری محمد حسین صاحب سے سلام کہیے گا۔ والسلام محمد اقبال سیالکوٹ (۳)

بشیر احمد ڈار نے لکھا ہے کہ اقبال کی نظم "ابر گہربار" یا "فریادِ اُمت" کا ایک شعر ہے ؎

یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علیؑ شیعوں کا
ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو برا کہتے ہیں

غالباً اِس شعر کے مفہوم کے متعلق اختلاف تھا۔ اقبال سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے واضح کیا کہ اِس میں عقائد کی بحث نہیں بلکہ فرقہ بندی کی بحث ہے۔ مناظروں میں بعض اصحاب نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف برے انداز میں باتیں کرتے اور ٹوکا جاتا تو کہہ دیتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں کہتے بلکہ انجیلوں کے مسیح کو کہتے ہیں۔ یہی طریقہ بعض لوگوں نے حضرت علیؓ کے متعلق اختیار کر لیا تھا جیسا کہ اقبال نے خود اجمالاً اشارہ کر دیا ہے۔ گویا اقبال کا یہ شعر اِس طریق مناظرہ و گفتگو کے خلاف ہے۔" (۴)

علامہ محمد اقبال کا دوسرا خط ۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء کو لاہور سے لکھا ہوا ہے۔

مخدومی!

السلام علیکم۔ والا نامہ ملا۔ جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ مولوی عبدالسلام کی دونوں کتابوں سے میں بہت مستفیض ہوا۔ میری طرف سے اُن کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کیجئے۔ نیز التماس دعا بھی کیجئے۔ کرسمس کے دنوں میں دلی آنے کی اُمید نہیں۔ البتہ فروری میں ممکن ہے۔ انشاء اللہ العزیز مولوی صاحب سے بھی شرف نیاز حاصل ہو گا۔ غزل مطلوب کے جتنے اشعار یاد ہیں عرض کرتا ہوں۔

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں
دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ ترے فسانہ سوز میں نہ مری حدیث گداز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

شاید دو چار شعر اور ہوں گے۔ لیکن اس وقت یاد نہیں آئے۔ پھر عرض کر دوں گا۔ جو شعر آپ نے خط میں لکھا ہے معلوم نہیں کس کا ہے؟ مگر شعر خوب ہے۔ حضور سرور کائنات کو مخاطب کر کے چند اشعار میں نے لکھے تھے جو مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کیجئے۔ مجھے یقین ہے انہیں پسند آئیں گے۔

تیغ لا در پنجہ ایں کافر دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامہ الائے من

از سپہر بارگاہت یک جہاں وافر نصیب
جلوۂ داری دریغ از وادی سینائے من
با خدا در پردہ گویم باتو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من

مخلص محمد اقبال لاہور
۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء

یاد رہے کہ غزل "کبھی اے حقیقت منتظر" "بانگ درا" میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں تیسرے شعر کا آخری مصرع یوں ہے۔

نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں

نیز "بانگ درا" میں ایک شعر زائد ہے۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل ہے صنم آشنا تجھ کیا ملے گا نماز میں

اور فارسی نعت "پیام مشرق" میں درج ہے۔

اس خط میں مولوی عبدالسلام کا ذکر ہے۔ یہ مولوی عبدالسلام نیازی ہیں جو دہلی میں رہتے تھے اور علامہ محمد اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ کتاب "یادوں کے سائے" میں سید مقصود زاہدی لکھتے ہیں:

"مولوی صاحب علامہ اقبال کے اشعار کو بڑی دلچسپی اور بہت ذوق و شوق کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ اور انہیں علوم مشرق و مغربی کی پوٹ کہا کرتے تھے۔ خود علامہ اقبال بھی مولوی صاحب سے بہت عقیدت مندانہ انداز میں ملا کرتے تھے۔ کبھی لاہور سے عازم دہلی ہوتے تو مولوی صاحب کو بطور تحفہ دینے کے لئے کچھ کبوتر لے جایا کرتے۔ مولوی صاحب کو بھی علامہ اقبال کی طرح کبوتروں سے بڑا پیار تھا اور سننے میں آیا ہے کہ وہ کبوتروں کی مختلف نسلوں اور اُن کی جدا جدا خصوصیات پر گھنٹوں گفتگو کر سکتے تھے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ علامہ اقبال نے جس قلندر کا مثالی کردار بار بار اپنی شاعری میں پیش کیا ہے کہیں وہ مولوی عبدالسلام صاحب ہی کا تاثر تو نہیں تھا۔ جو

حضرات مولوی صاحب کی صحبت میں زیادہ اُٹھتے بیٹھتے تھے اُنھوں نے کئی ایسی چشم دید مجلسوں کا حال سنایا جن میں علامہ اقبال مولوی صاحب کے پاس بیٹھے گھنٹوں مختلف علمی اور روحانی مسائل اور موضوعات پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کو مولوی صاحب سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ اکثر اُن کی گفتگو بالکل رازدارانہ انداز میں سرگوشیوں میں ہوا کرتی تھی جس سے حاضرین مجلس سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔"(۶)

مولوی صاحب عبدالسلام نیازی کا انتقال دہلی میں ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ اُن کے معتقد جوش ملیح آبادی بھی تھے۔ اُنھوں نے "یادوں کی برات" میں لکھا ہے:

"وہ مشرقی علوم کے حرف آخر، انسان اور شہنشاہ تھے۔ قرآن، حدیث، منطق، حکمت، تصوف، عروض، بیان، علم الکلام۔ تاریخ۔ تفسیر، لغت۔ لسانی قواعد ادب اور شاعری کے امام تھے۔ جید عالم ہونے کے باوجود علمائے سو کے تشابہ سے بچنے کی خاطر اُنھوں نے داڑھی، مونچھ کا صفایا کرا دیا تھا۔ وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے مزارات کے چکر لگاتے اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔"(۷)

قیام دہلی کے دوران جیسا کہ علامہ محمد اقبال کے خط سے ظاہر ہے میر خورشید احمد مولوی عبدالسلام نیازی سے ملتے تھے اور مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی مرضی و منشا کے بغیر کسی کو اپنی صحبت میں آنے اور بیٹھنے نہیں دیتے تھے جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ:

"ایک بار میں اُن کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک وردی پوش نوجوان نے آکر کہا کہ نیچے ہزہائی نس —— کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو حاضر ہوں۔ اُنھوں نے کہا۔ اگر وہ میرے سامنے آکر یہ کہیں کہ میرے تاج سے عبدالسلام کی جوتی اُونچی ہے تو شوق سے آئیں ورنہ گاڑی بڑھا دیں۔ ہزہائی نس کی عقیدت دیکھیے وہ اُوپر آئے۔ اُنھوں نے وہ الفاظ بڑے خلوص سے

ادا کیے اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئے ——"

علامہ محمد اقبال نے اِسی مرد درویش کو نعت رسول مقبول ﷺ میر خورشید احمد کی وساطت سے ارسال کی تھی۔

خان صاحب میر خورشید احمد کے نام علامہ محمد اقبال کا تیسرا خط ۲۶ مئی ۱۹۲۳ء کو لاہور سے لکھا ہوا ہے۔

مخدومی!

تسلیم —— سائل صاحب (دہلوی) کا جواب میری رائے ناقص میں صحیح ہے۔ اصل عربی لفظ درہ (درۃ التاج) ہے۔ جمع اِس کی دار آتی ہے اور شاید داری بھی۔ فارسی میں بغیر تشدید بھی لکھتے ہیں۔ در ثمین، در مکنون، در یتیم، در خوشاب، در شاہوار، در نایاب، جہاں تک مجھے معلوم ہے سب درست ہیں۔

اگر اُن ترکیبوں میں در یکتا وغیرہ مع التشدید بھی لکھیں تو بھی درست ہیں۔ افسوس ہے سند اِس کی مجھے کوئی یاد نہیں۔ اگر مطالعہ میں آ گئی تو لکھ بھیجوں گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ دُرِ یکتا اور دُرِ یکتا دونوں درست ہیں۔ نیاز صاحب فتح پوری کا استدلال صحیح نہیں۔ معلوم ہوتا قانی نے ایزد یکتا (حالانکہ یکتا ایزد کی صفت معنانہ ہونی چاہئے) اور رخ یکتا بھی لکھا ہے۔ ایسی صورت میں دُرِ یکتا میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔

ساقی نامہ و کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ افسوس ہے ہندوستان سے فارسی رخصت ہو گئی۔ سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہو گی کیونکہ ایک زمانہ میں کشمیر ایران کا ہمسر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاق اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ دکھڑے کی بنا بھی واقعات پر ہے جن کا میں نے کشمیر میں خود مشاہدہ کیا۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہیں نہ کشامرۂ پنجاب جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

اُن کے لیے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آباو اجداد اہل خطہ میں سے ہیں۔ شملہ میں —— کے لئے حاضر ہونا پڑے گا مگر معلوم نہیں یہ رسم کب ادا کی جائے گی۔

محمد اقبال لاہور

۲۶ مئی ۱۹۲۳ء

اِس خط میں جو نکات اُٹھائے گئے ہیں وہ یوں ہیں۔

(اول) نظم ساقی نامہ پر اعتراض

(دوم) کشمیر کے حالات کا خود مشاہدہ کیا

(سوم) شملہ میں تقریب کا انعقاد

علامہ محمد اقبال کی نظم "ساقی نامہ" پیام مشرق میں موجود ہے۔ یہ نظم دیگر دو نظموں "کشمیر" اور "غنی کشمیری" کے ساتھ قیام سرینگر کے دوران ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی۔ نظم ساقی نامہ تو نشاط باغ کشمیر میں بیٹھ کر لکھی جس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا۔ اِس نظم کے بیس اشعار ہیں۔ یہ نظم فارسی میں ہے۔ بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں۔ "ساقی نامہ" پیام مشرق، کی مشہور نظم ہے جو اقبال نے نشاط باغ کشمیر میں کہی تھی۔ اِس میں بہار کا منظر پیش کرنے کے بعد ساقی (خدا) سے دعا کی گئی ہے کہ وہ باشندگان کشمیر کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرے۔ اِس کے چند اشعار جنہیں ہجو تصور کیا گیا ہے یہ ہیں۔

کشیری کہ بابندگی خوگرفتہ
بتے می تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامہ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینہ او دل بیقرارے

ازاں مے فشاں قطرۂ ہر کشیری

کہ خاکسترش آفریند شرارے

یہ عجیب بات ہے کہ اِس نظم کی اشاعت کے بعد ہی تحریک حریت کشمیر کا آغاز ہوا اور ریشم خانہ کے مزدوروں نے ہڑتال کر کے زبردست مظاہرے کئے اور حکومت نے ان پر تشدد کیا —— اور تحریک چل نکلی۔ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے اور اِسی سال لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کشمیر آئے اور معززین کشمیر نے اُن کو مہاراجہ پرتاب سنگھ کی موجودگی میں ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کشمیریوں کے جملہ مصائب و مسائل کا تذکرہ تھا۔ بعد میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے کشمیری معززین کو گرفتار کر لیا۔ اُن کی جائیدادوں کو ضبط کر لیا اور خواجہ سعدالدین شال اور خواجہ نورالدین نقشبندی کو جلاوطن کر دیا۔ بعد میں اُن دونوں کی وطن واپسی ۱۹۲۶ء میں علامہ محمد اقبال کی کوششوں سے ہوئی —— !

جن دنوں علامہ محمد اقبال کشمیر گئے میر خورشید احمد وہاں پر موجود تھے اور جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ علامہ محمد اقبال نے وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ کشمیریوں کی محکومی اور مقہوری کو دیکھا اور اُنہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی جمیل کی۔ لہٰذا علامہ محمد اقبال نے جو کچھ نظم مذکور میں کہا ہے وہ حقائق کی عکاسی ہے۔ جہاں تک شملہ میں تقریب کا تعلق ہے، یہ سر کا خطاب ملنے کی تقریب کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھا خط مختصر ہے ؎

بر بنا گوشِ تو اے نیک تر ازو دریتیم

سنبل تازہ ہمے برد مرا ز نقرۂ سیم (فرخی)

اِس شعر سے ظاہر ہے کہ دُر مع التشدید واحد ہے کہ اِس کی صفت میں لفظ یتیم واقع ہوا ہے جس کے معنی بے نظیر و یکتا کے ہیں۔ والسلام

محمد اقبال از لاہور

۳۱ مئی ۱۹۲۳ء

تیسرے خط میں جو یہ لکھا تھا کہ کوئی سند یاد نہیں آ رہی اگر مطالعہ میں آ گئی تو لکھ بھیجوں گا —— والا وعدہ پورا کر دیا —— پانچواں خط بھی اِسی موضوع پر ہے۔

مکرمی!

تسلیم۔ لفظ دُر مع التشدید جمع نہیں بلکہ واحد ہے میں آج قصیدہ بردہ پڑھ رہا تھا۔ اِس میں یہ شعر نظر آیا۔

فالدر یزداد حسناً وھو منتظم
ولیس ینقص قدراً غیر منتظم

یعنی موتی حسن کے اعتبار سے بڑھ جاتا ہے۔ جب سلسلہ میں منسلک ہو اگر منسلک نہ ہو تو بھی اِس کی قدر گھٹتی نہیں۔ ایسی صورت میں دُرِ یکتا کیونکر غلط ہو سکتا ہے؟ اگر یہ لفظ جمع ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یکتا کا لفظ اِس کی صفت نہیں ہو سکتا۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

یکم جون ۱۹۲۳ء (۱۰)

چھٹا خط بھی لاہور سے لکھا گیا ہے تحریر کی تاریخ ۲۰ جون ۱۹۲۳ء ہے علامہ محمد اقبال لکھتے ہیں۔

مکرم بندہ!

السلام علیکم مجھے کوئی اعتراض نہیں، جہاں آپ چاہیں چھپوائیں۔

"ہمایوں" بھی اچھا رسالہ ہے۔

امام شرف الدین کا لقب ہے۔ عربوں میں تخلص کا دستور نہ تھا۔ میں نے مثنوی رموزِ بیخودی میں بھی اُن کا ذکر کیا ہے۔

اے بعیری را ردا بخشندہٗ بربطِ سلمیٰ مرا بخشندہٗ

محمد اقبال لاہور

۲۰ جون ۱۹۲۳ء (۱۱)

ساتواں خط ۲۶ جون ۱۹۲۳ء کو لکھا گیا

مکرمی جناب خورشید!

امین صاحب کا میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔ قطعہ اُن کا بہت اچھا ہے۔ کسی اخبار میں اُس کی اشاعت کر دیجئے۔ شاید "زمیندار" اِس مطلب کے لئے بہتر ہو گا۔

تعجب ہے عربی شعر جناب (نگار) کسی عجمی کا بتاتے ہیں۔ وہ شعر حضرت بصیری رحمتہ اللہ علیہ کا ہے جو مصر کے مشہور شعرا میں سے ہیں۔ اُن کا نام امام شرف الدین ہے۔ چھٹی صدی کے آخر میں مکہ میں پیدا ہوئے اور ساتویں صدی کے وسط میں بمقام قاہرہ اُن کا انتقال ہوا۔ خالص عرب تھے۔ مشہور قصیدہ بردہ جس کا لوگ ورد کرتے ہیں، انہی کی تصانیف سے ہے۔

والسلام

میں انشاء اللہ اگست میں شملہ آؤں گا —— محمد اقبال

۲۶ جون ۱۹۲۳ء (۱۲)

خط میں جناب "نگار" سے مراد نیاز فتح پوری ہیں —— اور امین صاحب سے مراد امین حزیں سیالکوٹی ہیں۔ یہ بھی کشمیر رزیڈنسی سے وابستہ بلکہ پولیٹکل ایجنٹ تھے۔ اُن کو بھی خان صاحب کا خطاب ملا ہوا تھا۔ آپ اُردو کے مشہور ممتاز شاعر اثر صہبائی کے بڑے بھائی تھے۔

میر خورشید احمد کے بارے میں "کشمیر میں اُردو" میں یہ معلومات درج ہیں:

"جموں کے محلہ تالاب کٹھیکاں میں رہتے تھے۔ بڑے وجیہہ، جامہ زیب اور خوش ذوق آدمی تھے۔ سوٹ بھی زیب تن کرتے، لیکن عموماً تنگ چوڑی کا پاجامہ، شیروانی، اور ترکی ٹوپی ان کا لباس تھا جو ان پر خوب پھبتا تھا۔ دلی والوں کے لہجہ میں گفتگو کرتے اور اور شائستگی کا نمونہ بنے رہتے۔" (۱۳)

میر خورشید احمد سرینگر، شملہ، دہلی کے علاوہ ایک عرصہ تک گلگت میں اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ رہے۔ دہلی میں اُن کی صحبت حکیم اجمل خان، مولوی عبدالسلام نیازی اور نواب سراج الدین سائل سے رہتی۔ زندگی کا بیشتر حصہ سرینگر میں بسر ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد عرصہ فارن آفس کراچی اور پھر پشاور میں فرنٹیر کورز میں اسسٹنٹ فنانشل سیکرٹری کے منصب پر فائز ہوئے۔ ملک کے نامور ادیبوں شاعروں اور سیاست دانوں سے ذاتی تعلقات تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں رہائش پذیر ہوئے۔ نہایت پرخلوص مخیر اور ہمدرد انسان تھے۔ آپ کے تین بیٹے اور ایک دختر ہے۔ بڑے بیٹے حسن خسرو میر آزاد کشمیر کے چیف انجینئر رہے ہیں۔ منجھلے پاکستان کے سابق وفاقی وزیر خورشید حسن میر

مرحوم اور چھوٹے پروفیسر طالب خورشید سابق فرسٹ سیکرٹری محکمہ خارجہ پاکستان ہیں۔
دختر سلیمہ بیگم سرینگر میں ہیں۔

حواشی

۱۔ کشمیر میں اُردو ص ۳۰۹
۲۔ کشمیر میں اُردو ص ۳۱۰
۳۔ انوار اقبال ص ۱۴۸
۴۔ انوار اقبال ص ۱۴۸
۵۔ انوار اقبال ص ۱۴۹۔ ۱۵۰
۶۔ یادوں کے سائے میں ص ۱۴۴۔ ۱۴۵
۷۔ یادوں کی برات صفحہ ۵۵۳
۸۔ انوار اقبال ص ۱۵۰۔ ۱۵۲
۹۔ انوارِاقبال ص ۱۵۲
۱۰۔ انوار اقبال ص ۱۵۳
۱۱۔ انوار اقبال ص ۱۵۳
۱۲۔ انوار اقبال ص ۱۵۴
۱۳۔ کشمیر میں اُردو ص ۳۰۹

علامہ اقبال اور میاں امیر الدین

خطہ کشمیر اپنے نظر نواز نظاروں اور جنت نشاں مرغزاروں کے باعث ہمیشہ ہی اہل دل اور اہل نظر انسانوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ ارضِ جمیل جہاں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے وہاں اِس کی کوکھ سے بے شمار اہل علم و دانش بھی پیدا ہوئے جنھوں نے نسل انسانی کی بہتری کے لئے مثالی کارنامے سرانجام دیے — ایسے ہی بزرگوں میں ایک پاکستان کے بزرگ سیاست دان میاں امیر الدین ہیں جو انجمن حمایت اسلام اور "مرکزیہ مجلس اقبال" جیسے اداروں کے صدر رہے۔

میاں امیر الدین کے آباؤاجداد کا تعلق موضع دمحال ہانجی پورہ تحصیل کولگام سے تھا۔ یہ خاندان اپنی اسلام دوستی، رواداری اور شرافت کے لئے وادی بھر میں مشہور تھا۔ اُن کا سلسلہ ارادت حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین رشی ولیؒ سے ملتا ہے — حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کا شمار برصغیر کے اُن عظیم صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے زمانے میں رشد و ہدایت کے چشمے جاری کیے اور خلق خدا کو شرک و بدعت کے راستے سے ہٹایا۔

کشمیر اور بیرونِ کشمیر شیخ نور الدین رشی ولیؒ کے ارادت مندوں، خلفا اور اولاد کو رشی ہی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ لفظ رشی کوئی ذات یا گوت نہیں بلکہ یہ اہل اللہ یا زہاد کے اُس طبقے کو کہا جاتا ہے جو خدائے واحد اور لاشریک کی وحدانیت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ "تاریخ کشمیر" میں جن رشیوں کا ذکر آیا ہے اُن میں میر، بٹ اور زمیندار بھی شامل ہیں!

موضع دمحال ہانجی پور میں میاں امیر الدین کے بزرگوں کی زمینیں محفوظ ہیں۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق میاں امیر الدین کے جد اعلیٰ محمد اسحاق شیخ علاقہ کے بڑے زمینداروں میں سے تھے جو بہت ہی نیک اور دیندار انسان تھے۔ یہ نومسلم تھے اور اُن کا تعلق کشتواڑ کے راجگان سے تھا، چونکہ شیخ نور الدین رشی ولیؒ کے سلسلہ میں بیعت تھے، اِس لیے رشی بھی کہلاتے تھے۔ وہ شیخ العالم کے خلیفہ چہارم بابا نصر الدین رشی کے خاص مرید تھے۔ اُنہیں بھی علامہ اقبالؒ کے جد اعلیٰ بابا لول حج کے مانند حج کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی کئی حج کیے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کے بزرگ بھی اُنہی کے خلیفہ کے مرید خاص تھے۔ اِس اعتبار سے علامہ اقبالؒ بھی رشی تھے۔ گو اِن کی گوت سپرو (برہمن) تھی۔ اِس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب ایک بار سر رابندر ناتھ ٹیگور لاہور آئے اور کوئین میری کالج میں اُن کا ایک لیکچر تھا وہاں پر اُنہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ لاہور میں کشمیر کے مسلمان رشیوں کا ایک خاندان آباد ہے۔ چنانچہ وہاں پر ڈاکٹر ٹیگور سے میاں امیر الدین کی بچی کو ملایا گیا جو اِس وقت وہاں زیر تعلیم تھی۔ اب وہ بیگم میجر جنرل ریاض حسین مرحوم ہیں۔ بہرحال "رشی نامہ" میں یہ مذکور ہے کہ لفظ رشی دراصل "رکھی" ہے اور سنسکرت زبان میں اِس کے معنی تارک الدنیا لوگوں یا خدا تعالیٰ کی یاد میں مشغول انسانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

تاریخ کشمیر کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ریاست میں میاں امیر الدین کا خاندان بااثر اور بارسوخ تھا اور جب کشمیر پر افغان قابض ہوئے اور اُنہوں نے کشمیری عوام پر مظالم ڈھانے شروع کیے تو میاں صاحب کے بزرگ خاموش نہ رہے، جن پر افغان حکمرانوں نے اُنہیں شہید کر دیا۔ چنانچہ آج بھی اِن کی قبر و محال ہانجی پورہ کی پرانی مسجد کے صحن میں موجود ہے۔ لہٰذا حکمران طبقے کے مظالم سے تنگ آ کر یہ خاندان ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ ابتدا میں اُنہوں نے جموں کے موضع اکھنور میں دریائے چناب کے کنارے گھر بنایا۔ روایت ہے کہ کشمیر سے آتے ہوئے اُن کے ایک بزرگ نے چند اشرفیاں رکھ لی تھیں۔ اُن کا نام رسول بخش چودھری تھا جنہیں کشمیری رُسلا چودھری کہتے تھے! ریاست میں خود کو غیر محفوظ جانتے ہوئے اُنہوں نے سیالکوٹ میں ہجرت کی۔ یہ وہی وقت ہے جب علامہ اقبالؒ کے بزرگوں نے بھی کشمیر سے ترک سکونت کیا تھا۔ رسول بخش چودھری، میاں امیر

الدین کے پرداداتھے اور اُن کے جس بیٹے نے پنجاب اور کشمیر میں اپنا نام پیدا کیا وہ میاں کریم بخش رئیس لاہور تھے جن کے نام کی مسجد آج بھی لاہور میں موجود ہے۔ آپ بڑے مخیر انسان تھے۔ اِن کے ایک بھائی میاں رحیم بخش تھے جن کے فرزند کا نام میاں عبدالصمد تھا جو لاولد تھے اِس لیے اُنھوں نے اپنی جائیداد حضرت شاہ غوث محمدؒ اور بادشاہی مسجد کے نام وقف کردی تھی جو آج کل محکمہ اوقاف پنجاب کی تحویل میں ہے۔

میاں کریم بخش مرحوم جنھیں لاہور میں علامہ اقبالؒ کو متعارف کرانے کا شرف حاصل ہے۔ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ اُس وقت صوبائی دربار کے رکن تھے۔ کنھیا لال اور عبداللطیف دونوں نے اپنی اپنی تاریخ لاہور اور تاریخ پنجاب میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ جب لاہور میں میونسپلٹی قائم ہوئی تو وہ اِس کے رکن بنے۔ اور تازیست اِس منصب پر فائز رہے۔ یہ وہی میاں کریم بخش ہیں جن کا شمار بانیانِ انجمن حمایت اسلام، اور انجمن اسلامیہ پنجاب میں سے ہوتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اُنھوں نے مجلس "کشمیری مسلمانانِ لاہور" کی داغ بیل ڈالی۔ میاں کریم بخش متقی پرہیزگار اور مخیر انسان تھے، علم و ادب سے بھی شغف تھا۔ اُنھوں نے ہی اپنے گھر مہمان رکھ کر پنجابی زبان کے مشہور شاعر عبدالستار سے "قصص المحسنین" لکھوائی جس کا اعتراف اِس نے یوں کیا ہے۔

باجھ حساباں حمد خدا نوں جس نے بخشی یاری
کر کے فضل تیار کرائی ایہہ تصنیف پیاری
میاں کریم بخش پر ہووے رحمت فضل جناباں
کوشش کر جس عملوں فضلوں حصہ لیا حساباں

"تاریخ لاہور" میں مذکور ہے کہ میاں کریم بخش نے کشمیر کے قحط سے ستائے ہوئے انسانوں اور سیلاب زدگان کی بے حد امداد اور اعانت کی جس کا اعتراف حکومت نے اس شکل میں کیا کہ علاقہ سمندری میں ایک بڑا قطعہ اراضی اور جنگل دیا جسے میاں کریم بخش نے قبول نہ کیا اور کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، اپنے خدا کی خوشنودی کے لئے کیا ہے، اور وہی مجھے اَجر دے گا۔ میاں کریم بخش ۱۹۰۴ء میں انتقال کر گئے۔

میاں امیرالدین، میاں کریم بخش کے منجھلے بیٹے میاں جلال الدین کے فرزند ارجمند

ہیں۔ اُن کی شخصیت و کردار پر اپنے دادا مرحوم کی چھاپ ہے۔ میاں صاحب کی پرورش اپنے داد مرحوم کی نگرانی میں ہوئی۔ چونکہ علامہ اقبالؒ کے مراسم اِس خاندان سے بہت دیرینہ تھے، اِس لیے میاں صاحب نے اپنی اوائل عمر میں ہی علامہ اقبالؒ کو اپنے گھر پر دیکھا۔ علامہ اقبال، میاں امیر الدین کے تایا اور خسر میاں نظام الدین کے گہرے دوست تھے۔ چنانچہ میاں صاحب کا گھر جسے "بارود خانہ" کہا جاتا ہے، پنجاب، کشمیر اور ہندوستان کی تحریکوں کا مرکز رہا۔ اِس لیے اِس دور کے تمام بڑے بڑے زعما کرام "بارود خانہ" تشریف لاتے تھے۔ میاں نظام الدین، اعلیٰ ادبی و علمی ذوق کے مالک تھے۔ ممتاز ناول نگار اور افسانہ نویس میاں ایم۔ اسلم، انہی کے فرزند تھے جنھوں نے تحریک پاکستان کے لیے قلمی جہاد کیا، اور سو سال عمر پا کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ ۱۹۲۴ء میں جب ڈوگرہ حکومت نے کشمیر کے دو رہنماؤں خواجہ سعد الدین شال اور سید نور شاہ نقشبندی کو جلاوطن کیا تو اُنھوں نے یہ دور لاہور میں میاں صاحب کے ہاں ہی بسر کیا۔ چنانچہ امیر الدین نے راقم کو بتایا کہ جو میمورنڈم اِن کشمیری لیڈروں نے وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کو دورۂ کشمیر کے موقع پر پیش کیا تھا وہ علامہ اقبالؒ ہی کی تحریک پر لاہور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس آغا حیدر مرحوم نے تحریر کیا تھا۔ چونکہ اِن کشمیری لیڈروں کے علامہ اقبالؒ کے ساتھ مراسم تھے، اِس لیے اُنھوں نے علامہ اقبالؒ کے مشورے سے یہ میمورنڈم وائسرائے ہند کو پیش کیا جس میں کشمیری عوام کی ناگفتہ بہ حالت اور ڈوگرہ حکومت کی سختیوں کا ذکر ہے۔ ازاں بعد جب اِن افراد کو جلا وطن کیا گیا اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں تو علامہ اقبال کو بہت دُکھ ہوا۔ اِس واقعے کے کچھ عرصہ بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ والی ریاست مر گیا اور اِس کی جگہ مہاراجہ ہری سنگھ تخت نشین ہوا جو علامہ اقبال کے دوست نواب طالع محمد آف پالن پور کا عزیز دوست تھا۔ علامہ اقبال نے نواب پالن پور کی وساطت سے اِن لیڈروں کی جلا وطنی ختم کرائی۔

میاں امیر الدین کے دادا میاں کریم بخش اور بعض دوسرے سربرآوردہ کشمیری لیڈروں نے مسلمانوں میں شعورِ آزادی پیدا کرنے اور اُن کے مسائل و معاملات کو حکومت ہند تک پہنچانے اور پنجاب اور دیگر صوبوں اور اضلاع میں پناہ گزیں کشمیریوں کے امور و مسائل کو سرانجام دینے کے لئے ۱۸۹۶ء میں "مجلس کشمیری مسلمانانِ لاہور" قائم

کی- اِس سے قبل ۱۸۹۴ء میں اِسی نوعیت کی ایک تنظیم گجرات میں "انجمن خیر خواہانِ کشمیریاں" بھی وجود میں آ چکی تھی- جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے، یہ وہی دور تھا جب وہ نئے نئے لاہور میں بغرضِ تعلیم وارد ہوئے تھے- بقول میاں امیرالدین "ہمارے بزرگوں اور علاوہ اقبالؒ کے بزرگوں کے مراسم قائم تھے جو درحقیقت وادیِ کشمیر ہی سے شروع ہو گئے تھے کیونکہ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ جس دور میں ہمارے بزرگوں نے افغانوں کے مظالم سے تنگ آ کر ریاست کو چھوڑا تو اِسی زمانہ میں علامہ اقبال کے آباؤ اجداد بھی اِن کے ہمراہ آئے اور یہ سبھی سیالکوٹ میں بس گئے-"

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ میاں امیرالدین کے پردادا چودھری رسول بخش کی شادی سیالکوٹ میں حضرت امام علی الحقؒ کے سجادہ نشینوں کے گھرانے میں ہوئی جو سیالکوٹ کے مسلمانوں کا بارسوخ خاندان تھا — بہرحال لاہور میں "مجلس کشمیری مسلمانانِ لاہور" قائم ہوئی تو اِس میں نوجوان اقبال جو گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے، شامل ہو گئے- اُنہوں نے اِس موقع پر ایک طویل نظم لکھی جو "باقیاتِ اقبال" — اور "سرود رفتہ" دونوں میں شامل ہے-

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں
ملے گا منزل مقصود کا پتا ہم کو
خدا کا شکر کہ جس نے دیئے یہ راہ نموں

بعد میں یہی انجمن "انجمن کشمیری مسلمانان"، "مسلم کشمیری کانفرنس" اور "پاکستان کشمیری کانفرنس" کے ناموں سے زندہ رہی- علامہ اقبال ازاں بعد ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۸ء تک "مسلم کشمیری کانفرنس" میں برابر حصہ لیتے رہے- اِس کا تمام ریکارڈ الحمدللہ محفوظ ہے- اِس کانفرنس ہی کے وظائف سے کشمیری طلبا نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی جن میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور شیخ محمد انور ایسے ممتاز لوگ شامل ہیں- یہ ریکارڈ میاں امیر الدین صاحب کی تحویل میں ہے-

میاں امیرالدین نے راقم کو بتایا کہ جب ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں تحریک حریت چلی تو علامہ اقبالؒ سخت بے چین ہوئے- شملہ میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے نمائندوں کا

اجلاس ہوا جس میں "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" معرضِ وجود میں آئی۔ اس کانفرنس میں سید محسن شاہ کے ہمراہ میں بھی شریک ہوا۔ ابتداء میں اس کمیٹی پر جماعت احمدیہ کا اثر و رسوخ تھا اور وہ تحریک کشمیر کو اپنے طور پر اپنے مخصوص مقاصد کے لئے چلانا چاہتے تھے جس سے ہم سب پریشان ہوئے خاص طور پر علامہ اقبال۔

کشمیر سے ایسی خبریں آنے لگیں کہ شیخ محمد عبداللہ جماعت احمدیہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔

"چنانچہ علامہ اقبال نے مجھے اور امرتسر کے مشہور لیڈر شیخ محمد صادق (والد ماجد شیخ مسعود صادق مرحوم) کو سرینگر بھیجا۔ ہم دونوں سرینگر گئے اور وہاں سے خواجہ سعد الدین شال کو ساتھ لیا اور شیخ محمد عبداللہ سے ایک ہوٹل میں ملے ـــ جب ہم نے شیخ محمد عبداللہ سے اس بات کا ذکر کیا تو یہ سن کر حیران رہ گئے اور ہمیں ایک بیان لکھ کر اپنے دستخطوں سے دے دیا۔

"میں عقیدہ کے اعتبار سے نہ لاہوری ہوں اور نہ ہی قادیانی اور صحیح العقیدہ مسلمان ہوں اور ختم نبوت پر کامل ایمان اور یقین رکھتا ہوں۔"

جب ہم نے یہ تحریر لکھوائی تو شیخ صاحب کو مذاق میں کہا کہ اب آپ رہا ہیں۔"

تحریک حریت کشمیر، کے بارے میں میاں امیر الدین نے بتایا کہ حضرت علامہ اقبالؒ کو کشمیریوں سے بے حد محبت تھی اس کی وجہ تو یہ تھی کہ ان کے آباؤ اجداد کا وطن کشمیر تھا۔ دوسرے بحیثیت مسلمان وہ کشمیریوں کو مظلوم و مقہور سمجھتے تھے۔ وہ ان میں جذبہ حریت اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ یہاں، ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جب مجلس احرار اسلام نے تحریک کشمیر کے مسئلہ پر چندہ جمع کیا تو علامہ اقبالؒ نے مجھے اور ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر مرحوم کو چودھری افضل حق مرحوم کے پاس بھیجا اور کہا یہ سارا چندہ شیخ محمد عبداللہ کو دے دو کیونکہ وہ کشمیری مسلمانوں کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن وہ نہ مانے۔ خود علامہ اقبال نے کشمیری سیاسی اسیروں کے مقدمات کے اخراجات کے لیے کئی لوگوں کو ذاتی طور پر خطوط لکھے جن میں نواب بہادر یار جنگ (حیدر آباد) اور پٹنہ کے وکیل نعیم الحق قابل ذکر ہیں۔

علامہ اقبال کا ذکر جمیل کرتے ہوئے میاں امیر الدین نے فرمایا کہ میں نے علامہ اقبال کی سب سے پہلی نظم "نالہ یتیم" گیارہ برس کی عمر میں سنی تھی۔ علامہ اقبالؒ ہمارے ہاں اکثر 'بارود خانہ' میں آتے تھے۔ اِن کے ہمراہ بعض اوقات خواجہ دل محمد مرحوم ہوتے — میاں نظام الدین مرحوم کے جو میرے تایا تھے، اُن سے دوستانہ مراسم تھے۔ وہاں اکثر آموں کی پارٹی ہوتی تھی — مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خان کے ساتھ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی بھی آموں کی پارٹی میں شریک ہوتے تھے۔ ایک بار علامہ اقبال نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی آم خوری پر فرمایا:

انبہ را کہ نکردند دریں باغ نگاہ
جائے او باد بنارِ شکم عبداللہ

یہ جولائی ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے، علامہ اقبال نے ہمارے باغ کے ایک اعلیٰ قسم کے آم کا نام "ٹیپو" رکھا ہوا تھا۔

۱۹۰۵ء میں جب کانگڑہ میں زلزلہ آیا تو علامہ اقبالؒ اُن دنوں بھاٹی دروازہ کے اندر رہتے تھے۔ اِس واقعے کے بارے میں اُن کے خادم علی بخش نے مجھے بتایا کہ میں زلزلہ کے خوف سے کبھی اِدھر دوڑتا اور کبھی اُدھر — علامہ اقبال نے فرمایا — "علی بخشا دوڑ نہ — پوڑیاں (سیڑھیوں) دے تھلّے کھڑا ہو جا — اور خود آرام سے لیٹے رہے۔ یعنی اِن پر زلزلہ کا کوئی ذرا سا خوف مسلط نہ تھا۔

میاں امیر الدین نے فرمایا — علامہ اقبال نہرو رپورٹ کے سخت خلاف تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب راجہ صاحب محمود آباد اُن سے ملنے آئے تو آپ نے ملاقات نہ کی کیونکہ راجہ صاحب نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی تھی۔"

میاں صاحب نے مزید بتایا — کہ ایک بار علامہ اقبالؒ نے ڈاکٹر مختار الدین انصاری کو خط لکھا — "کیا واقعی آپ کو یہ یقین ہو چکا ہے کہ دینِ اسلام مسلمانوں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔"

غازی علم الدین شہید کے مقدمہ کے دوران لوگ آپ کے پاس آئے کہ اگر آپ کہہ دیں تو علم الدین بیان بدل لے۔ اِس طرح وہ بچ سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے پوچھا کہ علم الدین یہ بات مانتا ہے؟ وکلا نے جواب دیا کہ نہیں وہ نہیں مانتا — شاید آپ کی

بات مان لے۔"

اِس پر علامہ اقبال جوش میں آ گئے اور کہنے لگے کہ اگر وہ اپنے مسلک پر قائم ہے تو میں کون ہوں، اِس کو شہادت کے مرتبے سے باز رکھنے والا۔

یہ کہنا تھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میاں امیرالدین فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کی وفات سے چند روز قبل میرے تایا میاں نظام الدین مرحوم اُن کے ہاں گئے۔ حضرت علامہ چارپائی پر لیٹے تھے اور علی بخش انہیں دبا رہا تھا۔ میاں نظام الدین نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا حال ہے؟

علامہ نے فرمایا:

"مر چکا ہوں — اب دیکھ رہا ہوں — "!!

میاں امیرالدین کے علامہ اقبال اور اُن کے خاندان سے گہرا تعلق ہے۔ علامہ محمد اقبال کی دختر منیرہ بانو، میاں امیرالدین کے بیٹے میاں صلاح الدین کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ میاں صاحب کے پاس علامہ اقبال" کی کئی دستاویزات محفوظ تھیں جو انہوں نے اقبال میوزیم کو دے دی ہیں۔ یہاں پر ایک اہم بات کا ذکر بے حد ضروری ہے، وہ یہ کہ علامہ اقبال نے اپنے بچوں کی نگرانی کے لئے جو گارڈین مقرر کیے تھے اُن میں ایک شیخ اعجاز احمد تھے جو علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے فرزند ہیں۔ اِس سلسلہ میں علامہ اقبال کے بچوں کی نگران محترمہ ڈورس احمد نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ (یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے)

Sh. Ejaz Ahamd was the elder son of Sh. Atta Muhmmad. He was very well educated and Dr. Sahib seemed to have had a very high opinion of him as he appointed him a guardian of his minor children in preference to his father Sh. Atta Muhammad. Towards the end of his life, however he expressed to me that he wished that he had made some other choice since Ejaz Ahmad had become a Qadiyani, an act which Dr.Sahib had throughly disapproved, this opinion he expressed to me several times.

"شیخ اعجاز احمد، شیخ عطا محمد کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ بڑے تعلیم یافتہ تھے اور ڈاکٹر صاحب کا ان کے بارے میں بہت اچھا نظریہ تھا۔ اِس لیے اُنہوں نے اِنہیں اپنے چھوٹے بچوں کا گارڈین مقرر کیا اور اپنے بڑے بھائی عطا محمد پر اسے ترجیح دی۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں اُنہوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میری خواہش ہے کہ کوئی اور فرد شیخ اعجاز احمد کی جگہ بچوں کا گارڈین مقرر ہوتا۔ کیونکہ وہ قادیانی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کا کئی بار مجھ سے اظہار کیا۔"

اِسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر ڈورس احمد لکھتی ہیں کہ

He told me shortly before he died that he wished he had kept Mian Amiruddin and me as guardians specially as I was so close to the children. But since the will had been signed and registered he probably did not feel it expedient to change it.

اپنی وفات سے قبل اُنہوں نے فرمایا کہ میری یہ خواہش تھی کہ وصیت میں میاں امیر الدین اور تمہیں اپنے بچوں کا گارڈین مقرر کرتا۔ خاص طور پر اس لیے کہ تم بچوں کے بہت قریب ہو۔ لیکن وصیت نامہ پر دستخط ہو چکے اور وہ رجسٹرڈ بھی ہو چکی تھی۔ شاید اس لیے وہ تبدیلی نہ کر پائے۔"

اِن واقعات سے عیاں ہوتا ہے کہ میاں امیر الدین علامہ اقبال کے کتنے قریب تھے — اور علامہ اقبال اِن کے کردار و افعال کے بارے میں کتنا خوبصورت اندازِ فکر رکھتے تھے۔

اقبال اور سید محسن شاہ

سید محسن شاہ مرحوم اور علامہ محمد اقبال کا آپس میں بہت دیرینہ تعلق تھا اور یہ تعلق نہ صرف تاحیات قائم رہا بلکہ بہ فضل تعالیٰ یہ قرابت اب دوسری نسل تک بھی جا پہنچی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال اور سید محسن شاہ مرحوم کے نور چشم ڈاکٹر سید نسیم حسن شاہ دونوں دوست اور ہم پیشہ ہیں۔ دونوں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج رہے۔ دونوں صاحب علم و دانش اور معروف اہل قلم بھی ہیں۔

سید محسن شاہ مرحوم علامہ محمد اقبالؒ کے نہ صرف معتقد تھے بلکہ اِن کے ساتھ انجمن اسلامیہ پنجاب۔ انجمن حمایت اسلام لاہور اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے علاوہ مسلم لیگ میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔ چونکہ اِن دونوں رہنماؤں کا پیشہ وکالت تھا اِس لئے ہائیکورٹ بار لاہور میں بھی صحبتیں رہتی تھیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ علامہ اقبال اور سید محسن شاہ مرحوم کے مزاجوں میں بھی ظریفانہ رنگ بہت تھا اور جب مولانا ظفر علی خان مرحوم تشریف لے آتے تو خوب لطیفہ بازی ہوتی تھی۔ اِس ضمن میں پروفیسر جعفر بلوچ نے ایک دلچسپ اور تاریخی واقعہ لکھا ہے جو من و عن درج کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر جعفر بلوچ لکھتے ہیں۔

"نواب نثار علی خان کی ایک دعوت میں علامہ اقبالؒ ، مولانا ظفر علی خانؒ اور سید محسن شاہ شریک تھے۔ حضرت علامہ اور مولانا نے سید محسن شاہ سے کہا کہ دعوت کے بعد اُنہیں ساتھ موٹر میں لے جائیں۔ لیکن سید صاحب بھول گئے۔ اِس پر ظفر علی خانؒ نے کہا

برق پا موٹر ہے محسن شاہ کی
واہ کیا موٹر ہے محسن شاہ کی
کر نہیں سکتی ہمارا انتظار
بے وفا موٹر ہے محسن شاہ کی

علامہ اقبالؒ نے یہ اشعار سن کر کہا کہ موٹر کی بے حیائی کے متعلق بھی کچھ کہا ہوتا۔ ایسا کیوں نہیں کہا

بے حیا موٹر ہے محسن شاہ کی

مولانا نے معاً کہا۔

غیر سے ہے لیکن اس کو رسم و راہ
بے حیا موٹر ہے محسن شاہ کی

حقیقت یہ ہے کہ سید محسن شاہ عوامی اور ملی تحریکوں میں علامہ محمد اقبال اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس ضمن میں ممتاز محقق اور ماہر اقبالیات مولوی محمد عبداللہ قریشی اپنے ایک مضمون "اقبال گواہوں کے کٹہرے میں" میں لکھتے ہیں۔

"۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر کی سرگرمیاں لاہور میں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے کشمیری مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور مسلمان اکثریت کو ہندو اقلیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اس ظلم اور تعدی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ عوامی جلسوں اور احتجاجی جلوسوں کے ذریعے کشمیر کے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے اظہار ہمدردی کیا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں باغ بیرون موچی دروازہ میں عوامی جلسے منعقد ہوئے۔ ان جلسوں میں جن لوگوں نے سرگرمی سے حصہ لیا، ان میں میاں نظام الدین، حاجی رحیم بخش، سید محسن شاہ (یہ سب ممتاز کشمیری حضرات تھے) اور اسلامیہ کالج کے پروفیسر علم الدین سالک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موخرالذکر نے نہ صرف ان جلسوں کا اہتمام کیا بلکہ ان جلسوں میں جو قرار دادیں منظور ہوئیں وہ بذریعہ تار سیکرٹری آف سٹیٹ، وائسرائے ہند، پولیٹکل ایجنٹ، مہاراجہ کشمیر اور دوسرے متعلقہ افسروں کو بھجوائیں۔ عام مسلمانوں کے اس اظہار ہمدردی سے برصغیر کے برسر آوردہ مسلمان سیاسی اور مذہبی رہنما بھی متاثر ہوئے۔ شملہ

میں اِن کا اجلاس ہوا اور کشمیر کمیٹی معرض وجود میں آئی۔ علامہ اقبال اِس کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ کمیٹی کشمیری مسلمانوں کی قانونی امداد کے لئے معرض وجود میں لائی گئی۔ اِس کمیٹی کی کاوشوں کی بدولت ایسے متعدد کشمیری مسلمانوں کو رہائی نصیب ہوئی جو ریاستی جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ کمیٹی نے قومی کارکنوں کی مالی اعانت بھی کی۔ "[۱۱]

حقیقت یہ ہے کہ سید محسن شاہ مرحوم تحریک کشمیر سے لاہور آنے کے بعد ہی وابستہ ہوئے اِس وقت اِس کے صدر میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور (والد مکرم میاں ایم اسلم) تھے۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر مرحوم بھی بارودخانہ میں قیام پذیر تھے اور علامہ اقبال اکثر بارودخانہ تشریف لے جاتے تھے۔ سید محسن شاہ مرحوم اِس تنظیم کے سیکرٹری تھے۔ یہ انجمن کشمیری مسلمان طلبا کو تعلیم کے لئے وظائف دیتی تھی۔ علامہ محمد اقبال "لندن سے واپسی پر اِس جماعت کے صدر رہے۔ ازاں بعد آپ نے اِن ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر لی مگر تنظیم کو اپنی مشاورت سے برابر نوازتے رہے اور خود کو مسائل کشمیر سے تاعمر علیحدہ نہ رکھا۔"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سید محسن شاہ مرحوم نے علامہ محمد اقبالؒ کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون بھی لکھا تھا جو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ سید محسن مرحوم کے مضمون کا عنوان ہے۔ "اقبال کی باتیں" شاہ صاحب مرحوم رقم طراز ہیں۔

"۱۹۰۸ء میں مسلمانان لاہور نے جن کے بزرگ کشمیر سے آئے تھے اور جن کو اہل خطہ کہا جاتا تھا۔ ایک انجمن بنام "مسلم کشمیری انجمن" قائم کی جس کا مقصد مسلمانان کشمیر تعلیمی، سیاسی اور تمدنی بیداری میں حصہ لینا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ انجمن کشمیری سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ مسلمانان کشمیر کے متعلق تمام مسلمانوں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہئے۔ ان کی رائے تھی کہ ایک فرقہ کی انجمن کا قیام دوسرے فرقوں کو اپنی اپنی انجمنیں قائم کرنے کی ترغیب دے گا اور اس طرح وحدت اسلامی میں فرق آ جائے گا۔ چنانچہ انجمن کشمیری مسلمانان کی تقلید میں آرائیوں۔ جاٹوں۔ کمبوہوں۔ راجپوتوں۔ ککے زئیوں نے اپنی اپنی برادری کی الگ الگ انجمنیں قائم کر لیں۔ اگرچہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے عملی طور پر کشمیری انجمن میں حصہ نہیں لیا۔ مگر جب میں آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس کا سیکرٹری مقرر ہوا تو وہ

مجھے ہمیشہ مفید مشورے دیتے رہے اور مسلمانان کشمیر کے سیاسی اور تعلیمی معاملات میں ہر قسم کی اعانت فرماتے رہے اور جب کشمیر میں مہاراجہ نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو مسلمانان پنجاب نے کشمیر کمیٹی مقرر کی جس کے صدر ڈاکٹر محمد اقبالؒ تھے۔ اس کمیٹی نے حکومت برطانیہ اور گورنر جنرل ہند کو کشمیر کے حالات سے آگاہ کر کے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ کشمیر میں اصلاحات کرے۔ چنانچہ گلینسی کمیشن اس غرض کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر ہوا جس نے چند اصلاحات رائج کیں۔ گو ان اصلاحات میں ریاست کے حکام کا کافی ہاتھ تھا۔ تاہم عوام کو کچھ نہ کچھ اختیارات تفویض ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر علامہ محمد اقبالؒ اس وقت زندہ ہوتے تو کشمیر کی موجودہ سیاسی صورت مختلف ہوتی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی دوربین نظر ان تمام واقعات کا جائزہ لیتی جن کی وجہ سے موجودہ صورت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ شعر ؎

در مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثل حروف کشمیر

اب بھی ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے اگر ہم اس پر عمل کریں۔

۱۹۳۳ء میں سر ہربٹ ایمرسن گورنر پنجاب مقرر ہوئے تو انجمن اسلامیہ نے ان کے تقرر پر محمد اقبال کی سرکردگی میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں مسجد کی مرمت اور بحالی کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ گورنر نے ان مطالبات کا ہمدردانہ جواب دیا۔ مسجد چراغ شاہ تو علامہ کی زندگی میں ہی انجمن کی تولیت میں آ گئی۔ مگر مسجد شاہی کی مرمت اور بحالی ان کی وفات کے بعد شروع ہوئی اور اب جا کر مکمل ہوئی ہے مگر اس کی بنیاد اس سپاسنامہ کے جواب میں موجود تھی جو انجمن کی طرف سے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب انجمن حمایت اسلام کے بھی صدر تھے۔ ان کی صدارت کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ ان کے زمانہ میں ہی لاہوری اور قادیانی فرقوں کے اصحاب کو انجمن کی کارکن جماعتوں میں شریک ہونے سے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ آج تک اس جماعت کا کوئی فرد انجمن کی انتظامی جماعت کا رکن نہیں۔

تقریباً پچاس سال سے زائد عرصہ گزرا کہ لاہور میں ایک جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال میں زیر سرپرستی ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن منعقد ہوا جس کی صدارت میاں سر محمد شفیع صاحب فرما رہے تھے۔ اس جلسہ میں کسی نے حب الوطنی کو بڑا خراج تحسین پیش کیا

مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے تمام ملک جہاں جہاں وہ رہتے ہیں ان کا وطن ہے اور ان کی رائے میں حب وطنی دینی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ اس سے لادینی اور دہریت کا چرچا ہوتا ہے اور مذہبی روح فنا ہو جاتی ہے۔ ہر قوم ہر ملک کا علیحدہ وطن قرار دیئے جانے کی صورت میں اقتصادی مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر وکالت میں ہمہ وقت مصروف رہتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ چوٹی کی وکلا میں شمار ہوتے اور ہائیکورٹ کی جج سے ریٹائر ہوتے مگر مسلمانان عالم کی خوش نصیبی تھی کہ ایسا نہ ہوا کیونکہ مشیت ایزدی نے مسلمانان عالم کو بیدار کرنے کا کام ان کے سپرد کیا تھا۔ جب اُنھوں نے اپنے حریت آموز اور پرجوش کلام سے عوام الناس اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنا پیغام سنانا شروع کیا تو زبان خلق نے اُنھیں ترجمان حقیقت، حکیم الامت، شاعر اسلام اور شاعر مشرق کا خطاب دیا۔" آگے چل کر سید محسن شاہ لکھتے ہیں۔

۱۹۲۳ء میں آپ کی یہ عالمگیر عزت اور شہرت دیکھ کر جو ہندوستان سے باہر یورپ۔ امریکہ اور تمام ممالک اسلامیہ میں آپ کے مثنویوں کے ترجمہ کے ذریعے حاصل ہوئی آپ کو نائٹ کا معزز خطاب عطا کیا گیا۔ اس خوشی میں مقبرہ جہانگیر میں جو جلسہ ہوا اس میں ہندو اور مسلمان معززین کے علاوہ سر ایڈورڈ میکلیگن گورنر بھی شریک ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی پرائیویٹ زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ "سادہ زندگی اور بلند سوچ" کے اصول پر پوری طرح عمل پیرا تھے اور تمام دوست جو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ان سے بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ بلا روک ٹوک ہر ایک ان کی ملاقات سے فیض یاب ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کفایت شعاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتے تھے۔

۱۹۳۸ء میں جب ڈاکٹر صاحب کی وفات ہوئی تو مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک (مرحومین) میرے پاس آئے تو مجھ سے کہا کہ میں بحیثیت سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب ڈاکٹر صاحب کی قبر شاہی مسجد کے قریب بنانے کی اجازت حکومت سے حاصل کرنے میں مدد کروں۔ چنانچہ ایک مختصر سا وفد صوبائی گورنر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے محکمہ آثار قدیمہ سے مشورہ کرکے یہاں قبر بنانے کی اجازت دے دی۔"

سید محسن شاہ نے علامہ اقبال کی لاہور بار ہائیکورٹ میں نشست کے متعلق لکھا

"ہائیکورٹ بار میں ڈاکٹر صاحب جب کبھی آتے تو تمام ممبران باران کی میز پر آ جاتے اور

وہ ان کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتے۔ وہ بالعموم اس میز کے گرد جہاں اب قریبی دیوار پر ان کی تصویر آویزاں ہے، بیٹھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں عام موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ شعر و شاعری کے علاوہ بھی مختلف امور پر حضرت علامہ بڑی پر لطف باتیں کرتے تھے۔ اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی وہ بھولی بسری باتیں یاد آتی ہیں تو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی عظیم شخصیت کے بعض پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔"

سید محسن شاہ مرحوم تا زیست مسلم لیگ سے وابستہ رہے چونکہ علامہ محمد اقبال کے دوست اور ہم خیال تھے اس لئے مسلم لیگ میں بھی انہی کے ساتھ کام کیا اور یہ اسی گروپ کو اعزاز حاصل ہے کہ علامہ محمد اقبال اور مولانا ظفر علی خان کے سیاسی ہم نشینوں میں سید محسن شاہ مرحوم اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کی کئی اور وجوہات تھیں مثلاً علامہ اقبالؒ کو انجمن حمایت اسلام لاہور۔ اور انجمن کشمیری مسلمانان پنجاب سے بہت دلچسپی تھی اور حیات اقبال میں ان بزرگوں کی قومی و ملی مسائل و معاملات میں مشترکہ مساعی جمیلہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تعلقات سیاسی بھی تھے اور سماجی بھی اور جن میں بے تکلفی کا عنصر بھی شامل تھا سید محسن شاہ نے علامہ اقبالؒ کے بارے میں جو تاثرات بیان کئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال گفتار کے غازی ہی نہ تھے بلکہ کردار کے غازی بھی تھے اور اُن کے ہر سیاسی و سماجی۔ مذہبی اور اصلاحی معرکہ میں سید محسن شاہ مرحوم نے شخصیت و کردار کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے عیاں ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ایک وسیع النظر سیاست دان۔ دردمند دل رکھنے والے اور باحمیت مسلمان تھے۔

اور ہم یہی بات اُن کے ہم نشین اور ہم جلیس کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہماری مراد سید محسن شاہ سے ہے جنہیں علامہ اقبال کا رازدان بھی کہا جا سکتا ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں

حواشی

۱۔ اقبال اپنوں کی نظر میں ص ۸۳۔ ۸۴
۲۔ ایضاً ص

کشمیر اور اقبال

علامہ اقبالؒ کے دل و ذہن میں کشمیر اور اس کے مکینوں کے لئے بے انداز محبت، تڑپ اور قدر تھی اور جس انداز فکر اور طرز عمل سے انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس کا اندازہ ایک غریب الدیار، محب الوطن اور قوی درد رکھنے والا انسان ہی کر سکتا ہے۔

اقبالؒ کے کلام بلاغت نظام اور سیاسی افکار و اعمال میں کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں جو ارشادات ملتے ہیں اس کی بنیادی وجہ خود علامہ اقبالؒ نے یوں بتائی ہے

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است!

اور پھر دوسری جگہ فرماتے ہیں

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اس شعر میں علامہ اقبالؒ نے جہاں اپنے فن کی عظمت و معراج اور وسعت نظر پر فخر و ناز کیا ہے وہاں اپنی نسل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

یہ درست ہے کہ علامہ اقبالؒ کی شاعری کا مرکز و محور عالم انسانیت اور انسانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن اسلامی نظام حیات ہی رہا مگر اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ علامہ اقبالؒ اس نعرہ حق

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند!

کے باوجود اپنے آبائی وطن کشمیر کی اذیتوں اور کلفتوں کو نہ تو بھول سکے اور نہ ہی اس قلبی و ذہنی خلش کے احساس کو مٹا سکے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس خطہ ارض کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ کیا اور خداوند کریم کے حضور ہر لحظہ دست بہ دعا رہے کہ

نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

یا پھر،

بیدار ہوں دل جس کی فغاں سحری سے!
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

اور یہ بات صرف دعا تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ جب ان کا طائر تخیل زمین کی پستیوں سے نکل کر ہفت افلاک میں ستاروں کی گزرگاہوں سے ہوتا ہوا روحوں کی نگری میں پہنچتا ہے تو وہاں بھی ان کا طائر دل اپنے دیس کے باسیوں شاہ ہمدان اور غنی کاشمیری کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ ستاروں کی بستی میں بھی کشمیریوں کے قصہ درد کو چھیڑتے ہیں اور حضرت شاہ ہمدان سے کہتے ہیں۔

زیر گردوں آدم آدم راخورد
ملتی بر ملتی دیگر چرد!!

جان ز اہل خطہ سوزد چوں سپند
خیزد ازول نالہ ہائے دردمند!
زیرک و دراک و خوشگل ملتی است
در جہاں تر دستی او آیتی است
ساغرش غلطندہ اندر خون اوست
درنے من نالہ از مضمون اوست
از خودی تابی نصیب افتادہ است
در دیار خود غریب افتادہ است
دست مزد او بدست دیگراں!!
ماہی رودش بشست دیگراں!
از غلامی جذبہ ہائے اوبمرد!
آتشی اندر رگ تاکش فسرد!
تانہ پنداری کہ بود است ایں چنیں!
جبہ را ہموار سودا است ایں چنیں

در زمانی صف شکن هم بوده است　　چیره و جانباز و پر دم بوده است

اور پھر اقبال کے اس نالہ دردپر روح غنی کاشمیری یوں گویا ہوئی

کاروانہا راہ صدائے تو درا !　　تو زاہل خطہ نومیدی چرا !

دل میان سینہ شان مردہ نیست　　اخگرشان زیر یخ افسردہ نیست

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور !　　ملتے برخیزد از خاک قبور !

غم مخور اے بندۂ صاحب نظر　　برکش آں آہے کہ سوزد خشک و تر

شہرہا زیر سپہر لاجورد ! !　　سوخت از سوزِ دل درویش مرد !

از نوا تشکیل تقدیر اُمم !!　　از نوا تخریب و تعمیر اُمم !

پردہ تو از نوائے شاعری است !　　آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت　　یک نوا مستانہ زن اندر بہشت !!

کلام اقبال کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی کشمیر کو موضوع سخن بنا لیا تھا اور پرجوش تڑپ، درد اور امنگ کا یہ جذبہ عمر کے ساتھ ساتھ مختلف صورتوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ چنانچہ جب وہ دیارِ غیر میں اپنے ایک دوسرے غریب الدیار کشمیری سے ملتے ہیں تو بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے !　　اِک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے

واہ واہ کیا محفل احباب ہے !　　ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافہ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر !
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

حب الوطنی اور غریب الدیاری کا یہ احساس ہمیں اقبال کے علاوہ غالب کے کلام میں ملتا ہے، مگر غالب کی "انا" اپنی بے کسی اور غریب الدیاری کی وجہ کو جانتے ہوئے سوئے وطن رُخ نہیں کرتی۔ بلکہ اِس حقیقت کو سامنے رکھتی ہے جو وطن چھوڑنے کا باعث بنی اور اسی احساس میں مبتلا ہو کر انھوں نے یہاں تک کہہ دیا

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تجھ کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

اور شاید اِسی وجہ سے اُنہوں نے اپنی غریب الدیاری کی موت پر فخر کیا ہے۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

مگر اقبال کی "انا" اور خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ بے مہری عالم کے سبب وطن اور اِس کے مکینوں ہی کو بھول جائے۔ بلکہ وہ ایک جوش سے وطن کو آزاد کرانے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اور اپنے وطن کی محکومی و مجبوری کی کہانی صباؤں کے دوش پر اقوامِ عالم سے بھی کہتے ہیں۔

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی !
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اور پھر اُس ظلم و ستم کو دیکھتے ہوئے اُن کے دل و ذہن میں ایک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ خدا کے حضور سربسجود ہو کر پکارتے ہیں۔

پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اِس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

اقبال نے ہمیشہ ہی کشمیر کو دیگر ارضی خطوں سے زیادہ اہمیت دی۔ اِس کی وجہ اُنہوں نے محض یہ بتائی کہ۔

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے
جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گر مولائے جلیل !
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے (باقیاتِ اقبال)

مشہور مورخِ کشمیر مولانا محمد الدین فوق کا بیان ہے کہ :

"اقبال کی جو نظمیں سب سے زیادہ پہلے کسی اخبار یا رسالہ کی زینت ہوئی وہ کشمیر اور کشمیریوں کے متعلق ہی تھیں۔" (مشاہیر کشمیر)

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی زندگی میں فوری اور پہلی اہمیت کشمیر ہی کو دی تھی۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے جو اُوپر بیان کی گئی ہے۔ دوسری وجہ شاعر کی مناظر قدرت سے دلچسپی اور اُنسیت تھی اور اسی لئے جب وہ کشمیر جنت نظیر کی دلکشی، بہار اور رنگ و نغمہ کو دیکھتے ہیں تو اس کے روح پرور نظاروں میں محو جاتے :

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بین لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سرِنار دن نگر
تانہ فتد بہ زینت اش چشم سپہر فتنہ باز !
بستہ بہ چہرہ زمین برقع نسترن نگر
لالہ زخاک بر دمید موج بہ آبجو تپید
خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر

لیکن جب اِن دلکش نظاروں کے بعد وہ یہاں کی مخلوق کی حالت زار پر نظر دوڑاتے ہیں تو اُن کا دل وفورِ غم سے بھر آتا ہے اور وہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

کشیری کہ بابندگی خوگرفتہ ۔۔ بتے مے تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے ۔۔ خودی ناشناسے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او ۔۔ نصیب تنش جامہ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے ۔۔ نہ در سینہ او دلِ بیقرارے
ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری ! ۔۔ کہ خاکسترش آفریند شرارے

پھر اسی خیال کو اُردو زبان میں بیان کیا ہے ۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر !

سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

حیاتِ اقبال کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اقبال کشمیر کے معاملہ میں صرف گفتار کے غازی ہی نہ رہے بلکہ انہوں نے سیاسیاتِ کشمیر کے ابتدائی مراحل میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا اور کشمیری عوام کی سیاسی بدبختوں کے مداوا کے لئے ہندوستان اور بیرون وطن اپنی مساعی کو جاری رکھا انہوں نے تحریر سے تقریر سے، اشعار کے اثر سے مہاراجہ کشمیر کی چیرہ دستیوں کو ختم کرنے کی سعی کی۔ بلکہ اپنے ذاتی تعلقات کو بھی استعمال میں لائے اِس ضمن میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کا بیان ہے:

"علامہ اقبال کے نہایت مخلصانہ تعلقات نواب حمیداللہ کا خان تاجدار بھوپال سے تھے۔ اور تاجدار بھوپال مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے۔ علامہ نے اِن کے ذریعے کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کشمیر نے کشمیریوں کے آئینی مطالبات کے سلسلے میں گلینسی کمیشن مقرر کیا۔ اِس وقت علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ مسلم کانفرنس کو گلینسی کمیشن کی ترکیب پر اعتراض تھا۔ چنانچہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے اجلاس عاملہ میں مسائل کشمیر کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کمیشن کے مسلمان ممبروں کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر نامزد کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کمیشن ناقابل قبول ہے۔ محمد عبداللہ اور قاضی گوہرالرحمن کو جیل سے رہا کر کے موقع دیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات کمشن کے سامنے پیش کریں۔ اِس کے ساتھ ہی کشمیر کے اسیرانِ بلا کی تکالیف و مصائب اور مسلم وکلا کے حدود ریاست سے اخراج کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا گیا۔ علامہ اقبال کشمیر کے ذریعے سے بھی اور آل انڈیا مسلم کانفرس کے ذریعے سے بھی مسلمانان کشمیر کے مسائل اُٹھاتے رہے اور اسیرانِ کشمیر کے رہائی پر اصرار کرتے رہے۔"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اِس گلینسی کمیشن میں چودھری غلام عباس نے علامہ اقبال اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے احکام کے خلاف نہ صرف شرکت کی بلکہ اِس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور شیخ محمد عبداللہ جو ایک عوامی گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے اُنھوں نے کمیشن کے روبرو نہایت وضاحت اور حق گوئی سے کشمیریوں کا مقدمہ پیش کیا۔ مگر حکومت نے شیخ محمد عبداللہ کو اُن کی حق گوئی کی بنا پر پھر پابند سلاسل بنا دیا۔ اِس صورت حال کو علامہ اقبال نے نہایت شدت سے محسوس کیا اور اُنھوں نے شیخ محمد عبداللہ کی بلاوجہ اسیری پر نالہ احتجاج بلند کیا اور برطانوی ہند کی حکومت سے رجوع فرمایا۔

علامہ اقبال کی اِس مساعی کا یہ نتیجہ ہوا کہ کشمیر کے قیدی شیخ محمد عبداللہ سمیت رہا کر دیئے گئے۔ مگر ستم یہ ہوا کہ اِس دور میں کشمیری لیڈر بعض بیرونی جماعتوں اور حکومت کے زیر اثر ہو کر آپس میں اُلجھ پڑے۔ اِس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے شیخ محمد عبداللہ نے علامہ اقبال سے رجوع کیا اور اُنھیں ایک خط میں دعوت دی کہ وہ خود کشمیر تشریف لائیں اور یہاں کے مسائل کو حل کریں — شیخ محمد عبداللہ کے خط کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا —:

"لاہور

۱۲ اکتوبر ۳۳ء

ڈیئر شیخ عبداللہ صاحب!

اسلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کشمیر ایک اخبار پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزرگان کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ اِس بات کے لئے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بار آور کرے گا۔ لیکن جو مختلف جماعتیں سنا ہے کہ بن گئی ہیں اور ان کا باہمی اختلاف آپکے مقاصد کی تکمیل پر بہت بڑی رکاوٹ ہو گا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔

ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اِس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اِس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے

بلکہ اِس وقت ہیں۔ بہرحال دُعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔ افسوس ہے کہ میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔

اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

محمد اقبال۔ لاہور"[۲]

علامہ اقبال نے اِس خط کے ذریعہ کشمیری لیڈروں کو باہمی اتفاق و اتحاد کا درس دیا۔ مگر افسوس کہ کشمیری رہنماؤں نے اِن کی بروقت نصیحت پر عمل نہ کیا جس کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے؟

۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال خود کشمیر گئے اور انہوں نے بچشم خود کشمیر کے حالات کا مطالعہ بھی کیا۔ اور وہاں کے لیڈروں کو آئندہ کے لیے لائحہ بھی مرتب کر دیا ——

اب مقام فکر یہ ہے کیا آج بھی اتنا عرصہ گزرنے کے بعد کشمیر کی ویسی ہی صورت نہیں ہے جو نصف صدی پیشتر تھی؟ اور کیا آج کشمیریوں کو وطن کی آزادی کے لئے خود برسرپیکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور کیا آج بھی روحِ اقبال کشمیریوں سے شکوہ سنج نہیں کہ ۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں !

حواشی

۱۔ ذکر اقبال ص ۱۷۳

۲۔ اقبالنامہ ۱: ۳۹۶-۳۹۷

علامہ محمد اقبال کا سفر کشمیر

علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی میں اندرون ملک اور بیرون ملک کئی سفر کئے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا پہلا غیر ملکی سفر انگلستان اور جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تھا۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے دو سفر دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے تھے۔ اِنہی سفروں کے دوران آپ نے اٹلی مصر فلسطین اور ہسپانیہ کی سیاحت بھی کی۔ ۱۹۳۳ء کا سفر افغانستان حکومت (کابل) کو تعلیمی مشورہ دینے کے لئے اختیار کیا گیا تھا اور یہی بیرون ملک کا آخری سفر ثابت ہوا۔

جہاں تک علامہ اقبال کے اندرون ملک سفر کا تعلق ہے آپ کوئٹہ، دہلی، لکھنؤ، کانپور، شملہ، علی گڑھ، بھوپال، بمبئ، میسور، حیدر آباد (دکن) مدراس۔ الہ آباد، کلکتہ اور سرہند تشریف لے گئے۔

علامہ اقبالؒ کے ہم نشینوں اور ہم جلیسوں کا بیان ہے کہ آپ طبعاً سفر سے گریز کرتے تھے۔ اس لئے جو سفر اُنہوں نے اختیار کئے ان کا مقصد قومی اور ملی امور میں حصہ لینا تھا یا اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت۔ علامہ اقبال کے بعض سفروں کی رُوداد مختلف مضامین کی صورت میں رسائل و جرائد اور کتب میں چھپ چکی ہے۔ دو کتابیں "سفر نامہ اقبال" از حمزہ فاروقی اور "سیاحت اقبال" از حق نواز بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں مگر ان دونوں کتابوں میں اندرون وطن کے بعض اہم سفروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ایسا ہی ایک اہم سفر کشمیر جنت نظیر کا بھی ہے۔ منشی سراج الدین احمد جب ملازمت کے سلسلہ میں کشمیر پہنچے تو اُنہوں نے وہاں کے روح پرور ماحول سے متاثر ہو کر علامہ اقبال

کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے انہی ایام میں علامہ اقبال کے دوست جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں سری نگر گئے اور انہوں نے اقبال کی کمی محسوس کر کے کہا۔

ناظر بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں، شیخ ہو اور شالامار ہو

مگر اقبال پھر بھی کشمیر نہ جا سکے۔ یہ وہ دور تھا جب ریاست جموں و کشمیر کی حکومت سے جالندھر کے خان بہادر غلام احمد خان وابستہ ہو چکے تھے۔ وہ سٹیٹ کونسل میں مشیر مال تھے۔ انہی کی تحریک پر چودھری خوشی محمد ناظر ملک شیر احمد، منشی محمد عبداللہ (والد محترم قدرت اللہ شہاب) مولوی نذیر احمد جج حکومت کشمیر کی ملازمت میں لئے گئے حکومت کشمیر سے وابستہ ہونے سے پیشتر خان غلام احمد خان سیالکوٹ میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم رہ چکے تھے اور ان کے فرزند نواب فخریار جنگ مرحوم وزیر مالیات دولت آصفہ دکن علامہ اقبال کے سیالکوٹ میں ہم مکتب تھے اور بقول نواب مشتاق احمد خان علامہ مرحوم جب ایک مرتبہ حیدر آباد تشریف لے گئے تو ایک نشست میں میں نے خود ان کی طالب علمی کے زمانہ کی خوشگوار داستانیں سنیں اور بہت محظوظ ہوا۔"

علامہ اقبال کے تعلقات ریاست کے مشہور ماہر تعلیم مولوی محمد ابراہیم سے بھی تھے اس سلسلے میں مولوی صاحب مرحوم کے فرزند ظہور حسین قریشی نے راقم کو بتایا کہ جس روز علامہ اقبالؒ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی، اسی روز ان کے والد محترم محمد ابراہیم کی گورنمنٹ کالج لاہور میں تقرری عمل میں آئی۔ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر رابسن تھے اور جب جموں میں پرنسپل آف ویلز کالج قائم ہوا تو مہاراجہ پرتاب سنگھ نے مسٹر رابسن ہی کو وہاں کا پرنسپل مقرر کیا جو لاہور سے اپنے ساتھ مولوی محمد ابراہیم کو بھی لے گئے۔ مولوی محمد ابراہیم سرگودھا کے رہنے والے تھے مگر انہوں نے اپنی ساری زندگی ریاست ہی میں گزار دی۔ سر عبدالقادر نے اپنے مکان کے قریب ہی پارک لین میں مولوی محمد ابراہیم کو مکان کے لئے جگہ دی تھی کہ دوستی کا تعلق ٹوٹنے نہ پائے۔ مولوی صاحب کے پاس علامہ اقبال کی بہت سی یادگاریں تھیں جو کچھ تو جموں کے فسادات میں اور کچھ سری نگر میں ضائع ہو گئیں۔

...بہ کشمیر جانے کے بہت خواہشمند تھے۔ مختلف افراد کے نام خطوط میں اِس طرح

کے ارشاد ملتے ہیں۔ ۵ مئی ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام لکھتے ہیں:

"امسال کشمیر کا قصد ہے۔ بشرطیکہ حالات نے مساعدت کی۔" (۱)

۱۹ جون ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد ہی کے نام لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی کا کام تو ختم ہو گیا تھا اور شہزادی دلیپ سنگھ کا تار بھی چند روز ہوئے آیا تھا کہ جلد کشمیر آؤ مگر سردار جوگندر سنگھ جن کی معیت میں سفر کشمیر کرنے کا قصد تھا، شملے میں بیمار ہو گئے۔ اس واسطے خطہ جنت نظیر کشمیر کو خیرباد کہنا پڑا۔" (۲)

۱۴ جولائی ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ ہی کے نام لکھتے ہیں:

"گرمی کے موسم میں کشمیر کی سیر ہو اور آپ کے ہمرکاب تو اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے۔ خدا نے چاہا تو کبھی یہ موقع بھی آ جائے گا۔" (۳)

۱۱ ستمبر ۱۹۱۶ء کو خان محمد نیاز الدین خان کے نام لکھتے ہیں:

"میرا ارادہ تو شملہ جانے کا تھا۔ نواب ذوالفقار علی خان صاحب سے وعدہ تھا اور اُن کے خطوط اب تک بھی آ رہے ہیں۔ مگر بھائی صاحب نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اگست کا سارا مہینہ سیالکوٹ میں قیام کرو۔ سو میں مع اہل و عیال ۲۹ اگست تک وہاں رہا۔ وہاں سے ستمبر شروع ہونے سے پہلے اس واسطے آ گیا کہ اگر مولوی احمد دین وکیل ہمراہ ہو گئے ستمبر کا مہینہ کشمیر میں بسر کروں گا۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے کشمیر چلے گئے ہیں۔ کل منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کا خط آیا ہے کہ چند روز کے لئے چلے آؤ اور نیز یہ کہ چودھری شہاب الدین کو تار دیا ہے کہ وہ تم کو ہمراہ لے کر آ جائیں۔ چودھری صاحب غالباً ڈلہوزی میں ہیں۔ اُن کے انتظار میں ہوں کہ وہ آئیں تو اُن کے ہمراہ چند روز وہیں بسر کر آؤں۔" (۴)

۸ جون ۱۹۱۷ء کو فوق کے نام لکھتے ہیں:

"رسالہ رہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام

لوگوں کے لئے نہایت مفید ہو گا۔ افسوس ہے کہ میں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی لیکن امسال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچے۔" (۵)

۲۸ جون ۱۹۱۷ء کو گرامی کے نام لکھتے ہیں:

"کیا آپ امسال کشمیر چلیں گے؟ اگر ارادہ ہو تو لکھئے۔ ممکن ہے کہ میں بھی آپ کا ساتھ دوں۔ کشمیر کی سیر کا آپ کی معیت میں لطف ہے۔ غنی کشمیری کی روح خوش ہو گی کہ گرامی جالندھری اس کے مزار پر آئے ہیں۔" (۶)

۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو مہاراجہ کے نام لکھتے ہیں:

"اب کے موسم گرما بھی لاہور میں گذرا۔ کشمیر جانے کا قصد تھا مگر یاران طریقت ہم سفر نہ ہو سکے۔ اکیلے سفر کرنا اقبال سے ممکن نہیں ؎

اکیلے سیر وادی سینا نہیں آتا۔ (۷)

۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء کو مولانا گرامی کے نام لکھتے ہیں:

"اگست کے مہینے میں کشمیر جانے کا قصد ہے۔ دیکھیں ارادہ پورا ہوتا ہے یا نہیں۔" (۸)

۱۰ مارچ ۱۹۲۱ء کو شیخ عطا محمد کے نام لکھتے ہیں:

"جموں کے مقدمے میں تاریخ ۱۸ مارچ ملی تھی مگر میں اس تاریخ پر نہ جا سکا تھا۔ وسط اپریل کی تاریخ طلب کی جو نہ ملی۔

اس اثنا میں ایک مقدمہ شملہ کا مل گیا۔ ایک ہفتہ وہاں رہنا ہو گا۔ یہ مقدمہ وسط اپریل میں ہو گا۔ اس کے بعد ریاست کی طرف سے مجھے تار ملا کہ آپ کی خواہش کے مطابق وسط اپریل ہی کی تاریخ مقرر ہو گی۔ اب مشکل ہے کہ شملہ کا مقدمہ قبول کر چکا ہوں۔ آج کشمیر سے ملزموں کی طرف سے خط ملا ہے کہ ریاست سے استدعا کیجئے کہ مقدمہ سری نگر میں ہو۔ آنے جانے کا خرچ موکل ادا کریں گے۔ بہرحال دیکھیں کس طرح ہوتا ہے۔" (۹)

۳۰ مارچ ۱۹۲۱ء کو شیخ عطا محمد ہی کے نام لکھتے ہیں:

"جموں کے مقدمے کی تاریخ کشمیر میں مانگی تھی مگر ریاست نے نہیں

دی۔ ۱۸ اپریل مقرر کی ہے مگر اس تاریخ کو مجھے شملہ جانا ہو گا۔ اِس واسطے یہ مقدمہ واپس ہی کرنا ہو گا۔" [۱۰۰]

احباب کے اصرار، مہاراجہ کی دعوت اور خود اپنی خواہش کے باوجود علامہ اقبال کشمیر نہ جا سکے۔ بہرحال ۱۹۲۱ء ماہ جون میں وہ لمحہ آ ہی گیا جب علامہ اقبال نے کشمیر کے لئے رختِ سفر باندھا۔ ان کے اِس تاریخی سفر کی وجہ ایک مقدمہ کی پیروی بیان کی جاتی ہے اور یہ بات بہت حد تک درست بھی ہے مگر میری دانست میں ان کے اِس غیر معمولی سفر کو صرف ایک یا دو مقدمات کی پیروی تک محدود کر دینا مناسب نہیں ہے۔ اس کے لئے کئی دوسرے عوامل بھی تھے۔

"روزگار فقیر" میں فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں شیخ اعجاز احمد نے مجھے بتایا کہ ۱۹۲۰ء کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کے نام ایک گمنام خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے جس کا تم کو کچھ علم نہیں اگر فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تم کو بھی اس کا علم ہو جائے گا۔ اِس شخص نے وظیفے کے الفاظ بھی اِس خط میں لکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس خیال سے کہ کاتب خط نے اپنا نام نہیں لکھا اِس گمنام خط کی طرف توجہ نہیں کی اور وہ خط ضائع ہو گیا اِس خط کے تین چار مہینے بعد کشمیر سے ایک پیرزادہ صاحب ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے آئے۔ عمر تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ بشرے سے شرافت کا اور چہرے مہرے سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ اِس شخص نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا کہ یہ شخص مصیبت زدہ اور پریشان حال ہے اور میرے پاس اپنی کوئی ضرورت لے کر آیا ہے۔ انُھوں نے شفقت آمیز لہجے میں استفسار حال کیا تو وہ بولا کہ مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی۔ اب میں اس کی پنشن کھا رہا ہوں میرے اِس بے اختیار رونے کی وجہ خوشی ہے نہ غم۔ ڈاکٹر صاحب کے مزید استفسار پر وہ بولا میں سری نگر کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں (گاؤں کا نام شائد نوگام بتایا تھا) وہاں میں نے ایک دن عالم کشف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لئے کھڑی ہوئی تو حضور سرور کائنات ﷺ نے دریافت فرمایا کہ محمد اقبال آیا یا نہیں؟

معلوم ہوا کہ محفل میں نہ تھا۔ اِس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان آدمی جس کی داڑھی منڈھی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا، اِن بزرگ کے ساتھ نمازیوں کی صف میں داخل ہو کر حضور ﷺ کی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ اِس کشمیری پیرزادے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں نے آج سے پہلے نہ تو آپ کی شکل دیکھی تھی نہ میں آپ کا نام جانتا تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین صاحب ہیں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے یہ ماجرا بیان کیا تو اُنہوں نے آپ کا نام لے کر آپ کی بہت تعریف کی کیونکہ آپ کی تحروں کے واسطے سے وہ آپ کو جانتے تھے گو اُنہوں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اِس دن سے مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ میں نے آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کے لئے کشمیر سے لاہور تک کا یہ سفر کیا ہے آپ کی صورت دیکھتے ہی میری آنکھیں اِس لئے اشکبار ہو گئیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے کشف کی بے اختیار عالم بیداری میں تصدیق ہو گئی کیونکہ جو شکل و شباہت دیکھی ٹھیک اِسی کے مطابق ہے۔ سرمو فرق نہیں ہے۔ پیرزادے کی زبان سے اِس گفتگو کو سن کر ڈاکٹر صاحب کو وہ گمنام خط یاد آ گیا جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہو چکا ہے۔ اس خط میں جو وظیفہ لکھا تھا وہ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ پیرزادہ صاحب ملاقات کے بعد چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس سارے قصے کی تفصیل اپنے والد بزرگوار کو ایک خط میں لکھی اور اس کا بھی اظہار کیا کہ مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح شدید کرب و اضطراب میں مبتلا ہے کہ میں نے وہ خط کیوں ضائع کر دیا۔ اب آپ ہی اِس کی تلافی کی کوئی تدبیر بتائیں کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے بارے میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ کوئی شک نہیں پیرزادہ صاحب نے جو کچھ کہا سچ کہا کیونکہ میرے اعمال تو اِس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فضل ضرور ہے کہ دعا کا ہی نتیجہ ہو۔ اِس لئے آپ یا تو کوئی علاج و تدبیر بتائیں یا خاص طور پر دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اِس گرہ کو کھول دے کیونکہ پیرزادہ صاحب کا کشف اگر صحیح ہے تو میری بے خبری اور لاعلمی کی یہ حالت سخت تکلیف دہ ہے۔ [۱۱]

ظاہر ہے کہ اِس بات نے علامہ اقبال کو یقیناً بے چین و بے قرار کر دیا ہو گا اور اب وہ ہر لحظہ اِس سرزمین پر پہنچنے کے آرزومند ہوں گے، جہاں پر حضور سرور کائنات

ﷺ نے انہیں نماز کے لئے طلب فرمایا۔ یہاں پر خالد نظیر صوفی مصنف "اقبال درون خانہ" کے والد محترم کا ایک بیان بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے، وہ بیان کرتے ہیں: "یہ ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے میں گرمیوں کی تعطیلات میں کشمیر گیا ہوا تھا۔ سری نگر میں جس جگہ میرا قیام تھا اِس کے نزدیک ہی عیدگاہ کے میدان میں ایک خدا رسیدہ عارف بڑے باشرع اور پرہیزگار بزرگ کا ڈیرہ تھا۔ اِن کی عمر اِس وقت تقریباً اسی سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دن رات اپنے حال میں مست عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔

میں اِن دنوں کوئی سترہ یا اٹھارہ برس کا تھا۔ ایک روز ایک عزیز کے ہمراہ اِس مرد خدا مست سے شرف ملاقات حاصل کرنے ان کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے فرمایا "جاؤ بھائی جاؤ پہلے ہی ہمارے پاس کیا بچا ہے؟ کہ اب اس نے تمہیں بھیج دیا ہے۔" میں نے عرض کی کہ "حضرت میں کسی کا بھیجا ہوا نہیں آیا بلکہ خود ہی حاضر خدمت ہوا ہوں" وہ بولے "نہیں سمجھے اِس تمہارے اقبال کا ذکر ہے۔" میں بڑا حیران ہوا مگر خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولے "نہیں سمجھے، بھائی ہمارے پاس کیا ہے، اسی کے پاس جاؤ۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ کبھی خدا ہمارے پاس ہوتا ہے اور کبھی ہم خدا کے پاس مگر اِس کے پاس خدا ہر وقت ہوتا ہے ہم تو کسی کو کچھ دکھانے یا بتانے کی قدرت نہیں رکھتے مگر اِس کو تمام طاقتیں حاصل ہیں۔" [۱۲]

اِس روایت کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ علامہ اقبالؒ کا کشمیر اور کشمیر کے بزرگوں سے روحانی تعلق بھی تھا۔

اپنے قیام کے دوران علامہ محمد اقبال نے کشمیر کے موضوع پر تین نظمیں اور ایک قطعہ تحریر کیا یہ نظمیں "پیام مشرق" میں "ساقی نامہ"۔ "کشمیر" اور "غنی کشمیری" کے عنوانات سے موجود ہیں۔

بریشم قبہ خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامہ تار تارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے
کشیری کہ بابندگی خوگرفتہ

بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے زخود شرمسارے

دوسری نظم "کشمیر" میں لکھتے ہیں۔

زخمہ بہ تار ساز زن، بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلہ بہار را انجمن انجمن نگر

تیسری نظم "غنی کشمیری" کے عنوان سے ہے جس میں اِس مرد درویش کی خودی اور عظمت کا اعتراف کر کے کشمیریوں کو یہ درس دیا ہے کہ اپنی اِس متاع عزیز سے حمیت و حریت کا کام لو۔

علامہ محمد اقبال کی "پیام مشرق" ان کی نظموں کی اشاعت کے بعد ہی کشمیر کے ریشم سازی کے کارخانے میں بغاوت ہوئی۔ اِس سلسلہ میں جناب ممتاز حسن فرماتے ہیں۔ "ایک روز علامہ موصوف فرمانے لگے کہ میں نے کشمیر کے متعلق جو نظم "ساقی نامہ" نشاط باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی، اِس میں ریشم ساز کارخانوں اور کاریگروں کا ذکر بھی شامل تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعد میں کشمیر کی سیاسی تحریک وجود میں آئی تو اِس کی ابتداء ایک ریشم کے کارخانے میں کاری گروں کی بغاوت سے ہوئی۔ علامہ اقبال کو اپنے قیام کشمیر کے دوران خاص ادبی و شعری ماحول بھی میسر آیا۔ جھیل ڈل کی سیر کے دوران ہی کہا ۔

تماشائے ڈل کن بہ ہنگام شام
دہد شعلہ را آشیاں زیر آب
بشوید زتن تا غبار سفر
زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

صاحبزادہ محمد عمر راوی ہیں کہ جھیل ڈل کی سیر کے دوران ہی ان کے پاس سے ایک شکارے میں کشمیری بچے "ہندی ترانہ" گاتے جا رہے تھے۔ اقبال اِس غیر متوقع چیز کو دیکھ کے بے حد خوش ہوئے اپنے قیام کے دنوں میں اِن کے تعلقات مشہور کشمیری شاعر غلام احمد مہجور سے ہوئے جنہیں علامہ محمد اقبال" نے تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔

سری نگر میں دو ہفتہ قیام کے بعد اور وہاں کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے کشمیر کے سرکردہ لوگوں سے روابط قائم کئے اور انہیں آنے والے حالات سے عہدہ براء ہونے کا درس دیا۔ جولائی کو آپ نے مولانا گرامی جالندھری کو خط لکھا۔

ڈئیر مولانا گرامی... نہ سلامے نہ پیامے

کل "زمیندار" میں آپ کی غزل دیکھی تو معلوم ہوا کہ آپ زندہ سلامت موجود ہیں۔ واللہ ذالک شیخ محمد اقبالؒ کا خط میرے نام آیا تھا جس میں وہ ہشیار پور کی دعوت دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ گرمی بہت ہے۔ ورنہ آپ کی زیارت کا ایک اور موقع مل جاتا۔ اِس کے علاوہ میں کشمیر سے بیمار واپس آیا۔ ٹانگ میں درد ہے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں بھی دقت ہے۔ آج علاج شروع کیا ہے۔ شیخ محمد اقبالؒ سے میری مجبوری کا ذکر کر دیجئے۔ اِن کے کارڈ کا جواب اِس واسطے نہ لکھ سکا کہ وہ کارڈ کہیں گم ہو گیا اور ان کا پتہ مجھے یاد نہ تھا۔ امید ہے کہ گرامی اور گرامی کے نصف بہتر کا مزاج بخیر ہو گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ محمد اقبال لاہور۔

یہ سفر ایک مقدمہ کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا۔ اِس سلسلہ میں مولوی محمد عبداللہ قریشی اپنے مضمون "اقبال اور کشمیر" میں لکھتے ہیں:

"ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش تاجر اور رئیس تھے (شیخ محمد امین رئیس جموں و سابق رکن اسمبلی کشمیر اور شیخ محمد حنیف ٹھیکیدار، شیخ محمد بخش مرحوم کے فرزند ہیں۔ تقسیم ہندو پاکستان سے پہلے اپنے کاروبار کی رونق اور ترقی کے لحاظ سے نہایت امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔) زمانہ کے انقلابات ہر ملک اور ہر قوم بلکہ ہر خاندان پر کسی نہ کسی وقت اور کبھی نہ کبھی اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ یہی انقلاب اِن کو بھی پیش آئے۔ پنجاب نیشنل بنک کی شاخ سرینگر نے حساب کتاب اور لین دین کے معاملے میں اِن کی ڈگریاں اور قرقیاں کرائیں اور ہزارہا روپے کی جائیداد سینکڑوں میں نیلام کرا دی۔ چونکہ نیلام اور قرقیوں وغیرہ میں بہت سی بے ضابطگیاں تھیں اور بنک کا رسوخ بھی بہت کام کر رہا تھا۔ اِس لئے شیخ محمد بخش مرحوم کے داماد منشی سراج الدین نے جو اِس وقت مہتمم بندوبست کے

مثل خواں تھے اور بعد میں اپنی قابلیت کی وجہ سے خود افسرِ مال کے عہدہ سے سبکدوش ہو کر ریونیو ایجنٹ (وکیل) ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی قانونی قابلیت سے مستفید ہونے کے لئے اِن کو اِس مقدمے میں کشمیر بلایا۔" (۱۳)

اِس مشہور تاریخی مقدمہ کے اصل حقائق ریکارڈ کی درستی کے لئے درج کئے جا رہے ہیں۔ جہاں تک شیخ خاندان کا تعلق ہے اِن کی ذریات میں سے کچھ افراد اِس وقت بھی سرینگر اور جموں میں موجود ہیں اور کچھ اہل خاندان راولپنڈی، مری، لاہور اور فیصل آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

اِس دور میں ریاست میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی فرم تھی جس کا نام "شیخ علی محمد، محمد بخش" تھا۔ اِس فرم کا صدر دفتر امیرا کدل سرینگر میں بند روڈ پر تھا۔ اِس مقدمہ کا عنوان تھا۔ "شیخ علی محمد، محمد بخش بنام سرکار جموں و کشمیر۔" ابتدا میں یہ مقدمہ "الائنس بنک آف شملہ لمیٹڈ" کے ساتھ تھا، نہ کہ نیشنل بنک کے ساتھ۔ یہ مقدمہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک مختلف عدالتوں میں زیرِ سماعت رہا۔ اِس مقدمہ کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۹۱۱ء میں اِس فرم کے مالکان کو "دہلی دربار" میں کشمیر کیمپ کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ چنانچہ شیخ برادران دہلی میں مصروف تھے۔ اِن کی عدم موجودگی میں سیشن جج دیوان بودھراج ساہنی نے بنک ہذا کو اِن کے خلاف ڈگری دے دی جس کی رو سے شیخ برادران کی تمام جائیداد قرق کر لی گئی۔ حتیٰ کہ سرینگر کا کاروباری مرکز اور گھر کا سامان بھی قبضہ میں لے لیا گیا۔

۱۹۱۲ء میں جب شیخ برادران واپس سرینگر آئے تو انہوں نے اِس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دی جو ایک عرصہ دراز تک بنک کے اثر و رسوخ کی وجہ سے التوا میں پڑی رہی۔ جب یہ معاملہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ والیِ ریاست تک پہنچا تو اِس نے عدالت کے فیصلہ کو بدلنے کی بجائے اپنی طرف سے شیخ برادران کو ایک لاکھ روپیہ کا چیک دیا جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ اِس موقعہ پر شیخ علی محمد نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو کہا کہ "سرکار، آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ۔ اِس وقت میں ہڑ (سیلاب) میں پھنسا ہوا ہوں یہ رقم بھی اِس میں بہہ جائے گی۔ مجھے مقدمہ لڑنے دیں اور میں پھر محنت کروں گا۔" اِس بات نے مہاراجہ کے دل میں اِن کے لئے خلوص پیدا کر دیا اور میعاد گزرنے کے باوجود اپیل کی اجازت دے دی اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۹۲۵ء تک

زندہ رہا بودھراج ساہنی سیشن جج کی ترقی نہ کی۔

اِس مقدمہ میں ایک وکیل چودھری نیاز احمد بھی تھے جو ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر کے چیف سیکرٹری اور ازاں بعد حکومت کشمیر کے ہائی کورٹ کے جج اور چیف سیکرٹری بھی رہے۔ چودھری نیاز احمد، مسلم کانفرنس کے اسمبلی پارٹی کے لیڈر چودھری حمید اللہ خان مرحوم کے چچا زاد اور چودھری خوشی محمد ناظر کے کزن تھے۔ لیکن اپیل کرنے کی منظوری کے بعد یہ طے ہوا کہ علامہ اقبال کو لایا جائے جو اِس مقدمہ کی پیروی کریں۔ چنانچہ سیٹھ کریم بخش اور اُن کے بہنوئی منشی سراج الدین مہتمم بندوبست علامہ محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں کشمیر آنے کی دعوت اور مقدمہ کی پیروی کے لئے کہا جو اُنہوں نے قبول کرلی۔ چند سال ہوئے چودھری نیاز احمد کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔

سیٹھ کریم بخش، ریاست کے مشہور ٹھیکیدار اور سیاست دان شیخ محمد امین ایم ایل اے کے بڑے بھائی تھے اور شیخ محمد بخش اِن کے والد محترم تھے۔ شیخ محمد امین ایم ایل اے ایک درد مند دل رکھنے والے انسان تھے۔ اِن کا تعلق ساری عمر آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سے رہا۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جموں کی شہری نشست پر چودھری حمید اللہ خان نے جو اِس وقت مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر تھے۔ شیخ محمد امین کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ چودھری غلام عباس کے بارے میں دونوں کا دعویٰ تھا کہ اُنہوں نے اِس نشست پر الیکشن لڑنے کا سندیسہ بھیجا ہے۔ چودھری غلام عباس اِن دنوں جیل میں تھے۔ شیخ محمد امین نے مسلم کانفرنس کی اِس بے رخی کو تازیست محسوس کیا۔ اِنہیں جموں اور سرینگر دونوں مقامات پر قائداعظم محمد علی جناح کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اِن کے دو بھائی اور بھی تھے، شیخ محمد حنیف اور شیخ محمد ابراہیم۔ اب اِن سب کا انتقال ہو چکا ہے۔ شیخ محمد حنیف بھی ٹھیکیدار اور سیاست دان تھے اُنہوں نے ۱۹۴۶ء کے اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ شیخ محمد امین ایم۔ایل۔اے کا انتقال لندن میں ہوا تھا اور وہیں سے میت براستہ دہلی سرینگر گئی تھی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

جون ۱۹۲۱ء میں علامہ محمد اقبال اپنے منشی طاہر الدین اور مولوی احمد دین وکیل کے ہمراہ سرینگر گئے اور پندرہ روز سرینگر میں رہے اور ایک ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ شیخ محمد امین جونیئر نے راقم کو ماضی کی یادیں دہراتے ہوئے بتایا تھا کہ ہم لوگ روزانہ ہاؤس بوٹ

میں جاتے تھے۔ وہاں پر شعر و سخن کی محفل جمتی تھی۔ ایک بار علامہ محمد اقبال نے چودھری نیاز احمد کے ایک شعر پر ایسی گرہ لگائی کہ پوری مجلس کشت زعفران بن گئی۔ انہوں نے بتایا کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی ہدایت پر مقدمہ اے۔ ڈی۔ حکیم سیشن جج کی عدالت میں سماعت ہوا جو بمبئی کے ایک پارسی خاندان کے فرد تھے۔ علامہ محمد اقبال نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا لیکن افسوس کہ اپیل منظور نہ ہو سکی۔ علامہ محمد اقبال کو دلی رنج اور افسوس ہوا۔ چنانچہ آپ نے لاہور واپسی پر منشی سراج الدین کو ۱۳ اگست ۱۹۳۱ء کو حسب ذیل خط لکھا:

"مخدومی منشی صاحب۔ السلام علیکم!

آپ کی عدالت کی خبر معلوم کر کے تردد ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ نقل فیصلہ مرسلہ سیٹھ کریم بخش صاحب مل گئی ہے اور میں نے فیصلہ بغور پڑھا ہے۔ دفعہ ۷۴ کے متعلق جج صاحب بہادر نے جو کچھ لکھا ہے میری رائے میں غلط ہے۔ ہائی کورٹ میں اس کی چارہ جوئی ہو سکتی ہے لیکن اگر عدالت ہائی کورٹ اس امر میں ہم سے متفق ہو اور واقعات پر متفق نہ ہو تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔ اس واسطے زیادہ ضروری امر واقعات کے متعلق ہے۔ واقعات کے متعلق یہ عرض ہے کہ جج صاحبان نے وہی بات لکھی ہے اور اپنے فیصلے کو اس بات پر مبنی کیا ہے جس کا احساس ہمیں پہلے ہی تھا۔ یعنی یہ بات کہ واقعات اور بے ضابطگیوں سے ڈگری دار کی بدنیتی ثابت نہیں ہوتی۔ میں نے یہ تمام باتیں پہلے ہی عرض کر دی تھیں۔ سب سے بڑی کمزوری اس مقدمہ میں یہی ہے۔ مجھے اُمید نہیں کہ ہائی کورٹ جہاں تک بے ضابطگیوں اور غلطیوں کا تعلق ہے اے ڈی حکیم صاحب سے مختلف تجویز کرے۔ شیخ صاحبان اپنی جگہ سوچ لیں اور اس تمام زیرباری کا اندازہ کر لیں جو اپیل وغیرہ کا نتیجہ ہو گی۔ اگر معمولی مالیت کا مقدمہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مقدمے کی مالیت بھی بڑی ہے اور اخراجات وکلاء وغیرہ بھی اسی حیثیت سے ہوں گے۔ غرض ان تمام امور کو ملحوظ رکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی زیرباری میں اور اضافہ ہو۔ وجوہات اپیل دو چار روز تک لکھ کر ارسال خدمت کر دوں گا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو آپ اپیل دائر کر دیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمہ کا فیصلہ آپ کے حق میں نہ

ہو سکا۔ مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اگر یہ صورت نہیں تو اللہ تعالیٰ سیٹھ صاحبان کے لئے کوئی اور صورت پیدا کر دے گا۔ سیٹھ صاحبان کی خدمت میں السلام علیکم۔ مخلص محمد اقبال۔" (۱۴)

سرینگر میں علامہ اقبال نے ایک اور مقدمہ کی پیروی بھی کی۔ یہ قتل کا ایک مقدمہ تھا اور ایک کشمیری باشندہ رحمان راہ اس میں ماخوذ تھا۔ علامہ محمد اقبال کی پیروی سے یہ شخص پھانسی کی سزا سے تو بچ گیا مگر اسے قید کی سزا ہو گئی۔ اس ضمن میں منشی سراج الدین کو خط میں لکھتے ہیں:

"ڈیئر منشی صاحب۔ السلام علیکم!

آپ کا خط ابھی ملا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ انشاء اللہ آپ کے ارشاد پر غور کیا جائے گا۔ افسوس کہ رحمان راہ کامل طور پر نہ بچا گو پھانسی سے بچ گیا۔ لالہ کنور سین صاحب سے لاہور میں میں نے اس مقدمہ کا مفصل ذکر کیا تھا اور تمام بڑی بڑی باتیں ان کو سمجھادی تھیں اور یہ بھی درخواست کی تھی کہ مقدمہ کی سماعت جموں میں کریں تو میں بغیر مزید فیس کے بحث کروں گا۔ مگر افسوس کہ وہ مقدمہ کشمیر میں سنا گیا۔ بہرحال میں نے منشی اسد اللہ کی تحریر پر اپنی بحث کے مفصل نوٹ ان کو بھیج دیئے تھے جو عدالت میں پیش کر دیئے گئے تھے۔ لالہ کنور سین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بحث کے مفصل نوٹ مثل پر موجود ہیں۔ اس وقت اگر میعاد کا سوال نہ اٹھایا جاتا تو مقدمہ مہاراجہ کے سامنے ہی غالباً فیصلہ ہو جاتا۔ مگر منشی اسد اللہ صاحب یہ خیال کرتے رہے کہ بار دیگر مقدمہ کونسل کے سامنے پیش ہو گا جہاں رحمان راہ کی بریت کی توقع ہے۔ اس واسطے اس وقت التوا کو غنیمت سمجھا گیا۔ ورنہ میں نے تو مہاراجہ صاحب کو کہہ دیا تھا کہ آپ ابھی فیصلہ کر دیں کیونکہ دوبارہ یہاں آنے کا خرچ موکل اپنی غریبی کی وجہ سے نہ اٹھا سکیں گے۔ مگر منشی اسد اللہ صاحب کا یہی خیال تھا کہ التوا بہتر ہے مگر افسوس کہ بعد میں ان کا خیال پورا نہ ہو سکا اور کونسل اب تک نہ بن سکی۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتے رہے کہ اس فیس میں جو انہوں نے مجھ کو دی تھی میں دوبارہ کشمیر جاؤں گا مگر یہ کیونکر ممکن تھا؟

اس کے علاوہ مہاراجہ صاحب کے سامنے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ بہرحال اب میں نے سنا ہے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں لالہ کنور سین صاحب کے فیصلہ خلاف اپیل کریں

چاہتے ہیں۔ میں نے مندرجہ بالا طویل حالات لکھ کر آپ کو تکلیف دی ہے۔ اِس سے غرض یہ ہے کہ اگر رحمان راہ کے وارثوں کا ارادہ اپیل کرنے کا مصمم ہو تو میں بغیر کسی مزید فیس کے اِن کی اپیل لکھ دوں گا۔ آپ یہ امران کے گوش گزار کر دیں۔ چونکہ کشمیر میں یہ معاملہ ہندو مسلمان سوال بن گیا ہے اِس واسطے ممکن ہے کہ رحمان راہ کے وارثوں کو یہ خیال ہو کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا قانونی ممبر بھی تو ایک کشمیری پنڈت ہے۔ اِس کے علاوہ ایک اور دقت بھی ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے مہاراجہ کی طرف سے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہو تو اِس کی اپیل گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوتی ہے۔ قید کا اگر حکم ہو تو اِس کی اپیل نہیں ہوتی۔ بہرحال اگر اِن کا ارادہ ہو تو مجھے اِس میں کچھ عذر نہ ہو گا۔ اِس صورت میں آپ اِن سے کہہ دیں کہ میری بحث کے مفصل نوٹ اور دیگر کاغذات بھیج دیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام
مخلص محمد اقبال۔ (۱۵)

متذکرہ صدر خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ محمد اقبال کو اپنے موکل حضرات کی مالی پوزیشن کا کتنا احساس رہتا تھا۔ چونکہ شیخ صاحبان مالی بحران کا شکار ہو چکے تھے اِس لئے اِن کو یہ لکھا کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں اور مزید مالی مشکلات میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ رحمان راہ چونکہ ایک غریب انسان تھا اِس لئے منشی سراج الدین کو لکھا کہ اگر اِس کے وارثوں کا ارادہ اپیل کرنے کا مصمم ہو تو میں بغیر کسی مزید فیس کے اپیل لکھ دوں گا۔

مندرجہ بالا خطوط میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا ذکر آیا ہے جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کی موت کے بعد تخت نشین ہوا اور ۱۹۲۵ء تک حیات رہا۔ اِس وقت ریاست میں ایک کونسل آف منسٹرز بھی بنی ہوئی تھی جو برطانوی ہند کی حکومت کی جانب سے ایک شرارت تھی۔ یہ کونسل مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد بنائی گئی۔ اِس مہاراجہ نے انگریزوں کو عمل دخل کی اجازت نہ دی تھی۔ مقدمات کی اپیل یہ کونسل بھی سنتی تھی۔ علامہ اقبال کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ اِن کی ملاقات مقدمہ کے دوران مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے بھی ہوئی اور ہماری دانست میں یہ علامہ محمد اقبال کی والی ریاست مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات کا اشارہ ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں ملتا ہے جب کشمیر کانفرنس لاہور کا وفد مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے لاہور میں ملنے گیا۔ (۱۰) فوق کے مطابق علامہ محمد اقبال نے وفد کے

ہمراہ جانے سے انکار کر دیا اور ملاقات نہ کی۔ البتہ بعد ازاں وفد کے بعض اراکین کے اصرار پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے علامہ نے ملاقات کی۔ جس میں مہاراجہ نے علامہ اقبال کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ خط میں جسٹس کنور سین کا ذکر آیا ہے۔ یہ علامہ محمد اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن کے شاگرد تھے۔ اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ لا کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ پھر جموں و کشمیر کے جج اور چیف جسٹس کے عہدے تک پہنچے۔ جس کشمیری پنڈت کا ذکر بحیثیت قانونی مشیر گورنمنٹ آف انڈیا کیا ہے۔ اِس سے مراد سرتیج بہادر سپرو تھے جو حکومت جموں و کشمیر کے بھی لیگل ایڈوائزر تھے۔

سرینگر میں دو ہفتہ کے قیام کے بعد علامہ جولائی ۱۹۲۱ء کے پہلے عشرہ میں لاہور واپس آئے اور ۱۱ جولائی ۱۹۲۱ء کو منشی سراج الدین کو لکھا:

"مخدومی منشی صاحب۔ السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ سے رخصت ہو کر پانچ بجے شام راولپنڈی پہنچ گئے اور ۶ بجے شام کی ٹرین بھی مل گئی۔ رستے میں بھی خدا کے فضل و کرم سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کی مستعدی، خدمت گزاری اور مہمان نوازی کی تعریف کرتے کرتے منزل ختم ہو گئی۔ فالحمدللہ علی ذالک۔ میرا خیال تھا کہ آپ کے مقدمہ میں حکم سنا دیا گیا ہو گا مگر سیٹھ کریم بخش صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جج صاحب بہادر رخصت سے واپس آ کر حکم سنائیں گے۔ آپ سیٹھ صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ اگر وہ اشتہار نیلام جو پنڈت جانکی ناتھ نے پیش کیا ہے مثل پر نہیں ہے تو اِس کا کچھ اثر نہ ہونا چاہئے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ وہ مسلمان کی آخری امید ہے۔ سیٹھ صاحب اور بڑے شیخ صاحب سے کہیے کہ درود شریف پڑھنے سے غفلت نہ کریں۔ اِس زمانے کے مسلمانوں کے لئے یہ بات خاص کر حل مشکلات ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ میری طرف سے سب کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔ گرمی کی شدت ہے، بارش مطلق نہیں ہوئی اور نہ اِس کے بظاہر کوئی علامات نظر آتے ہیں۔ خواجہ اسد اللہ صاحب (ایڈووکیٹ سرینگر کشمیر) ملیں تو میرا سلام اِن سے ضرور کہئے۔ والسلام

بخدمت سیٹھ کریم بخش صاحب مضمون واحد۔

مخلص محمد اقبال لاہور

یہ تھے وہ دو مقدمات جن کی علامہ محمد اقبال نے کشمیر کی عدالتوں میں پیروی کی اور اس سفر کی وجہ سے کشمیر اور اہل کشمیر کی خوبصورتی، حسن و جمال اور حالت زار کا مشاہدہ کیا۔

حواشی

۱۔ کلیات مکاتیب اقبال ۱: ۳۷۲

۲۔ ایضاً ۱: ۳۸۱۔ ۳۸۲

۳۔ ایضاً ۱: ۳۸۹

۴۔ کلیات مکاتیب اقبال ۱: ۵۲۹

۵۔ کلیات مکاتیب اقبال ۱: ۶۰۷

۶۔ کلیات مکاتیب اقبال بنام گرامی ص: ۱۳۲

۷۔ کلیات مکاتیب اقبال ۲: ۱۳۴

۸۔ ایضاً ۱: ۲۔۱۹۵

۹۔ کلیات مکاتیب اقبال ۲: ۲۴۰

۱۰۔ ایضاً ۲: ۲۴۸

۱۱۔ روزگار فقیر ۲: ۴۲۸۔۴۳۱

۱۲۔ اقبال درون خانہ ص ۸۵۔۸۶

۱۳۔ مکاتیب اقبال ص ۱۷۵۔۱۷۶

۱۴۔ اقبالنامہ ۱: ۲۲۴۰۲۲۳

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً ص: ۲۲۷۔۲۲۸

۱۷۔ آئینۂ اقبال، صفحہ ۲۱۱

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ اِس زمانے میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کشمیر سے لاہور آیا ہوا تھا۔

اقبالؒ اور آزادی کشمیر

علامہ اقبالؒ کا تحریک حریت کشمیر سے گہرا تعلق تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ کشمیری عوام نے انہیں کی تحریک اور ایما پر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تو غلط نہ ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ تازیست تحریک حریت کشمیر سے فکری و عملی طور پر وابستہ رہے اور زندگی کے کسی دور میں بھی اِس سے لاتعلق یا بیگانہ نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی سیاسی زندگی میں جن اُمور و مسائل کو بے حد اہمیت دی۔ اِن میں کشمیریوں کی آزادی بھی شامل تھی۔

علامہ محمد اقبال کے آباؤ اجداد کا تعلق خطہ کشمیر سے تھا۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق اِن کے بزرگوں کا مسکن گاؤں چکو تھا جو سرینگر سے چند میل کے فاصلے پر شوپیاں کے راستے میں تھا... اب وہ گاؤں امتداد زمانہ کے باعث نابود ہو چکا ہے... یہ برہمنوں کا گاؤں تھا۔ علامہ اقبال کے جد اعلیٰ برہمن تھے جن کی گوت سپرو تھی... جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو بابا لول حج کے نام سے مشہور ہوئے۔ "لول" کشمیری زبان میں محبت اور پیار کو کہتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی حج کئے جن کی بنا پر لول حج کہلائے۔ وہ حضرت نورالدین رشی ولی کے خلیفہ بابا نصیرالدین نصرو رشی ولیؒ کے دست حق پر مسلمان ہوئے تھے۔ اِن کا اصل نام بابا صالح تھا۔

اقبال نے اپنے بزرگوں کے برہمن ہونے کا ذکر کیا ہے ؎

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی

پھر فرمایا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھ کہ ہندوستان میں میرے علاوہ تجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آئے گا جو برہمن زادہ ہو اور مولانائے رومؒ و حضرت شمس تبریزؒ کی رمزوں سے آشنا ہو۔)

ایک اور مقام پر فرمایا ؎

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

(میر و مرزا اپنا دل اور دین، سیاست کی نظر کر چکے ہیں... برہمن کے بیٹے یعنی میرے علاوہ اور کون (خدا کے) راز کا محرم ہو سکتا ہے؟)

بہرحال علامہ اقبال عاشق رسولؐ تھے اور یہی اُن کی سب سے بڑی اور اول و آخر نسبت ہے۔ وہ خود کہہ گئے ہیں:

کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

علامہ شیخ محمد اقبال کے بزرگوں میں سے جس فرد نے سب سے پہلے ترک وطن کیا اُن کا نام شیخ جمال الدین تھا جو علامہ کے پردادا تھے۔ انہوں نے اٹھارہویں صدی میں ہجرت کی اور سیالکوٹ کو اپنا مستقر بنایا۔ علامہ اقبال کے والد ماجد کا نام شیخ نور محمد تھا جو نہایت پرہیزگار، علوم دینیہ سے واقف اور عاشق قرآن حکیم تھے۔ اقبال کی زندگی پر اُن کے والد مرحوم کا گہرا اثر تھا۔ آپ نے انہیں اپنا مرشد بھی لکھا ہے۔ اُن کی دین پرستی اور شرافت و نجابت مسلمہ تھی اور شمس العماء مولوی سید میر حسن صاحب سے اُن کا یارانہ تھا۔ اُن کا گھریلو ماحول کشمیری تہذیب کے مطابق تھا اور سیالکوٹ میں اُن کی رہائش گاہ بھی اس محلے میں تھی جہاں زیادہ تر کشمیری آباد تھے۔

اقبال کے ہم جماعتوں میں کئی کشمیری طالب علم تھے جن میں مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا نام سب سے نمایاں ہے۔

سیالکوٹ، ریاست جموں و کشمیر کی سرحد پر واقع ہے، اس لئے ریاست کے حالات سے علامہ پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ سیالکوٹ ہی میں اُن کی دوستی مورخ کشمیر مولانا محمد الدین فوق سے ہوئی جو کشمیر کے موضوع پر کتابیں لکھتے تھے۔ اُن کے بزرگ بھی کشمیر سے

ترک وطن کر کے سیالکوٹ کے ایک گاؤں گزتل میں آ بسے تھے۔

جب علامہ اقبال انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے، اِس وقت لاہور میں میاں کریم بخش مرحوم (میاں امیر الدین کے دادا) نے "مجلس کشمیری مسلمانان لاہور" قائم کی تھی۔ اقبال اِس انجمن سے وابستہ ہوئے... اُنھوں نے اِس انجمن کے لئے ایک طویل نظم لکھی۔

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں

اِس نظم کے ۲۹ اشعار ہیں اور آخری شعر یوں ہے۔

جو تیری قوم کا دشمن ہو اِس زمانے میں
اِسے بھی باندھ لے اقبال صورتِ مضموں

اقبال کے کشمیری دوستوں میں خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس اعظم بارہ مولا، خواجہ سعد الدین شال، نور شاہ نقشبندی، منشی سراج الدین، منشی شیخ سراج الدین خاں، میر خورشید احمد، سردار گوہر رحمٰن لودھی، شیخ محمد عبداللہ اور میرواعظ ہمدانی قابل ذکر ہیں۔

علامہ محمد اقبال کی یہ بڑی خواہش تھی کہ وہ خطہ کشمیر جائیں، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں اُنھوں نے فوق مرحوم کے نام خط میں اِس خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن وہ جون ۱۹۲۱ء میں کہیں کشمیر جا سکے۔ کشمیر میں علامہ اقبال کے ایک دیرینہ ہم جلیس منشی سراج الدین (میر منشی کشمیر ریذیڈنسی) تھے جو لاہوری کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے مگر اُنھوں نے تعلیم سیالکوٹ میں مولوی میر حسن صاحب سے حاصل کی تھی۔

اِسی زمانے میں کشمیر میں چودھری خوشی محمد ناظر بھی تھے جن کی دوستی جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم سے تھی۔ جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں ہندوستان کی مسلم تہذیب کے نمائندہ تھے اور علی گڑھ تحریک میں سرسید احمد خاں کے ساتھی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں کشمیریوں کی تعلیمی حالت کے متعلق سب سے پہلی آواز جسٹس شاہ دین ہمایوں نے اُٹھائی تھی۔ وہ بھی ہر سال کشمیر جاتے تھے۔ جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کی نظم "شالامار باغ کشمیر" کی طویل نظم کا آخری شعر یوں ہے۔

ناظر بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالا مار ہو

شیخ سے مراد شیخ عبدالقادر مرحوم ہیں —— سفر کشمیر ۱۹۲۱ء کے بعد اقبال نے تین نظمیں کشمیر کے موضوع پر لکھیں جو "پیام مشرق" میں شامل ہیں۔ اِن کے کلام کا ایک حصہ کشمیر سے متعلق ہے اور جسے نہایت عشق اور سوز و مستی میں ڈوب کر لکھا ہے۔

آپ کے ابتدائی ایام میں کشمیر سے متعلق کئی رباعیات و قطعات ملتے ہیں جو رسالہ مجلس کشمیری مسلمانان لاہور اور بعد ازاں اخبار "کشمیر گزٹ" اور "کشمیری میگزین" میں شائع ہوئے... ایک قطعہ ہے ۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغِ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

علامہ کے کلام بالخصوص "ارمغانِ حجاز" اور "جاوید نامہ" میں کشمیر کے بارے میں خوبصورت نظمیں ہیں جن میں "وادی لولاب" بھی شامل ہے ۔

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغان سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
بیدار ہوں دل جن کی فغان سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

پھر فرمایا ۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھر تھراتا ہے جہان چار سو و رنگ و بو
آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

اقبال کو حضرت شاہ ہمدان" سے بے حد عقیدت و ارادت تھی جن کی کوشش سے کشمیر میں اسلام پھیلا اور یہ ریاست ایک مسلم ریاست بنی۔ "جاوید نامہ" میں حضرت

شاہ ہمدان سے اقبال کا مکالمہ بڑا ایمان افروز اور پُر از حکمت ہے۔

۱۹۲۱ء میں کشمیر سے واپسی کے بعد اقبال پریشان رہنے لگے تھے۔ انہوں نے کشمیری لیڈروں کو مشورہ دیا کہ کشمیر میں دورے پر آنے والے وائسرائے ہند کو محضر نامہ پیش کریں جس میں اپنی تکالیف بیان کی جائیں۔ علامہ اقبال کے ایماء پر لاہور ہائیکورٹ کے فاضل جج آغا حیدر نے یہ میمورنڈم لکھا جو معززین کشمیر نے بڑی جرات سے مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ کی موجودگی میں لارڈ ریڈنگ کو دیا۔ مہاراجہ اس سے پریشان ہوا۔

وہ اس وقت تو خاموش رہا مگر وائسرائے ہند کی واپسی کے بعد ان رہنماؤں کو پابند سلاسل کر دیا۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے معافی مانگ لی مگر خواجہ سعد الدین شال اور سید نور شاہ نقشبندی ثابت قدم رہے۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور انہیں وطن بدر کر دیا گیا۔ اِن دونوں کشمیری لیڈروں نے جلاوطنی کا سارا عرصہ بارود خانہ میں میاں امیر الدین کے ہاں گزارا۔ علامہ اقبال کو اِس بات کا بہت قلق تھا۔ اِس دوران مہاراجہ ہری سنگھ تخت نشین ہوا جس کا دوست نواب طالع یار خان آف پالن پور تھا جو علامہ اقبال کا عقیدت مند تھا، چنانچہ نواب پالن پور کی سفارش پر خواجہ سعد الدین شال اور سید نور شاہ نقشبندی کی وطن واپسی ہوئی اور ضبط شدہ جائداد بھی واگزار کر دی گئی۔ اِس عرصے میں ریاست میں ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن جموں، انجمن اسلامیہ قلمرو جموں، ریڈنگ روم پارٹی سرینگر اور انجمن نصرت اسلام سرینگر جیسی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں۔ اِن جماعتوں کے کارکنوں کے علامہ محمد اقبال سے گہرے روابط تھے بلکہ ۱۹۲۲ء میں ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم پہلی بار علامہ ہی کے ارشاد پر کشمیر گئے تھے علامہ کے دوست مورخ کشمیر منشی محمد الدین فوق کی تحریروں نے کشمیریوں میں روح آزادی پیدا کر دی تھی۔ اِسی زمانے میں پروفیسر محمد علم الدین سالک مرحوم اور مولوی محمد عبداللہ قریشی نے تحریک کشمیر میں حصہ لینے کا آغاز کیا۔

۱۹۳۱ء میں جب کشمیر کی تحریک اپنے انقلابی دور میں داخل ہوئی اور سری نگر میں ۲۲ کشمیری مسلمانوں نے جام شہادت نوش فرمایا تو علامہ اقبال تڑپ اُٹھے۔ اِنہی کی تحریک پر شملہ میں برصغیر ہندوپاک کے عمائد جمع ہوئے اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی معرض وجود میں آئی جس میں علامہ اقبال سیکرٹری جنرل چنے گئے۔ اِس دور میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا

عبد المجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نے تحریک کشمیر میں زبردست حصہ لیا۔ "زمیندار" "انقلاب" اور سید حبیب کے روزنامہ "سیاست" نے مسئلہ کشمیر کو اولیت دی اور یوں برطانوی حکومت نے مداخلت کی اور ریاست میں اسمبلی وجود میں آئی۔ یہ سب علامہ محمد اقبال کی رہنمائی کا نتیجہ تھا۔

کشمیر کی آزادی کے لئے علامہ اقبال کیا جذبہ رکھتے تھے؟ اس سلسلے میں میرواعظ مولانا احمد اللہ لکھتے ہیں کہ جب انہیں جلا وطنی کا بتایا...اس پر علامہ اقبال نے فرمایا: "مولانا! اگر آپ اِس جلا وطنی کی نسبت کشمیر میں ڈوگرے کی گولی کھا کر شہید ہو جاتے تو مجھے اِس کی زیادہ خوشی ہوتی۔" (تاریخ حریت کشمیر)

۱۹۳۱ء کے تحریکی مقدمات کے سلسلے میں اقبال نے پنجاب اور بہار سے وکلا کو پیروی کے لئے سرینگر روانہ کیا اور چندے کے لئے ذاتی طور پر اپیل کی۔ اِنہی دنوں علامہ نے شیخ محمد عبداللہ کے نام خط میں کشمیری لیڈروں کے باہمی اختلافات پر ناراضی کا اظہار کیا اور کشمیریوں کو حصول آزادی کے لئے اپنی صفوں میں کامل اتحاد پیدا کرنے کی تلقین کی۔

علامہ اقبال کو جو چیزیں ورثے میں ملیں، اِن میں کشمیری ثقافت بھی تھی۔ علامہ اور اِن کے ہمدم دیرینہ منشی محمد الدین فوق نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے کشمیر کے بارے میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں فوق مرحوم کے نام لکھے گئے خطوط میں علامہ نے کشمیر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اگر ہم کشمیری سیاسیات کے حوالے سے اِن کی کوششوں اور خدمات کو دیکھیں تو اِن کی شخصیت ایک ایسے سیاست دان کی صورت میں اُجاگر ہوتی ہے جو سراسر کردار کا غازی تھا۔ ایک ایسا غازی جس نے محکوم و مقہور کشمیری مسلمانوں کو آزادی کی نعمت سے آشنا کیا اور اِنہیں اِن کے عظیم الشان ماضی کی داستان سنا کر آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے لئے جان دینے کا راستہ دکھایا۔ علامہ کو مسلمانوں سے کتنا عشق اور اُنس تھا، اس کا اندازہ اِن کی اِس تحریر سے بھی ہوتا ہے جو اُنہوں نے ۱۹۲۶ء میں کونسل کی امیدواری کے اعلان میں لکھی:

> "...میرا ناچیز وجود اِس طرح ملت کے لئے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گزرے ہیں۔ میرے خیالات و جذبات ہر مسلمان پر روز روشن کی طرح آشکارا ہیں۔" (۱)

جولائی ۱۹۳۱ء کے خونیں سانحے پر علامہ اقبال کو شدید صدمہ ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو یوم کشمیر منانے کا اعلان کیا اور اپنی طرف سے اپیل جاری کی۔ اس کا متن یہ ہے:

"مسلمانو! پے در پے حملے کر کے تمہارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مردہ قوم ہے۔ اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے آپ کا یہ فرض ہے کہ "یوم کشمیر" کو کامیاب بنائیں اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔" (۲)

چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو مسلمانانِ لاہور کا ایک شاندار جلوس نکلا۔ جلوس کے اختتام پر ایک جلسہ زیرِ صدارت علامہ سر محمد اقبال منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد آپ نے صدارتی تقریر میں فرمایا:

"پہلے پنجاب اور ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے حالات سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے، بلکہ وہ لوگ جو کشمیر سے یہاں آئے وہ بھی اس کی تاریخ سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اب جو مظالم کشمیر میں برپا کئے گئے، انہوں نے اہل پنجاب کو بھی بیدار کر دیا ہے۔ اُن کے متعلق دربار کشمیر اور ہندو اخبارات نے بعض غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں اور رعایا کی طرف سے جائز مطالبات پیش کرنے کو بغاوت یا ہندو مسلم فسادات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے میرے پاس کشمیر کے کئی پنڈت حکومت کے خلاف شکایت لے کر آئے۔ میں نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے متحد ہو کر حکومت کے سامنے مطالبات پیش کریں، چنانچہ مسلمانوں نے، جو عرصے سے اپنے جائز حقوق کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، اب منظم طریق پر مطالبات پیش کرنے کی کوشش کی تو حکومت کشمیر اور ہندو اخبارات نے بے بنیاد خبریں اڑا کر اسے فرقہ وارانہ فساد قرار دے دیا۔ اب ریاست نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہے لیکن مسلمان اس کی ہیئت ترکیبی سے مطمئن نہیں اور انہوں نے اس پر عدم اعتماد

کا اظہار کرتے ہوئے اس کا مقاطعہ کر دیا ہے۔ جو شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں، وہ فضول اور حکمرانوں کے ایما پر پیش کی جاتی ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے مظاہرے کو سازش ثابت کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک کا اثر اہل کشمیر پر بھی ہونا لازمی تھا، چنانچہ وہ بھی اپنے پڑوسیوں کی حالت سے متاثر ہو کر بیدار ہو گئے۔ زمانہ خود لوگوں کو بیدار کر رہا ہے اور کشمیر میں عرصے سے جو مظالم برپا ہیں، اِن کی موجودگی میں ضروری تھا کہ وہاں کی رعایا بھی اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرتی۔"

اِس موقع پر علامہ نے اپنے چند شعر سنائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ حکومت صرف دو طریقوں پر قائم رہ سکتی ہے، ایک تو یہ کہ ملک کو بزور شمشیر فتح کر کے اِس پر تسلط قائم کیا جائے اور دوسرے عوام کی رضا جوئی سے حکومت حاصل کی جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ملک کو روپے سے خرید کر اس پر حکمرانی کی جائے۔ (۳)

اِس اجلاس میں سید محسن شاہ مرحوم بھی شریک تھے۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ "کیسری" نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال وہاں (کشمیر) کے وزیراعظم بننا چاہتے ہیں اور میں جج بننے کا آرزو مند ہوں۔"

اِس پر علامہ اقبال نے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا:

"میں ایسے حاکم کی وزارت پر لعنت بھیجتا ہوں۔" (۴)

اِنہی دنوں علامہ اقبال نے کشمیری مسلمانوں کے واسطے چندہ لینے کے لئے چند بزرگانِ پنجاب کے ہمراہ ایک اپیل شائع کرائی۔ ایک نوٹ میں اُنھوں نے توجہ دلائی کہ جملہ رقوم اِنہیں یا کسی اور شخص کو نہ بھیجی جائیں بلکہ مسلم بنک آف انڈیا میں جمع کرائی جائیں۔ اپیل درج ذیل ہے:

"کشمیر کے حالات روز بروز خطرناک صورت اختیار کر رہے ہیں اور مسلمانانِ پنجاب کا دائرہ عمل بھی وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے اہل وطن اِس تحریک کو فرقہ وار رنگ دے کر دبانا چاہتے ہیں۔ اِن حالات میں ہمیں نہ صرف کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی امداد کرنا ہے بلکہ اِس زہریلے پروپیگنڈا کا بھی مقابلہ کرنا ہے جس کے لئے بہت سے روپیہ کی ضرورت ہے، اِس لئے

ہم نیازمند مسلمانان پنجاب بلکہ مسلمانان ہند سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کار خیر میں مالی امداد فراہم کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔ تمام روپیہ بذریعہ' منی آرڈر' بیمہ یا چیک پتہ ذیل پر بھجوایا جائے اور ساتھ ہی یہ واضح کر دیا جائے کہ اِس روپیہ کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے حساب میں جمع کیا جاوے۔ پتہ "مسلم بینک آف انڈیا لمیٹڈ لاہور" (۵)

چونکہ علامہ محمد اقبال کی مساعی جمیلہ سے تحریک حریت کشمیر کو تقویت پہنچ رہی تھی اور مسلمانان ہند کے اکابر ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے' اِس لئے ڈوگرہ حکومت اور غیر مسلموں نے علامہ اقبال کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا' چنانچہ اِس ضمن میں مسٹر راگھون نے "ٹریبون" اخبار مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۳۳ء میں لکھا کہ "بعض شخصیتوں کی نیتوں کا حال اِس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شورش کشمیر کے دوران ہی میں برطانوی ہند کے ایک ممتاز لیڈر نے کشمیر کی وزارت میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کی درخواست دی ہے۔" مدیر "انقلاب" مولانا غلام رسول مہر نے یہ فقرہ پڑھ کر علامہ اقبال سے استفسار کیا کہ یہ "ممتاز لیڈر" کون ہو سکتا ہے۔ اِس پر آپ نے فرمایا:

"میں نہیں کہہ سکتا کہ کس سے مراد ہے لیکن چونکہ پہلے بھی ایک ہندو اخبار میرا نام لے چکا ہے اور ممکن ہے مسٹر راگھون کے اِس فقرے سے بھی کسی کو غلط فہمی ہو' اِس لئے میں اپنے متعلق نہایت زور سے اِس افواہ کی تردید کرتا ہوں۔ میں نے "یوم کشمیر" کے جلسے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسی وزارت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں نے تو اِس وزارت سے بڑی بڑی چیزوں کے لئے کبھی کسی سے درخواست نہیں کی۔ علاوہ بریں میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا ممبر ہوں جو کشمیر کے نظام حکومت میں اصلاحات چاہتی ہے۔ میرے نزدیک اِس کمیٹی کا ممبر ہونے کی حالت میں کوئی ایسی حرکت کرنا دیانت و امانت کے خلاف ہے۔" (۶)

اقبال تحریک حریت کشمیر کو ایک امانت سمجھتے تھے اور وہ اسے ملت اسلامیہ کی تحریک آزادی کا ایک اہم حصہ قرار دیتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ بعض عناصر اِس تحریک کے پردے میں اپنے منفی مقاصد کی تکمیل کے خواہاں ہیں تو آل انڈیا

کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا اور اپنی ذاتی حیثیت میں تامرگ (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) اس تحریک سے وابستہ رہے۔

محمد رفیق افضل "گفتارِ اقبال" میں لکھتے ہیں: "۱۹۳۱ء میں کشمیر میں ریاستی نظم و نسق اور مسلمانوں کی بدحالی کے باعث تحریک آزادی شروع ہوئی۔ مسلمانان پنجاب نے کشمیری مسلمانوں کی امانت کے لئے ایک کشمیری کمیٹی قائم کی ــــ علامہ اقبال اس کے سرگرم رکن تھے، اور مرزا بشیر الدین محمود امیر جماعت احمدیہ کی کمیٹی سے علیحدگی پر آپ صدر منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی کے مرزائی عنصر سے اختلاف کی وجہ سے آپ نے اس کی صدارت سے استعفا دے دیا اور ایک نئی کشمیر کمیٹی بنائی۔ آپ نے کشمیری مسلمانوں کی امداد کے لئے ۳۰ جون ۱۹۳۳ء کو ملک برکت علی کے ساتھ درج ذیل اپیل شائع کرائی:

"برادران اسلام!

گذشتہ چند سال سے مسلمانان خطہ کشمیر جن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں ان کے تذکرہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے یہ ایسے مصائب و مشکلات ہیں جن کا چرچا نہ صرف آپ کے ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں ابتدا ہی سے رہا ہے اور اب تک موجود ہے بلکہ ان کا قومی احساس اکثر مواقع پر افراد قوم کے سوئے ہوئے ملی جذبات کو بیدار کر کے انہیں اخوت اسلامیہ کے بھولے ہوئے سبق از سرِ نو یاد دلانے اور ملت مرحوم کے فعال عناصر بنانے کا موجب بن چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر تحریک خلافت کے بعد تحریک کشمیر ایک ایسی تحریک ہے جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی مظاہرے کا موقع ملا اور جس نے قوم کے تن مردہ میں حیات تازہ کی لہر ایک دفعہ پھر دوڑا دی۔"

ابتدائے کار سے کشمیر کمیٹی نے حکومت ہند، برطانیہ اور برطانوی قوم پر اس حقیقت کو ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ کشمیر کا مسئلہ تمام مسلمانان ہندوستان کی سیاسی حیات و موت کا مسئلہ ہے۔ اہل کشمیر سے ناروا سلوک، ان کی جائز اور دیرینہ شکایات سے بے اعتنائی اور ان کے سیاسی حقوق تسلیم نہ کرنا مسلمانان ہند سے ناروا سلوک کرنے کے مترادف ہے، مسلمانان ہند کی شکایات سے بے اعتنائی ہے اور مسلمانان ہند کے

حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ حق بات بھی یہی ہے اہل خطہ ملت اسلامیہ ہند کا جزو لاینفک ہیں اور ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں فی الحقیقت ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے تو ان نقطوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہو گا۔ اول یہ کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ حصہ ہے جو مذہبی اور کلچرل حیثیت سے خالصتاً اسلامی ہے اور ایسا اسلامی کہ اسلام نے وہاں خدانخواستہ جبرو اکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا بلکہ یہ بار آور پودا حضرت شاہ ہمدان جیسے نیک و کامل بزرگان دین کے پاک ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے... جنہوں نے گھربار اور وطن محض اس لئے ترک کئے کہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار و ممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمدللہ وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے۔

"دوسری بات جسے مسلمانان ہند کبھی نظرانداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ ان کی تمام قوم میں سب سے بڑھ کر اگر صناعی و ہنرمندی اور تجارت کو بخوبی چلانے کے جوہر نمایاں طور پر کسی طبقے میں موجود ہیں تو وہ یہی اہل خطہ کا گروہ ہے۔ افسوس ہے کہ اہل کشمیر کی زبوں حالی انہیں اپنی قوم کا مفید عنصر بننے کے راستے میں مانع آ رہی ہے بلکہ اقوام عالم کی اس نوع کی ترقی ان کی خدمات سے محروم ہے، ورنہ اگر ان کی زندگی بھی زندہ قوموں کی زندگی ہو تو صناعی اور ہنرمندی کے طبعی جوہر ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بدل دینے میں ممد ثابت ہوں۔ بہرحال اہل خطہ، قومیت اسلامیہ ہند کے جسم کا بہترین حصہ ہیں اور اگر وہ حصہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ باقی افراد ملت فراغت کی نیند سوئیں۔

"تمام مسلمان بھائیوں پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ فسادات کے ماخوذین کی کہانی بے حد دردناک ہے۔ ان کے مقدمات ابھی تک چل رہے ہیں اور ان کی مصیبتوں کا سلسلہ ایک حد تک لاانتہائی ہو رہا ہے۔ ہرچند ریاست کو اس امر پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ مقدمات واپس لے کر ان مصیبت زدوں کو آلام سے نجات دلا دے لیکن ظاہر ہے کہ یہ قصے کچھ طولانی سے ہیں۔ ریاست کے اندر پھر سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ ہیجان اب کونسی رو اختیار کرتا ہے... کشمیر کمیٹی کے پاس جو روپیہ فراہم شدہ تھا، وہ خرچ ہو چکا ہے اور جب تک قوم روپیہ سے اعانت پر کمربستہ نہ ہو گی تب تک نہ تو نئی پیدا شدہ

صورت حالات میں کوئی اہم کام سرانجام پا سکے گا اور نہ اِن سینکڑوں ماخوذین کو قانونی امداد بہم پہنچانے کا کوئی ذریعہ ہو گا۔

"اِس لئے تمام گزشتہ حالات اور موجودہ حالات کے آئندہ امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ملت اسلامیہ ہند سے نہایت مخلصانہ پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ حالات کی نزاکت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اپنی پہلی قربانیوں میں مزید اضافے کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور جو اعانت وہ پہلے کر چکے ہیں اِس کا عملی نتیجہ بھی اِس وقت نیک ثابت ہو گا جب اِن موجودہ مراحل پر پھر وہ اسلامی ایثار کا ثبوت دیں۔ یہ افراد کی امداد نہیں بلکہ اُمت رسول ؐ کی امداد ہے۔ ہم اپیل کا اختتام حضور پُرنور ﷺ کی اِس حدیث پر کرتے ہیں:

"خدا نے دین اسلام کو اپنے لئے مخصوص کیا ہے اور دین کی دوستی سخاوت اور حسن اخلاق سے ہے۔ (مسلمانو!) اپنے دین کو اِن ہر دو اوصاف سے آراستہ کرو۔" (۷)

۱۹۳۶ء میں علامہ اقبال نے دوبارہ کشمیر جانے کا پروگرام بنایا مگر ڈوگرہ حکومت نے اِن کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگا دی کیونکہ اِسے خدشہ تھا کہ علامہ کے اِس دورے سے کشمیری مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کو اور تحریک ملے گی۔ اِس ضمن میں شیخ محمد عبداللہ اپنی خود نوشت سوانح عمری "آتش چنار" میں لکھتے ہیں:

"میں نے اِنہیں کشمیر آنے کی دعوت دی۔ اِن کے کشمیر میں داخلے پر ۱۹۳۱ء سے پابندی تھی۔ اِس پابندی کو واپس لینے کی درخواست کی گئی لیکن مہاراجہ کی حکومت نے اکتوبر تک اِنہیں کشمیر آنے کا اجازت نامہ نہیں دیا اور جب اجازت نامہ آیا تو سردی کا زمانہ آ گیا تھا اور اقبال نے دوسرے سال کے لئے اپنا دورہ کشمیر ملتوی کر دیا۔ اِنہیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے سال وہ جنت ارضی کے بدلے جنت الفردوس کی سیاحت کے لئے بلا لئے جائیں گے۔ جب میں اِن سے رخصت ہوا تو اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کی نجات اِسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں۔"

حواشی

۱- گفتار اقبال ص- ۱۵
۲- ایضاً ص- ۱۲۹
۳- گفتار اقبال ص- ۱۳۰-۱۳۱
۴- ایضاً ص-۱۳۲
۵- گفتار اقبال ص- ۱۳۲-۱۳۳
۶- گفتار اقبال ص- ۱۳۳
۷- گفتار اقبال ص- ۱۷۵-۱۷۶
۸- جذباتِ ہمایوں، جسٹس محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم-

علامہ اقبال اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی ۱۹۳۱ء

مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کے آباؤ اجداد کا تعلق خطہ کشمیر سے تھا۔ اُن کی گوت سپرو تھی جو کہ برہمنوں میں محترم و معتبر تسلیم کی جاتی ہے۔

بہرنوع خود علامہ اقبال خطہ کشمیر کے برہمنوں سے اپنے خاص تعلق خاطر اور اُن کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

یا

مری کف خاک برہمن زاد

پھر فرماتے ہیں

میر و میرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

اور

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اُنھیں اِس بات کا بھی شدید احساس تھا۔

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایام گذشتہ مجھے شرماتی ہے

ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

(کشمیری گزٹ ستمبر ۱۹۰۱ء)

کشمیری (برہمنوں) کی ذہنی صلاحیتوں اور آزادی کی تڑپ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد
صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگان زندہ دل
لالہ احمر ز روئے شان خجل
تیزبین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہ شان فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامنگیر ماست
مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

واقعات اِس امر کے شاہد ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے کشمیری مسلمانوں کے مسائل و معاملات میں دلچسپی ۱۸۹۶ء ہی میں لینا شروع کر دی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب علامہ سیالکوٹ سے لاہور میں منتقل ہو چکے تھے اور اُنہوں نے لاہور کی کشمیری برادری کی "مجلس کشمیری مسلمانان" کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تھا اِس انجمن کے اغراض و مقاصد میں تعلیمی اور صنعتی حلقوں میں کشمیریوں کے حقوق کی نگہداشت تھی۔ اِس انجمن کی سرگرمیوں کی اشاعت کے لئے رسالہ مجلس کشمیری مسلمانان لاہور شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ جون و جولائی ۱۸۹۶ء کے رسالے میں علامہ اقبال کے چند قطعات ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔

پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اس دست جفاکش کو یارب جس نے
روح آزادی کشمیر کو پامال کیا

مجلس کشمیری مسلمانان لاہور کی سرگرمیاں ایک عرصہ تک باقاعدگی سے جاری رہیں اور اُن سرگرمیوں کی اشاعت و تشہیر کے لئے رسالہ مجلس کشمیری مسلمانان لاہور پیش پیش تھا۔اِس میگزین کے جون و جولائی ۱۸۹۶ء کے شمارے میں علامہ اقبالؒ کی کشمیری قوم کے بارے میں ایک طویل نظم ملتی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقین ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں
بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب
کبھی نہ ہو قدم تیز آشنائے سکون
دکھائیں فہم و ذکاء و ہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں
جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال! صورت مضموں

جیساکہ بتایا گیاکہ علامہ اقبالؒ انجمن مذکورہ کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور طالب علم ہونے کے باوجود بزرگوں کو اپنے زریں مشوروں سے نوازتے تھے۔ چنانچہ اُن کی باتوں کو بے حد اہمیت بھی دی جاتی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد علامہ اقبالؒ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن تشریف لے گئے اور جب وطن واپسی ہوئی تو پھر انجمن کی سرگرمیوں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر میں نواب محمد سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ جوکہ خود کشمیری تھے کی خدمت میں فارسی زبان میں سپاسنامہ پیش کیا جس میں کشمیری مسلمانوں کے حالات کو بیان کیا گیا تھا۔ اس سے پیشتر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا جا چکا تھا جس کی تشکیل میں سر آغاخان مرحوم کے ساتھ خواجہ سلیم اللہ خان بھی شامل تھے۔

چنانچہ علامہ اقبالؒ ہی کی تحریک پر نواب خواجہ محمد سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ نے وائسریگل کونسل میں کشمیری قوم کی فوجی ملازمت اور زمینداری کے متعلق سوالات پیش کئے تھے۔ جن کا خاطرہ خواہ نتیجہ برآمد ہوا انہی ایام میں بحیثیت سیکرٹری جنرل علامہ اقبال نے ہر شہر میں کشمیریوں کو حکومت کے طلب کردہ کوائف جمع کرنے کے بارے میں، خطوط

لکھے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہندوستان میں کشمیری مسلمانوں کی تنظیم ملک گیر سطح پر ہو گئی۔ ۱۹۰۹ء ہی میں علامہ اقبالؒ مہاراجہ کشمیر پرتاب سنگھ سے ملے مگر وہ مہاراجہ کشمیر کی روش سے سخت بیزار ہوئے حالانکہ مہاراجہ نے علامہ اقبال کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ ۱۹۱۰ء میں جب آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی تو علامہ اقبالؒ اس کے پہلے سیکرٹری جنرل چنے گئے اور سیکرٹری سید محسن شاہ مرحوم اس کانفرنس کا مقصد کشمیری مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیاں جاری کرنا اور ذہین و مستحق طلباء کو وظائف دینا تھا۔ اس کانفرنس کی مساعی سے سینکڑوں کشمیری مسلم طلباء نے فائدہ اٹھایا۔

۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک علامہ اقبالؒ عملاً سیاسیات سے کنارہ کش رہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبالؒ نسل، رنگ، علاقہ اور قبائل کی بنیاد پر مسلمانوں کی تنظیم کو ملت اسلامیہ کے لئے سود مند نہیں جانتے تھے لیکن کشمیری قوم کو اقوام مشرق اور ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور مجدد اکشامرہ مورخ کشمیر محمد الدین فوق کو ان کی کشمیر سے متعلق تصانیف پر تہنیتی خطوط لکھے اور ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ بہرحال ۱۹۱۸ء میں جب آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا سالانہ اجلاس سیالکوٹ میں منعقد ہوا تو انہوں نے کانفرنس کے سیکرٹری حاجی میر شمس الدین کو اپنے پیغام میں کہا کہ ایسی انجمن جس کا تعلق برادریوں کے ساتھ ہو نقصان دہ ہیں مگر اس کے ساتھ ہی بقول حاجی میر شمس الدین "الحمدللہ کہ ڈاکٹر صاحب نے مان لیا ہے اور آئندہ کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی لینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔" (روئداد مسلم کشمیری کانفرنس ۱۹۱۸ء)

جون ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبالؒ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ریاست میں گئے۔ یہ مقدمہ شیخ محمد امین مرحوم ایم ایل اے کے والد شیخ محمد بخش اور بھائی شیخ کریم بخش کا جائیداد کی قرقی کے بارے میں تھا۔ علامہ کے سفر کشمیر میں مولوی احمد دین وکیل اور منشی طاہر دین ان کے ساتھ تھے۔ ریاست میں قیام کے دوران انہوں نے کشمیر کے حالات کو دیکھا اور کئی مقدمات پر رائے دی اور سیر کشمیر بھی کی۔ جھیل ڈل میں اُن کے ساتھ صاحبزادہ محمد عمر (نور الٰہی) بھی تھے۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں وہ واپس لاہور آ گئے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں پیام مشرق چھپی جس میں کشمیر کے بارے میں تین نظمیں تھیں "کشمیر" غنی کاشمیری اور "ساقی نامہ" نظم "کشمیر" میں فرماتے ہیں۔

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر
دختر کے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے اوکشا باز بخویشتن نگر

اور غنی کاشمیری کے بارے میں کہا

شاعر رنگین نواء طاہر غنی
فقر او باطن غنی ظاہر غنی

اس طویل تمہید کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ جب ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر ابھری اور جموں اور سری نگر کے بازاروں اور گلیوں میں مسلمانوں کا خون بہنے لگا تو اس وقت ہندوستان کے مسلمان دانشور صحافی رہنما اور علماء کرام بھی کشمیریوں کی حالت زار سے واقف ہو چکے تھے اور انہیں ان مسائل سے آگاہ کرنے والے خود کشمیری تھے کیونکہ ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے بھی کشمیر کے بارے میں قرارداد منظور کی جس کو پیش کرنے والے دو کشمیری رہنما تاج الدین اور محمد صادق تھے۔ آمدم بر مطلب۔ ہوا یوں کہ ریاست جموں و کشمیر کے وزیر خارجہ سرالبن بینرجی نے ریاست کے ناگفتہ بہ حالات اور مسلمانوں کی پستی مظلومی اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے ایک اخباری بیان دے دیا جسے کلکتہ کے "سٹیٹسمین" نے ۱۹ اگست ۱۹۳۱ء نمایاں طور پر شائع کر دیا۔ اس سے قبل ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کا حادثہ پیش آ چکا تھا چنانچہ اس دور کے اکابرین ملت نے ایک ایسی تنظیم بنانے کی ضرورت محسوس کی جو کشمیری مسلمانوں کو ظلم و ستم سے بچائے اور اُن کو بنیادی انسانی حقوق دلائے۔ چنانچہ شملہ میں ہندوستان کے عظیم رہنماؤں کا اجتماع ہوا جس میں ایک جماعت بنام "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" بنانے کا فیصلہ ہوا اس اجتماع میں علامہ اقبال" مرزا بشیر الدین محمود، خان بہادر شیخ رحیم بخش، سید محسن شاہ نواب صاحب گنج پورہ، سر ذوالفقار علی" خان، خواجہ حسن نظامی، سید حبیب، مولانا حسرت موہانی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک کے علاوہ دو کشمیری رہنماؤں اے آر ساغر اور مولوی عبدالرحیم نے بھی شرکت کی۔ اس کمیٹی کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحیم درد مقرر ہوئے چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو اس کمیٹی نے کام شروع کر دیا علامہ اقبال آغاز سے لے کر

آخر تک اس کمیٹی کے ساتھ رہے ایک بار اس کے صدر بھی چنے گئے۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانان کشمیر کو اُن کے واجبی حقوق دلائے جائیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے مظلوم کشمیری مسلمانوں کی قانونی امداد کی جائے۔ کشمیری سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے مقدمات میں علامہ اقبال نے خاصی دلچسپی لی اور اپنے خاص دوستوں جن میں پٹنہ (بہار) کے مولوی نعیم الحق قابل ذکر ہیں، کشمیر پہنچے اُن کے ساتھ ہی علامہ مرحوم نے لاہور کے بعض وکلاء کو کشمیر روانہ کیا۔ دوسری طرف مہاراجہ کشمیر پر سیاسی اور ذاتی دباؤ ڈالنے کے لئے علامہ اقبال نے نواب سرحمید اللہ خان والی بھوپال سے رجوع کیا۔ ریاست میں تحریک آزادی جاری تھی اور کشمیری مسلمان برابر گرفتاریاں دیئے جا رہے تھے۔ اندرون کشمیر اور بیرون کشمیر تحریک کا یہ اثر ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے گلینسی کمیشن مقرر کر دیا۔ علامہ اقبال نے جو اس وقت آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے گلینسی کمیشن کی ہیئت ترکیبی پر شدید نکتہ چینی کی اور کانفرنس کے اجلاس عام منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں حسب ذیل قرار داد منظور کی۔

گلینسی کمیشن میں جو مسلمان اراکین لئے گئے ہیں انہیں مسلم جماعت سے مشورہ کئے بغیر نامزد کیا گیا ہے اس لئے گلینسی کمیشن کی موجودہ حیثیت اس کانفرنس کے لئے ناقابل قبول ہے۔ یہ کانفرنس حکومت کشمیر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مسلم جماعت سے مشورہ کر کے مسلمان اراکین کو مقرر کرے۔ گلینسی کمیشن جو دستور مرتب کرے گا وہ اس کانفرنس کی رائے میں اس وقت تک ناقابل قبول رہے گا جب تک شیخ محمد عبداللہ اور قاضی گوہر رحمن کو جیل سے رہا نہ کیا جائے اور ان کو اس بات کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات کو کمیشن کے سامنے پیش کریں۔ یہ کانفرنس کشمیر جیل میں مسلمان سیاسی قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس پر سخت احتجاج کرتی ہے۔ حکومت کشمیر نے شیخ عبدالقیوم کو کشمیر کا وزیر داخلہ مقرر کیا ہے یہ کانفرنس اس تقرر کو ناپسند کرتی ہے کیونکہ انہیں مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ کانفرنس حکومت کشمیر کے اس طرز عمل سے مسلمانوں کی سیاسی قیدیوں کے حق مدافعت پر برا اثر پڑ رہا ہے اور وہ انصاف حاصل کرنے سے محروم ہو رہے ہیں۔"(۱)

متذکرہ صدر قرار داد کے علاوہ اپنے خطبہ صدارت میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا

"جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے میرے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعات اس ملک میں ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں ان کا تاریخی پس منظر بیان کروں۔ ایسے لوگوں کی بظاہر یکایک بیداری جن کی خودی کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا ان تمام اشخاص کے لئے جنہیں موجودہ ایشیائی عوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق بصیرت حاصل ہے ایک مژدہ جانفزا ہونا چاہئے کشمیر کے عوام کے مقاصد بالکل درست ہیں اور مجھے اس معاملہ میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کے احساس کا احیا نہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہوگا بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لئے ذریعہ قوت بنے گا۔ تمام دنیا میں عوام کے اندر جو احساس خود آگاہی پیدا ہو گیا ہے وہ اپنے آپ کو تسلیم کروانا چاہتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس نظم و نسق میں جو ان پر حکمرانی کر رہا ہے، حصہ دیا جائے۔ سیاسی تربیت غیر ترقی یافتہ عوام کے لئے مناسب ہے لیکن جب عوام کا بدلا ہوا نقطۂ نظر نظم و نسق میں انقلاب آفریں اصلاح کا طالب ہو تو نظم و نسق کا مفاد یہ ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جائے۔ کشمیر کے خاص حالات کے باعث دیگر امور کے علاوہ اس ملک کے عوام ایک قسم کی عوامی مقننہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ریاست کے والی اور حکومت ہند دونوں عوام کے اس مطالبہ پر غور مناسب کریں گے۔ مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ نئے وزیراعظم اپنی برطانوی نظم و نسق کی ماہرانہ خصوصیات کے ساتھ معاملات کی تہہ تک پہنچ جائیں گے اور خوش مزاج لیکن روندے ہوئے عوام ایسے عوام، جنہوں نے قدیم ہندوستان کو بعض بہترین دماغ عطا کئے اور بعد میں مغل ثقافت کو حقیقی دلکشی بخشی تھی، کی کارفرمائی کے لئے کوئی نہ کوئی دائرہ عمل متعین کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی طرح کشمیر میں بھی دستوری اصلاحات کی راہ میں دشواریاں ہوں، لیکن دیرپا امن اور نظم و ضبط کا تقاضا یہ ہے کہ اِن دشواریوں پر جلد از جلد قابو پا لیا جائے۔ اگر موجودہ بحران کے مضمرات کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا اور اِس کے اسباب کا اُن گوشوں میں پتہ چلانے کی کوشش کی گئی جہاں وہ نہیں پائے جاتے تو مجھے ڈر ہے کہ حکومت کشمیر اپنے مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنائے گی۔" (۲)

دیگر وجوہات کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا وہ جس چیز کا سب سے زیادہ رنج ہے وہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ مخاصمت ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے

مسلمانوں کی اپنے کشمیری بھائیوں سے فطری ہمدردی کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندوؤں نے ایک ظالم نظام کے دفاع کی کوشش کی اور سارا الزام پان اسلامی سازش اور کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے برطانوی منصوبوں کے سر پر دھر دیا اس تحریک کے فرقہ وارانہ رنگ کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے یعنی جبر و تشدد کا قیام اور بدنظمی (۳)

یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ جس وقت علامہ اقبالؒ کشمیری مسلمانوں کی آزادی کے لئے سرگرم عمل تھے عین اسی وقت صوبہ کشمیر میں مسلمانوں کی تنظیم دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک جماعت کی قیادت شیخ محمد عبداللہ کرنے لگے اور ان کی جماعت عوام میں شیر پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی اور دوسری جماعت کی رہنمائی میر واعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ کر رہے تھے جن کی جماعت بکرا پارٹی کے نام سے معروف ہوئی حقیقت یہ ہے کہ ریاستی مسلمانوں کی سیاسی جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ حکومت نے ان دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا اس نفاق و نفرت کا فائدہ ڈوگرہ حکومت کو ہوا جس نے مسلمانوں کے اتحاد و اشتراک کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اس چیز کو علامہ اقبال نے شدت سے محسوس کیا دوسری طرف مجلس احرار اسلام کی تحریک جاری تھی اور احراری رضاکار مولوی مظہر علی اظہر کی قیادت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کا کل ہند مسلم کانفرنس کا اجلاس علامہ اقبالؒ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ان قیدیوں کی رہائی کے لئے حکومت پر زور دیا گیا۔

جہاں تک آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا تعلق ہے وہ اپنا کام کئے جا رہی تھی چونکہ اس جماعت کی تشکیل فوری اور ہنگامی طور پر عمل میں آئی تھی۔ اس لئے بعض سیاست دانوں نے اِس کا باقاعدہ دستور بنانے کی تحریک کی جسے مرزا بشیر الدین محمود اور اُن کے ساتھیوں نے پسند نہ کیا اور اُنہوں نے کشمیر کمیٹی سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنی سرگرمیاں اپنی مرکزی جماعت کی ہدایات کے مطابق جاری رکھیں۔ مرزا بشیر الدین محمود کے استعفیٰ کے بعد علامہ اقبالؒ کشمیر کمیٹی کے صدر چنے گئے۔ علامہ اقبالؒ نے نامساعد حالات میں بھی کام جاری رکھا مگر جون ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا اُس وقت صورت حال یہ تھی (اول) اندرون کشمیر کشمیری رہنما آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ صوبہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ اور میر واعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ مرحوم میں سیاسی

تنازعہ تھا۔

(دوئم) صوبہ جموں میں سردار گوہر رحمن لودھی اور چودھری غلام عباس میں کشمکش تھی۔

(سوئم) مسٹر اے آر ساغراحرار کیمپ میں تھے اور کشمیر میں غلام نبی گلکار اور جموں میں مستری یعقوب علی مرحوم جماعت احمدیہ کے کارکن تھے اور اُن ہی ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ یہی حالت سری نگر میں مولوی محمد عبداللہ وکیل اور اُن کے فرزند مولوی عبدالرحیم کی تھی۔

(چہارم) مولانا ظفر علی خان مرحوم کے فرزند مولانا اختر علی خان مہاراجہ کشمیر کی ذاتی ملازمت میں آ گئے تھے۔

(پنجم) پنجاب میں احرار اسلام اور جماعت احمدیہ کی کشمکش زوروں پر تھی۔

بہرحال اُن سب تلخ و سنگین حالات کے باوجود حکومت کشمیر نے چند اصلاحات نافذ کیں اور کچھ دستوری مراعات بھی، یعنی گلینسی کمیشن کی رپورٹ شائع ہو گئی جس میں یہ اعلان تھا کہ "ریاست میں مکمل مذہبی آزادی ہو، مذہبی عبادت گاہوں سے سرکاری قبضے کو ختم کر کے انہیں عوام کے سپرد کر دیا جائے۔ تعلیم کی عام اشاعت ہو۔ ابتدائی مدارس زیادہ تعداد میں کھولے جائیں۔ مسلم اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ایک خاص عہدیدار مسلمانوں کی تعلیم کے انتظام کے لئے مقرر کیا جائے۔ تمام ملازمتوں کی باقاعدہ تشہیر ہو اور ہر فرقہ کو مناسب حصہ دیا جائے۔ انہی ایام میں علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں سید نذیر نیازی کو لکھا۔

"کشمیر کمیٹی کا اجلاس اس اتوار کو ہو گا ہم سب اس بات کے متمنی ہیں کہ وہاں امن قائم رہے اور وہاں کے لوگ ان اصلاحات سے متمتع ہوں جو فی الحال ان کو مل گئی ہیں" (۲) علامہ اقبالؒ نے ۱۳ اگست ۱۹۳۳ء کو حکومت کے اِس اعلان کا خیر مقدم کیا اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ تمام سیاسی اسیروں کو رہا کر دے اور میرپور اور بارہ مولا میں جو مقدمات درج ہیں ان کو واپس لے کر اعتماد پیدا کرے دوسری طرف آپ نے مسلمانوں سے بھی اپیل کی کہ وہ حکومت سے تعاون کریں۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جون ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا گیا تھا تو پھر جولائی ۱۹۳۳ء میں کشمیر کمیٹی کے

اجلاس کی کیا ضرورت تھی؟

اِس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے اِس دور کے رفیق سید نذیر نیازی لکھتے ہیں "حضرت علامہ کو گویا اب سیاسی ہنگاموں سے فراغت تھی۔ کشمیر کمیٹی کا اجلاس اتوار کو ہوا لیکن اب اِس کے وجود کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ گو اِس کا خاتمہ بہت آگے چل کر ہوا۔ بات یہ ہے کہ کشمیر کو اِس زمانے میں جو اصلاحات ملیں، مسلمانوں کے اس عملی اقدام کا نتیجہ تھیں جو انہوں نے ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف کیا اور جس میں کشمیر کمیٹی کی کوشش بھی شامل تھی لیکن اصلاحات کے بعد نہ تو اس عام تحریک کا جو مسلمانوں کی مختلف جماعتوں نے شروع کی تھی کشمیر کمیٹی سے کوئی جوڑ جڑ سکا، نہ کشمیر کمیٹی اِن مختلف عناصر میں جن پر اُس کا وجود مشتمل تھا مستقبل کے لئے اتحاد و اتفاق کی کوئی صورت پیدا کر سکی۔" (۵)

آگے چل کر سید نذیر نیازی لکھتے ہیں "کشمیر میں نفاذ اصلاحات کے بعد جب مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کا قدیم نزاع مذہبی، سیاسی، ایک نئی شکل میں زندہ ہوا یا زندہ کر دیا گیا تو اِس سے پنجاب (قبل تقسیم) کی فضا اور زیادہ مکدر ہو گئی کشمیر کمیٹی میں کچھ ایسی ہی کشمکش دیر سے چلی آ رہی تھی۔ لہٰذا اندیشہ تھا کہ اِس کمیٹی کے اندر بھی ایک دن یمین و یسار کا تصادم ناگزیر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حتیٰ کہ کشمیر کمیٹی کے وجود برائے نام قائم رہ گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ کمیٹی کے اندر اور ایسے ہی کمیٹی کے باہر بھی بعض ارکان کا احساس یہ تھا کہ اس کے کچھ عناصر مسئلہ کشمیر کی بجائے اپنے ذاتی اور جماعتی مقاصد کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ یہ خیال پیدا ہوا تو عقیدہ ختم نبوت، یا یہ سوال کہ بحیثیت ایک امت یعنی اجتماع مدنی مسلمانوں کی وحدت اور حفظ و استحکام کا دارومدار اِس اصول پر ہے پھر تازہ ہو گیا اور اِس کے نتیجے کے طور پر یہ کہ مسلمان کون ہے اور کون نہیں؟ (۶)

یہ مسئلہ صرف مسلمانوں میں ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ غیر مسلموں نے بھی اُٹھایا جن میں پنڈت جواہر لعل نہرو شامل ہیں جنہوں نے "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں مضامین لکھے اور علامہ اقبالؒ کے بیان قادیانی اور جمہور مسلمان پر کچھ سوالات اٹھائے علامہ اقبالؒ نے پنڈت نہرو کے اعتراضات یا سوالات کا بالتفصیل جواب دیا اور پنڈت نہرو کے آغا خان پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"ہز ہائی نس آغا خان کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں میرے لئے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خان پر کیوں حملے کئے شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل ہیں وہ اس بات سے بدبختہ" بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں، پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیل تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا، وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائی نس آغا خان نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل الفاظ سے مخاطب کیا تھا" (ستار الہ آباد ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء)

گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے، تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملا کرو اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو، مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو، پابندی سے روزے رکھو، اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو، تم مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔"

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اِس امر کا تصفیہ کرنا چاہئے کہ آیا آغا خان اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں؟ بہر حال علامہ اقبال ؒ کے آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں جماعت احمدیہ سے اختلافات ہو گئے اور اُنہوں نے جماعت احمدیہ کے اِن وکلاء پر بھی تنقید کی جو مقدمات کو چھوڑ کر چلے گئے دوسری طرف احرار اسلام کی تحریک کا دباؤ تھا۔ علامہ اقبال ؒ تو کشمیری مسلمانوں کی دستگیری چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اُن کے سینوں میں حدت پیدا کر دی تھی اور وہ جان چکے تھے کہ

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

اِس لئے اُن جھمیلوں سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی ذاتی حیثیت میں کشمیری تحریک کی امداد و اعانت اپنے دم واپسیں تک کرتے رہے اُن کی رحلت پر اُن کے دوست اور ساتھی مورخ کشمیر محمد الدین فوق نے فرمایا

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی

فطرت حق کا جسے کچھ راز داں سمجھا تھا میں

یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبر دین خودی

یا چراغ محفل ہندوستان سمجھا تھا میں

حواشی

۱۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۱۸۱

۲۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۱۸۲۔ ۱۸۳

۳۔ حرف اقبال ص ۶۸

۴۔ مکتوبات اقبال ص ۱۱۶

۵۔ ایضاً ص ۱۱۶۔ ۱۱۷

۶۔ ایضاً ص ۳۱۰۔ ۳۱۱

۷۔ حرف اقبال ص ۱۶۱

علامہ محمد اقبال۔ دوسری گول میز کانفرنس اور تحریک کشمیر

برطانوی حکومت نے ہندوستان کے آئینی، دستوری اور سیاسی مسائل کے لئے ۱۹۳۰ء کے اواخر میں لندن میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا متفقہ دستوری فارمولا مرتب کیا جائے جس کی وساطت سے ہندوستانی قوم کے لئے ایک قابل عمل آئین تیار کیا جائے۔ یہ پہلی گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی جو نشستند و گفتند و برخاستند سے آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن علامہ محمد اقبال نے جو اس پہلی گول میز کانفرنس میں شریک نہیں تھے، ۲۹، دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں جو صدارتی خطبہ پیش کیا وہ درحقیقت مسلمانان ہند کی منزل کا تعین تھا۔ یعنی پہلی گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد علامہ محمد اقبال نے برطانوی حکومت کو بتایا تھا کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں؟ چنانچہ جب دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں بلائی گئی تو اس میں علامہ محمد اقبال کو بھی مدعو کیا گیا۔ عاشق حسین بٹالوی کی روایت کے مطابق انہیں شرکت کی دعوت سر میاں فضل حسین کے ایماء پر دی گئی تھی۔ اس بات کی تصدیق عظیم حسین کی کتاب "سر فضل حسین" سے بھی ہوتی ہے — جن مسلم زعمائے کرام نے اس کانفرنس میں شرکت کی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سر آغا خان، سر علی امام، نواب احمد سعید چھتاری، مسٹر اے کے فضل الحق، اے ایچ غزنوی، خان بہادر حافظ ہدایت حسین، علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر شفاعت احمد خان، میاں محمد شفیع، مولانا محمد شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، سر سلطان احمد، چودھری ظفر اللہ خان، سر صاحبزادہ عبدالقیوم، سر شاہنواز خان، غلام مرتضیٰ خان بھٹو، سر غلام حسین ہدایت اللہ،

کیپٹن راجہ شیر محمد خان ڈومیلی، نواب صاحبزادہ سید محمد مہر شاہ، جمال محمد، سید محمد پادشاہ صاحب بہادر، بیگم شاہ نواز، قائداعظم محمد علی جناح۔

علامہ محمد اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ آپ کو اقلیتوں سے متعلقہ کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ مسلم وفد کے صدر ہزہائی نس سر آغا خان تھے۔ اور بقول محمد احمد خان "ڈاکٹر صاحب، ہزہائی نس آغا خان کو مختلف مسائل میں مشورے دیتے رہے۔" [۱] قلیتوں کی کمیٹی کے چار اجلاس ہوئے۔ یہ کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہو گئی — علامہ محمد اقبال اِس میں شرکت کے لئے ۲۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچے تھے — لندن میں آپ نے سینٹ جمیز کورٹ میں قیام کیا۔ آپ کے ہمراہ مولانا غلام رسول مہر تھے۔

دوسری گول میز کانفرنس میں علامہ محمد اقبال نے منجملہ دیگر مسائل کے، برطانوی حکومت سے ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی صورت حالات پر بات چیت کی — اور قبل اِس کے کہ علامہ محمد اقبال، قائداعظم محمد علی جناح، اور سر میاں محمد شفیع کی مساعی جمیلہ کا ذکر کیا جائے، بہتر ہو گا کہ اِس دور کے کشمیر کی سیاسی حالت پر بھی اجمالاً نظر ڈالی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء ہی میں تحریک حریت کشمیر اپنے فکری و نظری دور سے انقلابی دور میں داخل ہوئی تھی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سری نگر میں مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ حکومت نے گولی چلا کر بائیس فرزندان توحید کو شہید کر دیا تھا چنانچہ پورے برصغیر میں ایک غوغا بپا ہو گیا اور اکابرین ملت نے شملہ میں اکٹھے ہو کر "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" قائم کی جس کے صدر جماعت احمدیہ کے امیر میرزا بشیر الدین محمود مقرر ہوئے اور علامہ محمد اقبال اِس تنظیم کے سیکرٹری جنرل چنے گئے۔ کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ حکومت کے مظالم کا، مسلمانان ہند پر اتنا اثر ہوا کہ بلا امتیاز فرقہ بندی اور اختلاف مسالک کے سبھی متحد ہو گئے۔

علامہ محمد اقبال نے اِس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا — اور بقول مصنف "اقبال کا سیاسی کارنامہ":

"اب جبکہ کشمیریوں پر یہ زمین تنگ کی جانے لگی تو بھلا ڈاکٹر صاحب خاموش کیونکر بیٹھ سکتے تھے، چنانچہ اُنہوں نے کشمیر کمیٹی میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ جیسا کہ بیان کیا

گیا ہے، کشمیر کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانان کشمیر کو ان کے واجبی حقوق دلائے جائیں ــــ کشمیر کمیٹی نے پہلا کام یہ کیا کہ جو مسلمان کشمیر میں قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے، اُن کو ممکنہ قانونی امداد دی۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلچسپی سے کام کیا اور اپنے ذاتی اثر اور تعلق سے بعض نامی گرامی وکلا کو کشمیر روانہ کیا۔ پٹنہ کے مولوی نعیم الحق، ڈاکٹر صاحب سے تعلق خاطر کے باعث کشمیریوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ اِسی طرح لاہور سے بھی ڈاکٹر صاحب نے بعض وکلا کو روانہ کیا۔ علامہ مرحوم نے نواب سر حمید اللہ خان والی بھوپال کے نہایت گہرے دوستانہ مراسم تھے اور ادھر مہاراجہ کشمیر کے بھی والی بھوپال سے دوستانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے والی بھوپال کے ذریعے مہاراجہ کشمیر کو اِس امر پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانان کشمیر کے جائز مطالبات کی تحقیق کے لئے ایک کمیٹی مقرر کریں ــــ چنانچہ اقبال کی مساعی کامیاب ہوئیں۔"[۲]

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء سے لے کر اپنی لندن روانگی (ستمبر ۱۹۱۳ء) تک علامہ محمد اقبال تحریک حریت کشمیر سے برابر آگاہ تھے۔ علامہ محمد اقبال لندن میں بے حد مصروف رہے۔ آپ نہ صرف برطانوی حکومت کے وزراء سے ملے بلکہ کئی مجلسوں میں بھی شرکت کی۔ وزیر ہند سر سیموئیل ہور خود علامہ اقبال سے ملنے آئے۔ سابق ایرانی وزیر اعظم سید ضیاء الدین طباطبائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ سفارت خانہ عراق کے سیکرٹری افضل بے نے دعوت ظہرانہ دی۔ البانیہ کے سفیر نے بھی دعوت پر مدعو کیا۔ ممتاز صحافی مسٹر پنکر ڈ نے بھی دعوت دی۔ ایک محفل قرآت میں بھی شرکت کی۔ انگریز نوجوان عبد الرحمن بارڈی نے چند سورتیں سنائیں، اور جب ایک چھ سات سالہ بچی نے سورہ فاتحہ سنائی تو علامہ اقبال نے خوش ہو کر اسے ایک پاونڈ انعام دیا ــــ غازی رؤف بے آف ترکی سے بھی ملے۔

ہماری دانست میں اِن سب مصروفیات کے باوجود علامہ محمد اقبال کشمیر کو نہ بھولے۔ گو کشمیر کا مسئلہ گول میز کانفرنس میں زیر بحث نہ آیا لیکن اِس کا ذکر جب بھی کسی نہ کسی حوالے سے ہوا تو گاندھی جی نے چپ سادھ لی۔ بہرحال ۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستانی مسلمانوں کا وفد حکومت ہند کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ سے ملا اور اِس سے کشمیر کے بارے میں گفتگو کی۔ یہ گفتگو اب تک صیغہ راز میں تھی جسے پہلی بار پاکستان کے ممتاز دانش ور ڈاکٹر رشید احمد جالندھری صفحہ قرطاس پر لائے۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، عہد حاضر میں جدیدیت کے حوالے سے ایک معتبر محقق ہیں۔ جب وہ لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں بعض فائلیں دیکھ رہے تھے تو انہیں "ڈاکٹر اقبال اور کشمیر" سے متعلق ایک فائل مل گئی جس میں علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کی بات چیت درج ہے — ظاہر ہے کہ یہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہے۔ اِس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

" — نو نومبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستانی وفد کے مسلم ارکان نے، جو گول میز کانفرنس میں یہاں لندن آئے تھے، حکومت ہند کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ کے ساتھ ایک ملاقات کی جس میں انہوں نے مسئلہ کشمیر پر گفتگو کی۔ سر محمد شفیع نے کشمیر کی افسوس ناک صورت حال تفصیل سے بیان کی۔ انہوں نے بتایا کہ کشمیری مسلمان ہر قسم کے جبر و استبداد کا شکار بن رہے ہیں۔ پولیس اِن کی مقدس کتاب، عبادت گاہوں اور عورتوں کی بے حرمتی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہونے والے مظاہرے مہاراجہ کے خلاف نہیں ہیں۔ یہ صورت ۲۵ برس سے قائم ہے — لیکن اِس کے باوجود برطانوی حکومت نے کشمیر میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ اِس نکتے پر ڈاکٹر محمد اقبال نے فرمایا:

اگر مہاراجہ نے اِس (افسوس ناک) صورت حال کو برابر جاری رکھنے کی اجازت دی تو وہ اِس کا ذمہ دار ہے۔ آپ (سر میاں محمد شفیع) یہ بات کھل کر کیوں نہیں کہتے؟

اِس پر چودھری ظفر اللہ خان نے کہا: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں، مہاراجہ کو اِس کا علم نہیں ہے تاہم یہ فیصلہ کیا گیا کہ اقبال اور ذوالفقار علی، مہاراجہ سے ملاقات کریں، لیکن موخرالذکر اِس ملاقات پر آمادہ نہ تھے۔ وائسرائے کی دوبارہ ہدایت پر ہم نے مہاراجہ سے ملاقات کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ وہاں کے سرکاری حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ حکومت کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنا چاہتی ہے۔ لیکن انڈیا آفس کے کہنے پر حکومت نے کشمیر میں مداخلت کرنے

سے اجتناب کیا ہے۔ اب یہ حکومت برطانیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کشمیر کے معاملات پر غور کرے کیونکہ اسی نے کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا —

یہ تقریر سننے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے کشمیر کے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"اب سب حقائق آپ کے سامنے ہیں۔ میں اپنی طرف سے ان میں کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سری نگر میں بچوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا جا رہا ہے۔ سری نگر کی تقریباً ہر گلی میں ان پر گولی چلائی جا رہی ہے، اور ڈوگرہ پولیس کے ہاتھوں عورتوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس یورپ کی تین مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی شہادتیں موجود ہیں جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں — اب اس معاملہ میں انکوائری کے لئے نہ صرف پنجاب اور کشمیر کے مسلمان، بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمان کشمیر میں ڈوگر فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی تحقیقات کی شدید خواہش رکھتے ہیں، چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہماری اس خواہش کو سیکرٹری آف سٹیٹ (برائے ہندوستان) تک پہنچا دیں کہ وہ کشمیری فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی فوری تحقیقات کے احکام صادر کریں۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں اگر لوگوں کا قصور ثابت ہو تو لوگوں کو سزا دی جائے یا ان کی مذمت کی جائے — لیکن اگر مہاراجہ یا اس کی انتظامیہ قصور وار ہو تو مہاراجہ کو معزول کیا جائے۔ میں مہاراجہ اور اس کی انتظامیہ کے قصور وار ثابت ہونے پر مہاراجہ کی معزولی کا مطالبہ کرتا ہوں۔ ہمیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں ہے کہ کشمیری مسلمانوں پر وہاں کی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہیں یا ان کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود نہیں ہیں۔ ہمیں اس کی بھی کوئی پروا نہیں کہ انہیں فوجی تعلیم و تربیت سے دور رکھا جاتا ہے نہ ہمیں اس بات کی پروا ہے کہ ان پر بھاری ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ پچھلے ساٹھ برس سے ۲ روپے ۷ آنے سالانہ ادا کر رہے ہیں جبکہ ہندو شہری صرف ۳ آنے سالانہ ادا کرتے ہیں۔ ہمیں ان باتوں کی کوئی فکر نہیں۔ ہمیں فکر صرف اس بات کی ہے کہ کشمیری عوام کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ ان کی عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں

کے ساتھ انصاف کیا جائے جو کشمیری فوج کے ہاتھوں بے رحمی سے قتل ہو رہے ہیں۔ ہم آپ سے چاہتے ہیں کہ آپ معاملہ کی تحقیق کرائیں — اور اگر ضروری ہو تو مہاراجہ کو معزول کر دیں۔ یہی ہمارا مطالبہ ہے جو میں بالکل سیدھے سادھے انداز میں آپ — سیکرٹری آف سٹیٹ — اور برطانوی عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے مستقبل قریب میں مجھے (یہاں) اِس موضوع پر بات کرنے کے مواقع ملیں گے — اور میں یہ تمام معاملات برطانوی عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں کیونکہ اِن تمام امور (قتل و غارت) کو کم از کم ایک سو برس تک جاری رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ شاید برطانوی عوام کشمیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہوں نے (برطانوی حکومت) کشمیر کو ۷۵ لاکھ روپے (تقریباً ۵۰ ہزار پونڈ) میں فروخت کیا ہے۔ یہ ایک ایسا سودا ہے جسے نہ تو جدید فلسفہ قانون تسلیم کرتا ہے اور نہ جدید اخلاقیات۔ اِس سودے کے دو سال بعد ہندوستان میں اِس وقت کے گورنر جنرل سے اعلان کیا تھا کہ اِس سودے کو بے انصافی کا ذریعہ بننے نہیں دیا جائے گا' لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہی سودا پچھلے سو برس سے ایک بہت بڑے ظلم و ستم کی وجہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ میں آپ کی انصاف اور مساوات کی بلند روایات سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ غور کریں کہ آیا کشمیری عوام سے انصاف ہو رہا ہے یا نہیں۔ اور اگر اِس ناانصافی میں مہاراجہ ملوث ہے تو آیا اِس کی حکومت ختم ہو گئی ہے یا نہیں — ہم کسی صورت میں مہاراجہ کی حکومت کے جاری رہنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر کشمیری عوام غلطی پر ہیں — جو بھی صورت ہو — اِن کے عورتوں، مردوں اور بچوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر قتل کیا گیا ہے۔ اور اگر تحقیقات کے نتیجے میں مہاراجہ کا اِس جرم میں شریک ہونا ثابت ہو جائے تو اِس یقیناً معزول کیا جانا چاہئے۔ ہم اِس جرم میں مہاراجہ کا کم از کم اِس حد تک تو ملوث ہونا سمجھتے ہیں کہ آخر کار وہ انتظامیہ کا سربراہ ہے۔ اگر آپ ہمارا یہ مطالبہ پورا نہیں کریں گے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اِس وفد میں ایسے ارکان بھی موجود ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ اگر آپ کشمیری عوام کا مطالبہ پورا نہیں کرتے اور ڈوگرہ فوج کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی تحقیقات نہیں کراتے تو وہ (ارکان) آپ کے ساتھ پرخلوص تعاون نہیں کر سکتے۔

شوکت علی: میں عزت مآب مہاراجہ کے ذاتی دوستوں میں شامل ہوں، اور میرا خیال

ہے کہ مہاراجہ ایک اچھے انسان ہیں۔

اقبال: وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ آپ اپنے ذاتی تعلقات کو بیچ میں نہ لائیں۔ آپ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے آئے ہیں۔

شوکت علی: سر محمد اقبال نے جو کچھ کہا، میں اس میں مداخلت نہیں کرتا، اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ بھی میری بات میں مداخلت نہیں کریں گے۔

اقبال: یہ مداخلت کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ یہاں اپنی ذات کی نمائندگی کرنے نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے آئے ہیں —

شوکت علی: میں سر محمد اقبال کا بہت احترام کرتا ہوں۔ جب یہ سب باتیں وقوع پذیر ہو رہی تھیں تو وہ وہاں موجود تھے جبکہ میں وہاں موجود نہیں تھا۔ اِن کا تعلق کشمیر ہی سے ہے اور میں اُن کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے اپنی بات اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کی اجازت دیں گے۔ مجھے ہندوستان کی ریاستوں پر پورا بھروسا ہے، اور ہم ہاں مستقبل کے لئے دستور سازی کر رہے ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اِن معاملات کا تدارک نہ کیا گیا اور اِن معاملات میں حکومت برطانیہ کا نام بول بار بار لیا جاتا رہا تو ہم جو بڑے سکون سے کام کر رہے ہیں، سکون سے کام کرنا مشکل ہو جائے گا — میرا خیال ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں کچھ مفید لوگ ہیں جو مسلمانوں اور آپ (انگریزوں کے درمیان مزید اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ لوگ آپ میں اور مسلمانوں میں جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں مقدور بھر اِس پریشانی سے بچنا چاہیے — اور میں سیکرٹری آف سٹیٹ اور انگریز عوام سے پر زور اپیل کرتا ہوں کہ آپ فوری طور پر کچھ کریں تاکہ یہ شکایات ختم ہو جائیں —

محمد علی جناح: جناب! کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ موجودہ دور میں کشمیر میں برطانیہ کی آئینی حیثیت کیا ہے؟

سٹیورٹ: اِس وقت میرے پاس کشمیر کے ساتھ ہونے والا معاہدہ موجود نہیں ہے،

لہٰذا میرے لیے فوری طور پر اس طور پر اس کا جواب دینا مشکل ہو گا۔

محمد علی جناح: میں معاہدے کا نہیں پوچھ رہا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک طرح سے مہاراجہ کی درخواست پر حکومت نے کشمیر کو (اپنے) کنٹرول میں لیا ہے۔

پیٹرک: مہاراجہ نے انگریز فوجی دستوں کی امداد کی درخواست کی تھی۔

محمد علی جناح: لیکن اب وہاں پر اختیار کس کے پاس ہے؟

آغا خان: نظم و نسق کا؟

محمد علی جناح: ہر بات کا — میں اپنے سوال کا مستند جواب چاہتا ہوں کیونکہ ہم اخبارات میں اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھتے ہیں لیکن ہم اخبارات کی ان خبروں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جنکنز ہی وہ شخص ہیں جس کے ہاتھ میں مکمل طور پر جموں کے سول اختیارات ہیں۔

پیٹرک: وہ جموں میں فوجی کمانڈر کے ساتھ سیاسی مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

محمد علی جناح: لیکن اب انہوں نے وہاں کلی اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ سول بھی اور فوجی بھی۔

پیٹرک: مسٹر جناح! میرے پاس یہی معلومات تھیں۔

ڈاکٹر شفاعت: مہاراجہ تو بس برائے نام ہے!

محمد علی جناح: میں اس بات کا جواب اپنے رفقاء سے نہیں سننا چاہتا۔ مجھے سرکاری معلومات درکار ہیں، اور اسی لئے میں جاننا چاہتا ہوں کہ کہ وہاں کی آئینی حیثیت کے بارے میں سرکاری اطلاعات کیا ہیں؟ میں آپ کو بتاؤں گا کہ میں یہ بات جاننے کے لئے اتنا بے چین کیوں ہوں۔ اگر ہمیں حتمی طور پر معلوم ہو جائے کہ کشمیر میں داخلی اختیارات کس کے پاس ہیں تو ہم آپ کے لئے اور بھی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرے یہ سوال پوچھنے کی صرف یہی وجہ ہے۔ میں یہ سوال پریشانیاں پیدا کرنے کے لئے نہیں پوچھ رہا بلکہ میں یہ جاننے کے لئے واقعی سخت بے چین ہوں — اگر آپ مجھے بتا سکیں کہ اس وقت کشمیر میں کلی اختیار کس کے پاس ہے؟ آیا یہ اختیار انگریزی

حکومت کے پاس ہے یا نہیں؟"

(انڈر سیکرٹری برائے امور ہند) کے ساتھ مسلم وفد کا یہ اجتماع ۹۔ نومبر ۱۹۳۱ء بروز پیر سہ پہر چار بجے منعقد ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو۔ ایل۔ پی۔ او ۱۹۴۹ء/۶۔ II۔ ۳۔

غرضیکہ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر مسئلہ کشمیر کو اُٹھایا۔ متذکرہ صدر بات چیت میں جن چند باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن میں سے بعض کی وضاحت ضروری ہے:

اول: مسلم وفد اور برطانوی حکومت کی بات چیت کا پس منظر۔

دوم: جموں میں برطانوی فوج کی موجودگی۔

سوم: مولانا شوکت علی مرحوم کا مہاراجہ ہری سنگھ کا دفاع کرنا۔

۱۹۳۱ء میں جموں میں عیدالاضحی کے موقع پر ڈوگرہ پولیس کے ایک کارندے نے جس کا نام کھیم چند تھا، مفتی محمد اسحاق کو خطبہ عید دینے سے منع کر دیا۔ مسلمانوں نے اِس پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا اور اِسے مداخلت فی الدین قرار دیا —اِس واقعے کے چند روز بعد جموں جیل میں ایک غیر مسلم ملازم نے ایک مسلمان قیدی (جو تلاوت کلام پاک کر رہا تھا) سے قرآن پاک (پنج سورہ) لے کر زمین پر پھینک دینے کی سفاکانہ جسارت کی اور توہین قرآن کا مرتکب ہوا۔ اِن واقعات نے مسلمانان ریاست کو تڑپا دیا۔ اِس سلسلے میں صوبہ کشمیر میں اجتماعات شروع ہو گئے۔ جون ۱۹۳۱ء کو ایک غیر ریاستی باشندے عبدالقدیر خان نے مسلمانان کشمیر کے اجتماع سے خطاب کیا جس پر اِسے بغاوت پر اکسانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ کشمیری مسلمانوں نے اِس کی حمایت میں جلوس نکالے، جلسے کیے اور مظاہرے بھی کئے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل سری نگر کے باہر جمع شدہ کشمیری عوام پر، جو عبدالقدیر خاں کے مقدمے کی سماعت کے لئے آئے تھے، حکومت جموں و کشمیر نے گولی چلا دی جس سے بائیس (۲۲) مسلمان شہید ہو گئے۔

اِس وقت ریاست کا وزیر اعظم ایک انگریز مسٹر ویکفیلڈ تھا جس نے اِن حالات کو اپنی کتاب یادداشتیں (Recollections) میں لکھا ہے، اور کہا کہ ہر شہید ہونے والے کے بدن پر گولی سینے پر لگی تھی۔

اِس واقعے کا پورے ملک میں چرچا ہوا۔ مسلمانوں نے علامہ محمد اقبال کی سرکردگی میں کام شروع کر دیا۔ مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کے "انقلاب" مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" اور شیر جنگ کے اخبار "سیاست" نے اِس مسئلے کو اولیت دی۔ چونکہ جماعت احمدیہ نے بھی کشمیریوں کی حمایت کی تھی، اِس لئے چودھری ظفراللہ خان بھی پیش پیش تھے — پھر "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" بھی قائم ہو چکی تھی جس کے روح رواں علامہ محمد اقبال تھے، اور یہ جماعت مسائل و مصائب کشمیر میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ازاں بعد جب جماعت احمدیہ نے اِس تنظیم کے حوالے سے اپنی مذہبی سرگرمیاں شروع کیں تو علامہ محمد اقبال اِس سے الگ ہو گئے —

۲۔ جن ایام میں دوسری گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا — اِن دنوں ریاست جموں و کشمیر میں تحریک حریت کشمیر زوروں پر تھی اور ڈوگرہ حکومت نے برطانوی ہند کی حکومت سے نہ صرف فوجی امداد لی تھی بلکہ ریاست میں مارشل لاء بھی لگا دیا تھا۔ خاص طور پر جموں میں، جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ۷ا کا تک (بکرمی) مطابق نومبر ۱۹۳۱ء کو پانچ مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اور جموں میدان کار زار بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے برطانوی حکومت کے نمائندے سے بار بار یہ استفسار کیا کہ ریاست میں کس کی حکومت ہے؟

(علامہ محمد اقبال لندن میں بھی کشمیر کے حالات سے باخبر رہے)

۳۔ جہاں تک مولانا شوکت علی مرحوم کا مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ کے دفاع کا تعلق ہے، حقیقت یہی ہے کہ مولانا مرحوم، مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے۔ وجہ یہی تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ — بباطن انگریزی حکومت کے خلاف تھا۔ جس نے اِس کی تخت نشینی سے قبل مسٹر "اے" کے نام سے بلیک میلنگ کا مقدمہ بنوا دیا تھا — دوسری بات یہ ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ، مولانا محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس، جس کے دوران مولانا محمد علی جوہر خالق حقیقی سے جا ملے، کے سلسلے میں جو خط لکھا ہے اور اپنے بھائی کی وفات اور میت کے سوائے فلسطین روانگی کی روداد قلم بند کی ہے اِس میں تحریر ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کی وفات کی خبر سن کر جو چند لوگ فوری طور پر آئے اِن میں مہاراجہ ہری سنگھ آف کشمیر بھی تھا۔

(یاد رہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے بیشتر ریاستی حکمرانوں کو مدعو کیا لیکن مہاراجہ کشمیر کو نہیں کیونکہ اِن دنوں ریاست میں تحریک حریت کشمیر جاری تھی۔)

بہر حال علامہ اقبال کشمیر سے غافل نہیں رہے۔ اِس وقت علامہ محمد اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر بھی تھے جس کا اجلاس ۲۰ نومبر ۱۹۱۳ء کو ہوا جس میں کشمیر سے متعلق مندرجہ ذیل قرار داد منظور ہوئی:

"کمیٹی، کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے جن پر حکومت کشمیر نے ناگفتہ بہ مظالم توڑے ہیں — اور اپنے حقوق کے لئے جنگ میں اُنہوں نے جو قربانیاں دیں، اِنہیں بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، نیز کمیٹی، مسلمانان پنجاب کی قابل تعریف کوششوں کی تعریف کرتی ہے جو اُنہوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد میں انجام دی ہیں۔ مہاراجہ کشمیر کے تازہ اعلان کے پیش نظر کمیٹی توقع رکھتی ہے کہ اِس پر پورے طور پر عمل کیا جائے گا اور ہزہائی نس کی رعایا کی شکایات اور تکالیف کا پوری طرح تدارک ہو جائے گا — نیز کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ جب تک مسلمانان کشمیر کی شکایات دور نہ ہوں گی، مسلمانان ہند کی بے چینی کم نہ ہو گی۔ کمیٹی، حکومت ہند کو متنبہ کرتی ہے کہ اگر موجود حالات میں پھر مسلمانون کو ڈوگروں کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا تو اِس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہو گی۔ کمیٹی مطالبہ کرتی ہے کہ کشمیر آرڈی نینس فی الفور منسوخ کر دیا جائے، اور اِس کے تحت جو افراد گرفتار ہیں، اِنہیں فوراً رہا کر دیا جائے۔ نیز کمیٹی کے نزدیک جب تک آرڈی نینس پر عمل ہوتا رہے گا مسلمانان پنجاب اور حکومت کے درمیان کسی مصالحت کی توقع نہیں، اِس لئے حکومت سے پر زور اپیل کی جاتی ہے کہ اِس مسئلے پر مزید ایجی ٹیشن بند کرانے کے لئے جلد کارروائی کرے۔" (۳)

۴۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد آپ وطن واپس آئے کیونکہ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو کانفرنس ختم ہو گئی تھی۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں آپ کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس، جو اب تک آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے مشہور ہو چکی تھی، کا صدر منتخب کیا گیا۔ یہ جماعت نہرو رپورٹ کے خلاف تمام مسلم مکاتیب فکر کو متحد کرنے کے لئے بنائی گئی تھی — بہر حال، ڈاکٹر محمد اقبال نے آل انڈیا، مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کشمیری عوام کی

آزادی کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

حواشی

۱۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' صفحہ ۱۳۵

۲۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۱۸۰

۳۔ المعارف اپریل ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۲۔۲۷

۴۔ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ء

علامہ اقبال کے خطوط کشمیری مشاہیر کے نام

علامہ اقبال ؒ کے اُردو خطوط کے کئی مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اِن میں شیخ عطاء اللہ کا مرتب کردہ "اقبال نامہ" دو حصوں میں ۱۹۴۴ء اور ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ بزمِ اقبال لاہور نے "مکاتیب اقبال" بنام خان نیاز الدین خان ۱۹۵۴ء میں شائع کیے۔ اقبال اکادمی کراچی نے "مکتوبات اقبال" بنام سید نذیر نیازی ۱۹۵۴ء میں طبع کیے۔ اِس سے قبل ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے "شادِ اقبال" کے نام سے اُن خطوط کو ترتیب دیا جو علامہ اقبال ؒ نے مہاراجہ کشن پرشاد شاد مدار المہام سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن کو تحریر کیے تھے۔ مارچ ۱۹۶۷ء میں اقبال اکادمی کراچی نے "انوارِ اقبال" کے نام سے اِن خطوط کو یکجا کر کے شائع کیا جو علامہ اقبال نے وقتاً فوقتاً اپنے احباب اور ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کو لکھتے تھے۔ مولانا غلام قادر گرامی (جالندھری) کے نام مکتوبات کا مجموعہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ انگریزی زبان میں قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر مشاہیر کرام کے نام خطوط اِن کتابوں کے علاوہ ہیں۔

اُردو مکتوبات کے اُن مجموعوں میں کئی خطوط ایسے ہیں جو علامہ اقبال نے باواسطہ یا بلاواسطہ کشمیر اور اہل کشمیر کے بارے میں کشمیری مشاہیر اور ہمدردانِ کشمیر کو تحریر کیے۔ چنانچہ اقبال نامہ حصہ اول اور حصہ دوم میں جن کشمیری مشاہیر کو مخاطب کیا گیا ہے اِن میں منشی محمد الدین فوق، خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی کشمیر ریذیڈنسی، مولانا انور شاہ لولابی ثم دیو بندی، شیخ محمد عبداللہ، اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

جموں و کشمیر میں مقیم کشمیری باشندوں کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں جن کشمیری نژاد دانش وروں، سیاستدانوں اور اصحاب فکر و نظر کو اپنے فکری اور نظری

خیالات و نظریات سے آگاہ کیا ہے، اِن میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی سراج الدین پال، پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کے ساتھ خواجہ غلام السیدین سابق ناظم تعلیمات حکومت جموں و کشمیر اور پٹنہ کے سید نعیم الحق ایڈووکیٹ کے نام نمایاں ہیں۔

"انوار اقبال" میں جن کشمیری مشاہیر کو مخاطب کیا گیا ہے اِن میں محمد الدین فوق، میر خورشید احمد، منشی شیخ سراج الدین مل افسر کے علاوہ نواب بہادر یار جنگ، پروفیسر محمد علم الدین سالک اور مرزا یعقوب بیگ بھی شامل ہیں۔ موخرالذکر تینوں حضرات کو تحریک آزادیِ کشمیر کے حوالے سے یاد کیا ہے۔

"مکتوباتِ اقبال" میں نذیر نیازی نے علامہ اقبال کے کئی خطوط کے پس منظر کو تحریک آزادی کشمیر کے سیاق و سباق میں بیان کیا ہے۔ اِسی طرح اقبال بنام گرامی کے دو ایک خطوط سے بھی علامہ اقبال کے ادبیاتِ کشمیر سے لگاؤ کا پتہ ملتا ہے۔

علامہ اقبال کے اُن خطوط کے مطالعہ سے جو بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے، وہ اُن کی کشمیر کی آزادی کے لئے تڑپ، جوش اور ولولہ ہے۔ علامہ اقبال کشمیریوں کی انفرادی اور اجتماعی غلامی اور محکومی پر آنسو ہی نہ بہاتے تھے بلکہ اُن کو زنجیر غلامی توڑنے اور زندہ رہنے کے لئے درسِ عمل بھی دیتے تھے۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ کشمیری قوم آزاد ہو کر اپنی خداداد قابلیت اور فطری صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرے۔ اِس ضمن میں اُن کے منشی محمد الدین فوق کے نام خطوط توجہ کے مستحق ہیں۔ اور غالباً کشمیریوں میں یہ فوقیت منشی محمد الدین فوق ہی کو حاصل رہی کہ علامہ اقبال نے سب سے زیادہ خطوط اُنہی کو تحریر کیے اور نہ صرف اُن کی قلمی کاوشوں کو سراہا بلکہ "مجدد الکشامرہ" کے خطاب سے بھی نوازا۔ علامہ اقبال نے فوق مرحوم کو "ذیرِ فوق — ذیرِ فوق صاحب — برادر مکرم و معظم اور مکرم بندہ کے القابات سے مخاطب کیا ہے۔ علامہ اقبال کے فوق مرحوم کے نام مکاتیب کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔

"انوار اقبال" میں حضرت علامہ کا وہ خط بھی فوق کے نام موجود ہے جو شعرائے کشمیر کا تذکرہ مرتب کرنے کے بارے میں ہے۔ یہی خط "اقبال نامہ" حصہ اول میں ظہور الدین مہجور محکمہ مال کے نام پر درج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں ظہور الدین مہجور نام

کی کوئی شخصیت نہ تھی۔ البتہ کشمیری زبان کے مشہور شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور تھے اور حضرت علامہ کا خط غلام احمد مہجور کے نام ہی ہے۔ جنہوں نے تذکرہ شعرا کشمیر لکھنے کے لئے علامہ اقبال سے رجوع کیا تھا۔

فوق مرحوم کے نام خطوط میں علامہ اقبال نے اُن کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا ہے جو وہ کشمیریوں کی بیداری کے لئے کر رہے ہیں۔ اُن خطوط میں کشمیر کے علمی، ادبی سرگرمیوں، کشمیری ثقافت و صحافت، کشمیر کی پرانی تاریخ کی ترتیب و تدوین اور کشمیریوں کی معاشرتی اور معاشی حالات پر بھی اظہار کیا گیا ہے۔

فوق مرحوم کے نام ایک خط میں اپنے خاندانی حالات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"... مجھے معلوم نہیں لفظ "سپرو" کے معانی کشمیری زبان میں کیا ہیں۔ ممکن ہے اِس کے معنی وہی ہوں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔ یعنی وہ لڑکا جو چھوٹی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے۔ البتہ کشمیری برہمنوں کی جو گوت "سپرو" ہے اُس کے اصل کے مطابق جو کچھ میں نے اپنے والد مرحوم سے سنا تھا وہ عرض کرتا ہوں۔ جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو براہمہ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اِس قوم میں پہلے جس گروہ نے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اُس میں امتیاز حاصل کر کے حکومت اسلامی کا اعتماد حاصل کیا وہ "سپرو" کہلایا۔ اِس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے (یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا۔) "س" تقدم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے اور "پرو" کا 'روٹ' وہی ہے جو ہمارے مصدر پڑھنا کا ہے۔"[1]

آگے چل کر علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"دیوان ٹیک چند (ایم۔اے) جو پنجاب میں کمشنر تھے۔ اُن کو تحقیق لسان کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ انبالہ میں اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ "سپرو" کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاہ پور سے ہے اور "سپرو" حقیقت میں ایرانی ہیں جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوئے

اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے۔" (۲)

حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سے اہل خطہ کی عقیدت وارادت ڈھکی چھپی نہیں ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اِسی مردِ حق بین کی وساطت سے خطہ کشمیر جنت نظیر میں اسلام پھیلا اور بڑی تیزی سے پھیلا۔ علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں اِس بزرگ ہستی کا ذکر بڑی دل سوزی سے کیا ہے اور یہاں تک کہا ہے:

سید السادات سالارِ عجم
دست او معمار تقدیرِ امم

فوق مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" — "ذخیرۃ الملوک" کے دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ کوئی شخص کشمیر میں اِس کا ترجمہ اُردو زبان میں کر رہا ہے —" (۳) یہ کتاب امیر کبیر شاہ ہمدانؒ کی تصنیف ہے۔

ایک اور خط میں فوق لکھتے ہیں:

"ڈیر فوق ! کیا آپ آج کل لاہور میں ہیں یا میراکدل میں۔ ایک دفعہ آپ نے "کشمیری میگزین" میں میرے حالات شائع کیے تھے اگر اِس نمبر کی کوئی کاپی آپ کے پاس رہ گئی ہو تو ارسال فرمایئے۔ پھر واپس کر دی جائے گی۔ اگر پاس نہ ہو تو کہیں سے منگوا دیجیے۔" (۴)

یہ مضمون "مشاہیر کشمیر" میں چھپ چکا ہے — مولانا غلام قادر گرامی (جالندھری) کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

" — کیا آپ امسال کشمیر چلیں گے؟ اگر ارادہ ہو تو لکھیے۔ ممکن ہے کہ میں بھی آپ کا ساتھ دوں۔ کشمیر کی سیر کا آپ کی معیت میں لطف ہے۔ غنی کشمیر کی روح خوش ہو گی کہ گرامی جالندھری اِس کے مزار پر آئے۔" (۵)

مولانا غلام قادر گرامی کبھی کشمیر گئے تھے یا نہیں اِس سلسلہ میں گرامی اور اقبال دونوں کی تحریروں میں کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے البتہ جب راقم نے اِس ضمن میں ابوالاثر حفیظ جالندھری سے استفسار کیا تو اُنھوں نے لکھا:

"مولانا گرامی جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، کشمیر کبھی نہیں

گئے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ گرامی کشمیر کبھی نہیں گئے وہ تو یوں بھی سفر سے حتی الوسع کتراتے تھے۔ البتہ مجھ سے کشمیر کی مدح سن سن کر شاباش دیتے اور میرے سفر کو میری شاعری کے لئے ضروری فرماتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ کشمیر کے بارے میں جو پڑھا ہے، اُسی سے ظاہر ہے کہ دنیا میں جنت ہے لیکن اِس پر شیطان قابض ہے۔ کشمیر کے موضوع پر اُن کی کوئی نظم نہ میں نے نہ کسی میرے جاننے والے نے سنی۔ واللہ علم"(۶)

علامہ اقبال نے متذکرہ صدر خط ۲۸ جون ۱۹۱۷ء کو تحریر کیا تھا۔ مگر وہ خود بوجوہ ۱۹۲۱ء تا کشمیر نہ جا سکے تھے — ۷ نومبر ۱۹۲۰ء کو اُنھوں نے پھر مولانا گرامی کو لکھا:

" — شیخ نصیر الدین کے کتب خانے سے طالب آملی کے دیوان کا ایک قدیم نسخہ نکلا ہے۔"(۷)

طالب آملی کا شمار کشمیر کے صف اول کے فارسی کے شعراء کرام میں ہوتا ہے۔ جنھیں جہانگیر بادشاہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا اور وہ ابو طالب کلیم ہمدانی کا ہم عصر تھا۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کو کشمیر کے قدیم شاعروں اور اُن کے کلام سے کس قدر عقیدت و دلچسپی تھی۔

علامہ اقبال نے خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کو بھی کئی خطوط تحریر کئے۔ آپ منشی صاحب مرحوم کی علمی فضلیت اور سخن فہمی کے زبردست مداح تھے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی۔ بہرحال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اِس سے بہتر ہے۔ محض ذوقِ شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اٹھا سکتا ہے جیسا کہ خود شاعر جبکہ تصنیف کی شدید تکلیف اسے اٹھانی نہیں پڑتی۔"(۸)

حضرت علامہ اقبال اپنا کلام منشی سراج الدین کو بھی ارسال کرتے تھے اور انہیں کہتے تھے کہ بعد از مطالعہ اِسے "مخزن" میں بھیج دیجئے — ۱۹۰۲ء میں علامہ اقبال نے ایک

طویل نظم منشی صاحب مرحوم کو ارسال کی۔ جس کے بارے میں لکھا۔ "یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریہ میں عرض کرتا ہوں۔"

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغاں، انگشتری
دے رہی ہے مہر الفت کا نشاں، انگشتری
زینت دست حنا مالیدۂ جاناں ہوئی
ہے مثالِ عاشقاق آتش بجاں، انگشتری
تو سراپا آیتے از سورۂ قرآن فیض
وقف مطلق اے سراجِ مہرباں، انگشتری
میرے ہاتھوں سے اگر پہنے اُسے وہ دِلربا
ہو رموز بے دلی کی ترجماں، انگشتری (۹)

"اقبال اور تصوف" کے موضوع پر بہت کچھ کہا جاتا ہے اور کلام اقبال سے مختلف تعبیریں نکالی جا رہی ہیں۔ مگر اقبال نے اِس موضوع پر منشی سراج الدین کو جو کچھ لکھا وہ درج ذیل کیا جا رہا ہے۔ اِس سے علامہ اقبال کے نقطۂ نظر سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

" — ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی اثرات میں ہیں۔ اُن کو عربی اسلام سے اور اِس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ اُن کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں میں چاہتا ہوں کہ اِس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ ﷺ کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اُسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرامؓ کی زندگی سے کہاں تک اِن تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جن کا تصوف حامی ہے۔" (۱۰)

علامہ اقبال کے خط و کتابت میر خورشید احمد مرحوم سابق پولیٹیکل ایجنٹ سے بھی تھی۔ خط و کتابت کی تقریب علمی و ادبی موضوعات تھے۔ میر خورشید احمد بھی چونکہ رزیڈنسی سے وابستہ تھے اور خاں صاحب منشی سراج الدین کے ہم جلیس تھے اِس لیے وہ

اکثر منشی صاحب کے ساتھ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے — حضرت علامہ اپنے ایک خط میں میر خورشید احمد کو لکھتے ہیں:

" — ساقی نامہ و کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ افسوس ہے ہندوستان سے فارسی رخصت ہو گئی۔ سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہو گی۔ کیونکہ ایک زمانہ میں کشمیر ایران کا ہمسر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دُکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ دُکھڑے کی بنا بھی واقعات پر ہے جن کا میں نے کشمیر میں خود مشاہدہ کیا ہے۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع "کشامرۂ کشمیر" ہیں نہ کہ "کشامرۂ پنجاب"۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اُن کے لئے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آباؤ اجداد اہل خطہ میں سے ہیں۔" (۱۱)

علامہ اقبال کا اشارہ اِس ساقی نامہ کے بارے میں ہے جس کا شعر ہے

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد زسنگ مزارے

اور یہ شعر انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنے سفر کشمیر کے دوران نشاط باغ سری نگری بیٹھ کر لکھا تھا۔ میر خورشید احمد — پاکستان کے سابق وفاقی وزیر خورشید حسن میر کے والد ماجد تھے۔

"اسلام اور تصوف" کے موضوع کی طرح اقبال کے سیاسی عقیدہ کے بارے میں بھی بحث و مباحث ہوتے رہے ہیں۔ اِس سلسلہ میں آپ نے خواجہ غلام السدین ناظم تعلیمات جموں کشمیر کو بھی ایک خط لکھا جو اُن کے اعتقادی پوری طرح ترجمانی کرتا ہے۔

" — سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اِس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ "افیون" اِس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے اِن

تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اِس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اُٹھایا۔" (۱۲)

اِس خط کے اقتباس سے اقبالؒ کے سیاسی نظریہ اور عقیدہ کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ دین اسلام کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق پاتے تھے اور دین اسلام کی عملی افادیت و اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اِن کے نزدیک اسلام کو عملی صورت میں نہ لانے کی ساری ذمہ دار قومِ مسلم ہے۔ کیونکہ جب سے مسلمانوں نے دین کے عملی پہلوؤں کو فراموش کیا ہے، اِس وقت سے مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور اسلام کی اہمیت اغیار کے سامنے کم ہوئی۔ اِس سلسلہ میں ایک کشمیری نژاد مولوی سراج الدین پال مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

" — جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اِس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے — اِن کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین — اِس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اِس شکست کو جو اُن کو تنازع البقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ اُن کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا — " (۱۳) مولوی سراج الدین پال جسٹس (ر) ذکی الدین پال کے والد تھے۔

— یعنی اِن کے نزدیک بے عمل قوم کا انجام — موت ہے اور مسلمانوں کی پستی کی وجہ محض بے عملی اور دین اسلام سے دُوری ہے — علامہ اقبال کو دین اسلام سے بے پناہ عشق تھا اور اسے عصر جدید کے مسائل و معاملات کا حل سمجھتے تھے اور اُن کی یہ خواہش تھی کہ کوئی ایسا مفسر قرآن و حدیث آگے بڑھے جو دوسرے مذاہب اور نظریات کے مقابلے میں قانونِ فطرت کو انسانی رہنمائی کے لیے پیش کرے کیونکہ نسل انسانی کی رہبری و

رہنمائی کے لیے یہی دین مکمل اور اکمل ہے۔ اِس مسئلہ پر علامہ اقبال بے چین رہتے کبھی وہ سید سلیمان ندوی سے رجوع فرماتے، کبھی مولانا انور شاہ دیوبندی کی توجہ مبذول کراتے اور کبھی مولوی احمد دین صاحب کو لکھتے — پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

" — کیا اچھا ہو کہ وہ (مولوی احمد الدین صاحب) شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو —" (۱۴)

شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ دیوبندی سے تو اُن کی اِس موضوع پر خاصی گفت و شنید رہی۔ مولانا عبدالصمد صارم لکھتے ہیں:

" — ڈاکٹر اقبال مرحوم یہ سمجھتے تھے کہ تمام عالم اسلام میں اگر کوئی عالم فقہ جدید کو مرتب و مدون کر سکتا ہے تو وہ شاہ صاحب اور اقبال ہی کر سکتے ہیں۔"

ایک خط میں مولانا انور شاہ کشمیری کو لکھتے ہیں:

" — ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرماویں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔" (۱۵)

اِس سے علامہ اقبالؒ کی دین محمدؐ سے لگن اور عشق کا اندازہ ہوتا ہے اقبال مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کی وجہ بھی جانتے تھے۔ اِن کے نزدیک اِس تنزل اور پستی کی ایک وجہ اقتصادی پریشان حالی بھی تھی — خواجہ عبدالرحیم مرحوم کو ایک خط میں لکھا:

" — یہاں کے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری کی وجہ سے کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ فضل کرے۔ جس قسم کی قوت خدا تعالیٰ نے مجھے دی ہے۔ میں اِس قوت سے کام لے سکتا ہوں۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اخلاص و دیانت کے لوگ بہت دشمن ہیں۔" (۱۶)

علامہ اقبال کی شاعری کے مداح صرف برصغیر کے عوام ہی نہ تھے بلکہ غیر ملکی دانش ور بھی اُن کے کلام بلاغت نظام سے محظوظ ہوتے تھے اور بعض تو اُن کے کلام کا ترجمہ کرنا اپنے لیے باعث عزت گردانتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک صاحب علم مسٹر نیوٹ تھے جو سری نگر میں مقیم تھے اور کلامِ اقبال میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کے بارے میں حضرت علامہ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مصنف "کشمیر" کو لکھتے ہیں:

"میں نے مسٹر نیوٹ کو سرینگر کے پتہ پر لکھا ہے۔ آپ نے جو تجویز کی ہے مناسب ہے۔ میں بھی آپ کے تراجم دیکھ لیا کروں گا۔" (۱۷)

یہاں پر علامہ اقبال کا اشارہ اپنی اُن رباعیات کی طرف ہے جن کا مسٹر نیوٹ نے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

اُوپر علامہ اقبال کے کشمیر کے بارے میں نظری و فکری جذبات و احساسات کا بیان کیا گیا ہے۔ اب علامہ اقبال کے اُن خطوط کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا جو انہوں نے "تحریک آزادی کشمیر" کے بارے میں لکھے۔ چونکہ اقبال نے سیاسیاتِ کشمیر میں نہ صرف قلمی طور پر حصہ لیا بلکہ عملی طور پر بھی شرکت کی۔ اِس لیے بعض حضرات اُن کی سیاسیاتِ کشمیر میں شرکت کو اُن کے ایک سیاسی کارنامہ سے تعبیر کرتے تھے — جو کہ بالکل درست ہے اور ہمارے نزدیک علامہ محمد اقبال ہی تحریک کشمیر کے بانی ہیں — اِس سلسلہ میں حضرت علامہ کا ایک خط ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نام ہے اور ۲۲ ستمبر ۱۹۳۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

" — مجھے معلوم ہے اِس قسم کے دستاویزات آپ کے پاس ہیں لیکن اگر وہ پوشیدہ رہیں تو اُن کا کیا فائدہ ہے؟ مجھے آپ اُن کے اصل بھجوا دیجئے تو میں اُن سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی صورت نکالوں — بعد تصفیہ بعض اُمور کے جن کی تشریح اِس خط میں ضروری نہیں، وہ تمام کاغذات آپ کو واپس دے دوں گا۔" (۱۸)

یہ کاغذات قضیہ کشمیر سے متعلق تھے اِن ایام میں علامہ اقبال تحریک کشمیر کے سلسلہ میں عملی جدوجہد کر رہے تھے اور تحریک کے سیاسی قیدیوں کے مقدمات کی پیروی میں بھی مصروف تھے —

اِس ضمن میں انُھوں سیاسی اسیروں کی رہائی کے لیے پٹنہ کے مشہور ایڈووکیٹ سید نعیم الحق کو کئی خطوط لکھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"— کشمیر کے مسلمانوں کی امداد و اعانت آپ کا بڑا ہی کرم ہے۔... عبدالحمید صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ نے ذکر کیا تھا کہ پٹنہ کے عبدالعزیز صاحب مسلمانوں کی امداد کو ہر وقت تیار ہوں گے۔ آپ میری طرف سے اُن کی خدمت میں کشمیر کے بے بس مسلمانوں کی امداد کی درخواست کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے گا۔ آپ کے تار کا انتظار رہے گا۔" [۱۹] شیخ عبدالحمید وکیل مسلم کانفرنس کے لیڈر اور جسٹس (ر) عطاء اللہ سجاد کے خسر تھے۔

سید نعیم الحق ایڈووکیٹ کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"— جس مقدمے کی پیروی کے لیے میں نے آپ سے درخواست کی تھی اِس کی پیروی چودھری ظفر اللہ خان کریں گے۔ عبدالحمید صاحب نے مجھے یہ اطلاع دی ہے اور میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو ہر قسم کی زحمت سے بچانے کے لیے مجھے فی الفور آپ کو مطلع کرنا چاہیے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کیونکر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں؟ مجھے معلوم نہیں۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔ میں اِس تمام زحمت کے لیے جو آپ برداشت کر رہے ہین اور اِس تمام ایثار کے لیے جو آپ گوارا فرما رہے ہیں، بے حد ممنون ہوں۔" [۲۰]

"اقبال نامہ حصہ اول میں تین خط نامعلوم مکتوب الیہ کے نام ہیں... یہ خطوط سید نعیم الحق صاحب کا یہ خیال ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ اور شیخ عطاء اللہ صاحب مرتب اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اول کا یہ خیال ہے کہ یہ کسی اور بزرگ کے نام لکھے گئے ہیں اور اِسی سلسلہ میں جناب جگن ناتھ آزاد کا یہ کہنا ہے کہ "میں، اقبال نمائش کے انعقاد سے ذرا قبل، یہ تینوں خطوط لے کر شیخ محمد عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انُھوں نے تینوں خطوط کو پوری توجہ سے پڑھا اور چالیس سال قبل کے واقعات کو اپنے حافظے کی گہرائیوں میں ٹٹولتے ہوئے فرمایا:

"یہ خطوط میرے نام نہیں ہیں۔ میں اُس زمانے میں جیل میں تھا اور خطوط کے متن سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں خطوط ہم لوگوں کے مقدمہ سے ہی متعلق ہیں۔" [۲۱]

راقم نے تحقیق کے بعد پتہ لگایا ہے کہ یہ تینوں مکتوب کشمیر کے اِس وقت کے سیاسی رہنما مولوی محمد عبداللہ صاحب وکیل مرحوم کے نام ہیں جو اسیرانِ کشمیر کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ دوسرے وکیل اسد اللہ صاحب مرحوم تھے۔ دوسرے اور تیسرے خط میں علامہ محمد اقبال نے مکتوب الیہ کو "جناب مولوی صاحب" کے لقب سے خطاب کیا ہے۔

یہ تینوں خط مولوی محمد عبداللہ وکیل کے نام ہیں جن کا ابتدائی دور میں تعلق جماعت احمدیہ سے تھا اور یہ بعد میں فرقہ بہائی سے منسلک ہوئے۔ مختلف مذاہب و ادیان کی جستجو کرتے رہتے تھے۔ اُن کے فرزندوں میں خواجہ عبدالرحیم سابق سیشن جج، مولوی محمد ایوب صابر سیاسیات کشمیر سے وابستہ رہے ہیں۔ صابر صاحب کے اخبار کا نام "البرق" تھا۔ جبکہ خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے بیٹے پاکستان کے ممتاز ماہر قانون دان ڈاکٹر عبدالباسط اور داماد بریگیڈیئر ریٹائرڈ عبدالقیوم مرحوم سینٹر پاکستان سینٹ ہیں۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ شیخ عبدالحمید وکیل اِن دنوں صدر مسلم کانفرنس جموں تھے اور شیخ محمد عبداللہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر تھے اور اِن ایام میں پابند سلاسل تھے۔ اُن کے ہمراہ جیل میں چودھری غلام عباس۔ مستری، یعقوب علی، غلام نبی گلکار اور سردار گوہر رحمن خان لودھی تھے۔

اِن خطوط کے علاوہ ایک خط شیخ محمد عبداللہ کے نام بھی ہے جو ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا حضرت علامہ لکھتے ہیں:

"— جو مختلف جماعتیں سنا ہے کہ بن گئی ہیں اور اُن کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہو گا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اِس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اِس کے افراد اور بالخصوص علماء روں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہے بلکہ

اِس وقت ہیں۔ بہرحال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔"(۲۲)

سیاسیات کشمیر کے بارے میں حضرت علامہ نے مولانا علم الدین سالک سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اور مرزا یعقوب بیگ کو بھی خطوط لکھے — پروفیسر علم الدین سالک کا تعلق گو ریاست سے نہ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ ریاستی عوام کی سیاسی بیداری میں اُن کا بہت حصہ ہے۔ اُنہوں نے ۱۹۲۲ء ہی سے جموں اور سرینگر جانا شروع کر دیا تھا اور دینی، علمی اور ادبی مجالس منعقد کر کے کشمیریوں کے سیاسی شعور کو جلا بخشی۔ علم الدین سالک کی کشمیر سے دلچسپی ہی کی بنا پر حضرت علامہ نے اُنہیں لکھا:

" — وہ مسودہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں اِس کا منتظر ہوں تاکہ ڈیپوٹیشن جانے سے پہلے اِس کی اشاعت ہو جائے۔"(۲۳)

علامہ محمد اقبال، علم الدین سالک مرحوم کو "اعزازی کشمیری" کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ڈیپوٹیشن نے اربابِ اختیار سے کشمیر کے معاملات و مسائل کے بارے میں ہی ملنا تھا اور علامہ یہ چاہتے تھے کہ وہ اِس مسودہ کو دیکھ لیں جو پیش کیا جانا تھا۔

مرزا یعقوب بیگ کا تعلق احمدیہ جماعت سے تھا۔ اِس وقت علامہ کے جماعت احمدیہ سے اختلافات شدت اختیار کر گئے تھے اور اِس بنا پر اُنہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود تھے، استعفیٰ دے دیا تھا۔ جماعت احمدیہ کسی مسئلے پر حضرت علامہ سے یکطرفہ فیصلہ کرانا چاہتی تھی اور مرزا یعقوب بیگ اپنی جماعت کی ہدایات کے مطابق اِس کام کے لیے مستعد تھے۔ اُنہی دنوں مجلس احرارِ اسلام اور جماعت احمدیہ میں ٹھن گئی تھی۔ علامہ اقبال خود کو مرزائیت سے منسوب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اِس پس منظر میں حضرت علامہ کا مرزا یعقوب بیگ کے نام خط دلچسپ بھی ہے اور پُر معنی بھی۔ لکھتے ہیں:

" — ممبران لاہور سے باہر گئے تھے۔ دونوں سیکرٹری بھی باہر گئے ہیں۔ رحیم بخش صاحب بھی یہاں نہیں ہیں۔ میں اپنی ذمہ داری پر کوئی جواب نہیں لکھنا چاہتا۔ ہاں ذاتی رائے رکھتا ہوں جس کے بیان کرنے کا موقعہ ابھی نہیں آیا۔"(۲۴)

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی کونسل میٹنگ

سے مرزا یعقوب بیگ کو عقیدہ کی بنا پر ہی نکال دیا تھا جس کا مرزا یعقوب بیگ کو صدمہ ہوا تھا۔

حضرت علامہ اقبال کو کشمیر کے سیاسی قیدیوں کے مقدمات کی ازحد فکر دامن گیر رہتی تھی۔ وہ ہر لحظہ اُن کی مدد و اعانت کے لیے کوشاں رہتے تھے اور جہاں کہیں بھی روشنی کی کرن نظر آتی، وہاں لپکتے تاکہ کشمیریوں کی امداد جاری رہے۔ اپنے ایک خط میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم لکھتے ہیں:

"— مظلومین کشمیر کی امداد کے لیے آپ سے درخواست کرنے کے لیے یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ اِس وقت حکومت کی طرف سے اُن پر متعدد مقدمات چل رہے ہیں جن کے اخراجات کی وجہ سے فنڈز کی نہایت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔"(۴۵)

دوسری طرف وہ فنڈز کے بارے میں بے حد محتاط بھی تھے اور مقدمات کے مصارف سے آگاہ بھی۔ مولوی محمد عبداللہ کو لکھتے ہیں:

"— کشمیر کمیٹی کے پاس زیادہ فنڈز نہیں ہے ورنہ میں خود سید صاحب کی خدمت میں پیش کرتا۔ اِس واسطے مہربانی کر کے اُن کی خدمت میں عرض کریں کہ اگر آپ بلا کسی قسم کے معاوضہ اور خرچ کے یہ خدمت کریں تو اللہ کے نزدیک اجر جزیل کے مستحق ہوں گے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی اور صورت میں اِس کا اجر مل جائے گا۔"(۴۶)

علامہ محمد اقبال کی یہ تحریر آج کے کشمیر کے حالات پر بھی صادق آتی ہے۔

حواشی

۱۔ اے انوار اقبال ص۔ ۷۶
۲۔ ایضاً ص ۷۶۔۷۷
۳۔ انوار اقبال ص۔ ۷۵
۴۔ انوار اقبال ص۔ ۵۹۔۶۰
۵۔ مکاتیب اقبال ص۔ ۱۲۲
۶۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری بنام کلیم اختر
۷۔ مکاتیب اقبال ص۔ ۱۲۶
۸۔ اقبالنامہ ۱: ۲۳
۹۔ اقبالنامہ ۱: ۱۶۔۱۷
۱۰۔ اقبالنامہ ۱: ۲۴
۱۱۔ انوار اقبال ص۔۱۵۱۔ ۱۵۲
۱۲۔ اقبالنامہ ۱: ۳۱۸۔۳۱۹
۱۳۔ اقبالنامہ ۱: ۴۴۔۴۵
۱۴۔ اقبالنامہ ۱: ۴۸
۱۵۔ اقبالنامہ ۲: ۲۵۷
۱۶۔ انوار اقبال ص۔ ۲۳۶
۱۷۔ اقبالنامہ ۱: ۳۰۱
۱۸۔ اقبالنامہ ۲: ۲۴۳
۱۹۔ اقبالنامہ ۱: ۴۲۹۔۴۳۱
۲۰۔ اقبالنامہ ۱: ۴۲۵۔۴۳۹
۲۱۔ اقبال ۸۳ء ۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت ص ۱۲۶
۲۲۔ اقبالنامہ : ۳۹۶۔۳۹۷
۲۳۔ انوار اقبال ص ۲۱۱
۲۴۔ انوار اقبال ص ۲۱۲
۲۵۔ انوار اقبال ص ۲۱۳
۲۶۔ اقبالنامہ ۱: ۴۲۴۔۴۳۱

علامہ محمد اقبالؒ اور شیخ محمد عبداللہ

علامہ محمد اقبالؒ کا خطہ کشمیر سے گہرا تعلق تھا اور اس حوالہ سے تازیست کشمیر اور اہل کشمیر کے حالات و معاملات سے واقف اور وابستہ رہے۔ شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں:

"لاہور میں اپنے زمانۂ قیام میں، میں نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شہرت بھی سنی، ان کے کلام سے میں پہلے ہی آشنا ہو چکا تھا اور کئی نظمیں تو مجھے ازبر تھیں۔ میں نے لاہور میں کئی کشمیری دوستوں سے سنا کہ علامہ کشمیر کے معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور کشمیری مسلمانوں کی حالت زار سے وہ شدید ذہنی اور روحانی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ میں نے علامہ کو پہلی بار انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں دیکھا جہاں انہوں نے اپنی نظم بڑے اثر آفریں لحن میں سنائی۔ ان کے کلام کا مفہوم اور پھر ان کی آواز کا جادو۔ میرا وجود موم کی شمع کی طرح ٹپ ٹپ پگھلنے لگا اور میں تاثیر کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا اِس وقت مجھے ایک موہوم سا اندازہ ہوا کہ میٹھا لحن کس طرح سوئے ہوئے دلوں کو صور اسرافیل کی طرح بیدار کر سکتا ہے اور کس طرح پتھروں کو موم بنا سکتا ہے۔

اِس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے گلے کو بھی خدائے لایزال نے اپنی نعمت بے پایاں کے ایک قطرے سے سرشار کر دیا ہے اور اِس کی آواز ایک دن کشمیر کے دشت و جبل میں گونج کر اِس کے ماتھے پر جمی ہوئی غلامی اور فلاکت کی برف کو پگھلانے میں کارگر ثابت ہو گی۔ بعد میں کچھ دوستوں کے ساتھ علامہ کے حضور بھی حاضری دینے لگا لیکن ہم سب اِن کی کوہ وقار شخصیت سے اِس قدر متاثر تھے کہ بہت دنوں تک صرف سنتے رہے اور اپنی طرف سے مجال سخن نہ لا سکے لیکن آہستہ آہستہ خود علامہ کے الفاظ میں ہی ہماری بے

تکلفی بڑھنے لگی۔ ع کرتے ہیں خطاب آخر، اُٹھتے ہیں حجاب آخر (۱)

برصغیر میں کشمیریوں کی اولیں تنظیموں کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں۔

ریاست سے ہجرت کرنے والے کچھ درد مند مسلمانوں نے اِس صدی کے آغاز میں کشمیری کانفرنس کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی۔ اِس جماعت کے بانیوں میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی شامل تھے اور اِسی کے ایک اجلاس میں اُنھوں نے یہ ولولہ انگیز قطعہ پڑھا تھا۔

پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اِس دست جفاکیش کو یا رب جس نے
راہ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا (۲)

تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے کشمیری لیڈروں نے آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ اِس کے اجلاس میں شرکت کے لئے علامہ محمد اقبال کو بھی دعوت دی۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں:

"اجلاس میں شرکت کے لئے ہم نے کشمیریوں کے مربی، محسن اور کشمیریوں کی حالت زار پر آنسو بہانے والے عظیم شاعر حضرت علامہ اقبال کو بھی دعوت دی تھی۔ دعوت کا جواب دیتے ہوئے اُنھوں نے میرے نام جو خط لکھا تھا اِس کا عکس کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ البتہ اُنھوں نے اِس خط میں ایک ماہر نباض کی طرح ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا اور کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے آپس کے اختلاف حل نہ کرلیں، اِس وقت تک کامیابی حاصل کرنا مشکل ہو گی۔"

... شیخ محمد عبداللہ نے علامہ محمد اقبال کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہے۔

لاہور ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء

ڈیئر شیخ عبداللہ صاحب۔ السلام علیکم آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کشمیر کے اخبار پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزرگان کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ اِس بات کے لئے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں اور یقین رکھتا ہوں

کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بار آور کرے گا۔ لیکن جو مختلف جماعتیں سنا ہے کہ بن گئی ہیں اور اُن کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہو گا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اِس وجہ سے بگڑے، رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اِس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہے بلکہ اِس وقت ہیں۔ بہرحال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔ افسوس میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

محمد اقبال لاہور (۳)

علامہ محمد اقبال ۱۹۳۱ء کے بعد پھر کشمیر نہ جا سکے۔ ۱۹۳۲ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی لیکن وہ مصروفیات کی بناء پر شامل نہ ہو سکے اور خط کے ذریعے شیخ محمد عبداللہ سے معذرت کر لی۔

جب ۲۴ اکتوبر کو آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی تو اِس کے پہلے صدر شیخ محمد عبداللہ اور سیکرٹری جنرل چودھری غلام عباس منتخب ہوئے۔

شیخ صاحب نے حضرت علامہ کو اِن کی وفات سے چند ماہ قبل پھر دعوت دی تھی وہ اِس بارے میں لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال سے اُن کی وفات سے چند ہی ماہ قبل میری ملاقات ہوئی... مجھے ساری عمر قلق رہا کہ علامہ نے میری درخواست پر کشمیر آنا مان لیا تھا لیکن پہلے تو ڈوگرہ حکومت نے اُن کی راہ میں مشکلات پیدا کیں اور بعد میں موت کا بے رحم ہاتھ اُن کی راہ میں ہمیشہ کے لئے حائل ہو گیا۔" (۴)

شیخ عبداللہ بہ تکرار حضرت علامہ سے استفادے کا تذکرہ کرتے ہیں اور اپنے وجود کو اقبال کی قلندرانہ آہ سحرگاہی کا ثمر گردانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"میری دانست میں اُن کے آنسوؤں کے تخم اور آہوں کی تمازت سے ہی وہ شرارہ پھوٹا جو میری حقیر ذات کی صورت میں تحریک کا علامتی چراغ بن گیا (۵)

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء اور اِس کے بعد علامہ محمد اقبال کشمیریوں کی تحریک اور

سیادت کا مرکز بن چکے تھے اور ہر جماعت تائید ان کے پاس آتا تھا جن میں ذاتی اغراض بھی ہوتی تھی۔ اِس سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں:

"اُن دنوں کی بات ہے کہ لاہور کے اخبارات تحریک کشمیر کے واقعات کو خوب اُچھال رہے تھے۔ میرواعظ احمد اللہ ہمدانی ایک وجیہہ شخصیت کے مرد بزرگ تھے اور جلاوطنی کی صعوبت نے اُن کے اردگرد ایک ہالہ سا بنا دیا تھا۔ لوگ اُن کے پاس عقیدت سے آتے اور پرسش احوال کرتے۔ ایک دن انہیں علامہ اقبال سے گفتگو کرنے کا خیال آیا۔ میں حضرت علامہ کے پاس جاتا ہی رہتا تھا۔ میں نے اُن سے وقت لیا اور مولانا صاحب کو ساتھ لے کر حضرت علامہ کے دولت کدہ پر پہنچ گیا۔ علامہ موصوف نے سروقد ہو کر مولانا کی تعظیم کی اور اُن کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے۔ مولانا صاحب نے اپنا دکھڑا سنانا شروع کیا تو علامہ موصوف کے باطن کا شاعر بیدار ہو گیا۔ اُنہوں نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا۔ کتنا بہتر ہوتا اگر آپ جلاوطنی کو قبول کرنے کی بجائے سرزمین کشمیر پر ہی ڈٹ جاتے اور اپنے سینے پر زخم کھا کر شہید ہو جاتے۔ اُس کا فائدہ یہ ہوتا کہ جن مصائب کی داستان آپ یہاں سنا رہے ہیں اُن میں کمی ہو جاتی کیونکہ بزرگوں کی قربانی نجات کا باعث ہوتی ہے۔

"میرواعظ صاحب سے تو کچھ جواب نہ بن پڑا۔ لیکن اُن کے چہرے پر ملال کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جب ہم علامہ سے رخصت ہو کر نکلے تو مولانا نے دل کی بھڑاس علامہ موصوف کو جلی کٹی سنانے سے نکالی۔ کہنے لگے خود تو بے روزہ ہیں۔ چارپائی پر بیٹھے ٹھاٹھ سے حقہ پی رہے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ سینے پر گولی کیوں نہ کھائی۔ کوئی اپنا ہوتا تو پھر دیکھتا یہ مشورہ کیسے دیتے؟ مولانا کی اِس افروختگی پر میرے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ لیکن میں نے اِن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا کہ ایسی باتوں پر غصہ کرنا آپ کے شایان نہیں۔" (۶)

تعلقات کے حوالے سے ممکن ہے کہ کبھی کبھار شیخ صاحب اور اُن کے ساتھی بھی حضرت علامہ سے سفارش کے خواہشمند ہوتے

اِس سلسلہ میں مولانا محمد علم الدین سالک ایک واقعہ کے راوی ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی کے صدر تھے اِنہیں شیخ عبداللہ اور اُن کے

ساتھیوں کے خطوط موصول ہوئے۔ آپ انہیں پڑھتے اور آتشدان پر پھینک دیتے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب تشریف لائے اور گلہ کیا "آپ جواب نہیں دیتے"

علامہ فرمانے لگے۔

"یہ تمہارے خط پڑے ہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ میں کشمیر کا کام کرتا ہوں اور یہ کام مجھے جان سے عزیز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ذاتی مفاد کے لئے ٹکے ٹکے کے لوگوں کے پاس جاؤں۔" (۷)

اب ایک اہم مسئلہ سامنے آتا ہے کہ وہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

"یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ میں اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کشمیر کی سیاست کے متعلق تبادلہ خیالات ہو رہا تھا تو اُنہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا آپ غیر مسلموں کو بھی اپنی تحریک میں شامل کیجئے اس سے آپ کے کاز کو تقویت ملے گی۔ میں نے کہا ہم کوشش تو کرتے ہیں لیکن غیر مسلم ساتھ نہیں دیتے تو اقبال نے جواب دیا آپ اپنی کوششیں جاری رکھئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کے لئے جہاں اور بھی کئی وجوہ اور محرکات تھے وہاں اقبال کے مشورے کا بھی اس میں بڑا عمل دخل تھا۔ (۸)

... حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے نیشنل کانفرنس بنانے کا ارادہ بہت پہلے کر لیا تھا اور اس سلسلہ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ علامہ محمد اقبال کو خواہ مخواہ اس میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

"آتش چنار" میں شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں:

"...۱۹۳۷ء کے آس پاس ہی میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے لاہور کے ریلوے سٹیشن پر ہوئی۔ ان دنوں میں اور بخشی غلام محمد لاہور میں تھے۔ نہرو پنجاب پردیش کانگرس کے صدر میاں افتخار الدین کے مہمان تھے۔ ہم نے پنڈت جی سے ملاقات کے لئے میاں صاحب کی رہائش گاہ پر فون کیا اور وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ صوبہ سرحد کے دورہ پر جانے کے لئے ریلوے سٹیشن جانے والے ہیں۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم ملاقات کے لئے ادھر ہی پہنچ جائیں۔ چنانچہ ہم دونوں ریلوے سٹیشن پہنچے۔ پنڈت جی اپنی سرخ و

سپید رنگت اور چہرے بشرے سے کشمیری خدوخال کا دلکش پیکر لگ رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور ریل کے ڈبے میں ہی اِس طرح محو گفتگو جیسے ہم برسوں کے دوست ہوں۔ اتنے میں ٹرین چل دی۔ گفتگو اِس قدر دلچسپ تھی کہ ہمیں اُٹھنے کا خیال ہی نہیں آیا اور ہم شاہدرہ تک اِن سے باتیں کرتے چلے گئے۔ وہاں بخشی غلام محمد تو اجازت لے کر رخصت ہو گئے مگر پنڈت جی مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں اِن کے ساتھ صوبہ سرحد چلا آؤں اِن کے اصرار میں اتنی اپنائیت تپاک اور گرمی تھی کہ میں یوں ہی چلنے پر آمادہ ہو گیا تاکہ پنڈت جی سے تبادلہ خیال کا تفصیلی موقع بھی ملے۔ میں نے صوبہ سرحد میں اِن کے ساتھ کئی روز گزارے اور اِن کی دلکش شخصیت کو قریب سے دیکھا بھالا۔ اُن کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت تھی جس پر خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔ اِس دورے میں بادشاہ خان سے تو دائمی دوستی کے اِس رشتے کی بنیاد پڑی جو زمانے کے زیروبم کے باوجود آج تک قائم اور سرسبز ہے۔ پنڈت جی سے گفتگو کے دوران مجھے یہ دریافت کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ وہ ہماری تحریک کے ساتھ صرف ایک ممتاز سیاسی قائد کی حیثیت سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ایک کشمیری سپوت کی حیثیت سے اپنے وطن مالوف کی تقدیر بدلنے کی کوششوں سے خوب لَو لگائے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں مادرِ کشمیر کے ایک فرزند کی حیثیت سے خود اِس بات کا بڑا شوق تھا کہ وہ مجھ سے ملیں جو اُن کے الفاظ میں سوئی ہوئی کشمیر قوم کو جگا رہا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے تحریک کے متعلق بہتیرے سوالات پوچھے میں نے بساط بھر انہیں تحریک کے پس منظر سے واقف کرایا اور اِن پر واضح کیا کہ یہ تحریک کسی صورت میں فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تحریک اِسی وقت تک مسلم کانفرنس کے نام سے جاری ہے۔ لیکن اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ باوجود کوشش کے غیر مسلموں نے ہمارے ساتھ اشتراک کرنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پنڈت جی نے مشورہ دیا کہ ہمیں تنظیم کے دروازے ریاست کے ہر باشندے کے لئے بلالحاظ مذہب و ملت کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ غیر مسلموں میں بھی جسے اِس تحریک کا ساتھ دینے کی توفیق ہو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر ایسا کر سکے۔ اِس کا فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ہندو فرقہ پرست پریس اور جماعتوں کو تحریک پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے کے لئے کوئی دلیل نہ مل سکے گی۔ رخصت ہونے سے قبل میں نے اِن کو اور بادشاہ خان کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ دونوں رہنماؤں نے خندہ پیشانی کے

ساتھ قبول کیا۔ کچھ ہی عرصے بعد ہندوستان میں اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں قائم ہوئی جس کا مقصد راجواڑوں کی عملداری کے تحت ریاستوں کے عوام کے حقوق کے لئے تحریک چلانا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر مسلم کانفرنس کے زعما تحریک حریت کشمیر کی ہندوستان کے قوم پرستوں سے حمایت چاہتے ہیں تو انہیں اپنے نظریات میں وسعت پیدا کرنا ہوگی اور جماعت کے نام اور اس کے دستور میں تبدیلی لانا ہوگی۔ حسن اتفاق سمجھ لیجئے یا مشیت ایزدی کہ کشمیر کے دوسرے عظیم فرزند اور تحریک حریت کشمیر کے دعاگو اور مربی علامہ سر محمد اقبال نے ۳۷ء میں مجھے کچھ اسی قسم کا مشورہ دیا۔ وہ ان دنوں علیل تھے میں نے انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی۔ ان کے کشمیر میں داخلے پر ۳۱ء سے پابندی تھی۔ اس پابندی کو واپس لینے کی درخواست کی گئی لیکن مہاراجہ کی حکومت نے اکتوبر تک انہیں کشمیر آنے کا اجازت نامہ نہیں دیا اور جب اجازت نامہ آیا تو سردی کا زمانہ آ گیا تھا۔ اور اقبال نے دوسرے سال کے لیے اپنا دورہ کشمیر ملتوی کر دیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے سال وہ جنت ارضی کے بدلے جنت فردوس کی سیاحت کے لئے بلا لئے جائیں گے۔ جب میں ان سے رخصت ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں اور مسلم کانفرنس کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیئے جائیں۔ صرف یہی صورت کشمیر کے لئے آزادی حاصل کرنے کی ہوگی ورنہ آپس کے اختلافات کو غرض مند اور مفاد خصوصی رکھنے والے دوست اچھالتے رہیں گے۔ مسلم کانفرنس میں قومی تنظیم کا بیج پہلے ہی مضمر تھا۔ اب اس کا پیرہن بدل کر اسے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی گھڑی بھی آن پہنچی تھی اور کسی شاعر کے الفاظ میں ہر طرف یہ احساس عام ہو رہا تھا۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگ ہائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے

اس سلسلہ میں چودھری غلام عباس جو مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے میں پیش پیش تھے اپنی سوانح حیات "کشمکش" میں یہ لکھتے ہیں۔

"...اپریل ۱۹۳۷ء میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس جموں میں منعقد ہوا جس کے منتخب صدر شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اجلاس سے چند یوم قبل شیخ صاحب نے خان عبدالغفار

خان اور پنڈت جواہر لال نہرو سے پہلی دفعہ ملاقات کی جب وہ جموں پہنچے تو اِن کے تیور بدلے ہوئے تھے اور سرحد سے نیشنلزم کا اتنا تند و تیز جام چڑھا کر آگئے تھے کہ اِس کا نشہ کبھی اُتر ہی نہ سکا۔ آتے ہی اُنھوں نے میرے ساتھ بند کمرہ میں نیشنلزم کے متعلق گفتگو شروع کردی اِس کے جواز اور عدم جواز کے بارہ میں پہلے تو نرمی سے بحث ہوتی رہی لیکن مجھے افسوس ہوا کہ اب یہ معاملہ بحث و تمحیص اور قومی نفع و نقصان کی سرحدیں پھاند چکا تھا۔ ۹؎

چودھری غلام عباس نے اس سارے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے اور کہیں بھی نہیں لکھا کہ شیخ صاحب نے کہا ہے کہ انہیں علامہ محمد اقبال نے بھی یہ مشورہ دیا ہے۔ حالانکہ چودھری غلام عباس نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جو دراصل ۱۹۳۶ء ہے قائداعظم نے جب وہ بقول چودھری غلام عباس:

"۱۹۳۵ء میں حضرت قائداعظم سرینگر تشریف لائے تھے مسلم کانفرنس کی جانب سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت صدر میں ہی تھا۔ ابھی شیخ عبداللہ اور ہم اکٹھے ہی تھے۔ سپاسنامہ کے جواب میں حضرت قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیف قلوب کریں بلکہ ان کو سیاسی گاڑی کا ایک پہیہ سمجھ کر ساتھ چلائیں۔"

لیکن اِن کی ساری سوانح حیات میں کہیں بھی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ علامہ محمد اقبال نے کشمیری لیڈروں کو ایسا کوئی مشورہ دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اپریل ۱۹۳۷ء سے لے کر اپریل ۱۹۳۸ء تک شیخ محمد عبداللہ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کی جرات نہ کر سکے۔ جونہی اپریل ۱۹۳۸ء میں علامہ محمد اقبال کی وفات ہوئی تو جولائی ۱۹۳۸ء میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا گیا اور ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل دیا گیا۔ چودھری غلام عباس کہتے ہیں کہ نیشنل ازم کے حق میں شیخ عبداللہ کی دو دلیلیں تھیں ایک یہ کہ بقول اِن کے گوپال سوامی آئنگر نے اِن کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر ریاست میں نیشنلسٹوں کا برائے نام ڈھانچہ قائم ہو جائے تو حکومت اصلاحات کے سلسلہ میں ایک

انقلاب انگیز قدم اٹھانے کے لئے تیار ہوگی اور کم از کم دو عوامی منسٹر حکومت میں شامل کر لئے جائیں گے۔ دوم یہ کہ میرے ساتھ اب چند غیر مسلم سیاسی کارکن شامل ہو کر قومی کا کرنا چاہتے ہیں۔ میں اب اِن کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں۔

چونکہ خود چودھری غلام عباس اِس سارے عمل میں شامل تھے اِس لئے "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا" لہٰذا علامہ محمد اقبال کا اِس خیال میں شامل کرنا بعد کا خیال ہے جیسا کہ ممتاز کشمیری لیڈر مولانا محمد سعید مسعودی اول سیکرٹری جنرل آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سے یہ سوال پوچھا گیا:

"... شیخ صاحب نے کئی بار بیان فرمایا ہے کہ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی تجویز کو علامہ اقبال کی حمایت بھی حاصل تھی اور علامہ نے اِنہیں نیشنل کانفرنس بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ آپ علامہ اقبال کے پاس جاتے رہتے تھے آپ کو اِس بارے کیا معلوم ہے؟

تو اِس کے جواب میں اُنہوں نے یہ کہا:

"... میں ۳۴ء کے فروری مارچ میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اِن دنوں مسلم کانفرنس نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ شیخ صاحب کا بیان بعد کے واقعات سے متعلق ہو گا یعنی ۳۷ء اور ۳۸ء کے اوائل کا... کیونکہ علامہ اقبال اِسی سال وفات پا گئے۔ بہرحال مجھے اِس سلسلہ میں براہ راست کوئی واقفیت نہیں ہے۔" [۱۰]

یہ بیان اِس شخص کا ہے جس نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کی تجویز ہاؤس کے سامنے پیش کی تھی اور جو بننے والی نئی جماعت کا پہلا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دور کے کسی اخبار جریدہ۔ یا بیان میں کہیں بھی یہ اشارا نہیں ملتا کہ ریاست میں جماعت کو "متحدہ قومیت میں بدلنے کا مشورہ علامہ اقبال نے بھی دیا تھا۔ یہ سب باتیں اِن کی وفات کے بعد، عوام میں نیشنل کانفرنس کو مقبول بنانے کے لئے خود شیخ صاحب نے کہیں جن کا دوسرا راوی کوئی نہیں ہے۔

شیخ صاحب حضرت علامہ کو کشمیر کے اِن اولین محسنوں میں شمار کرتے ہیں جن کے قلم کا احسان کشمیریوں پر ہمیشہ رہے گا۔ اِن کے نزدیک علامہ نے اس وقت کشمیر اور

کشمیریوں کی سربلندی کے خواب دیکھے جب "ہم میں سے اکثر ابھی ماں کی کوکھ میں لوریاں سن رہے تھے۔" حضرت علامہ سے اسی عقیدت و محبت کے اور اعتراف کے طور پر شیخ صاحب کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں حکومت کشمیر نے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم کی اور بعض دوسری چیزوں کو اقبال سے منسوب کیا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں:

"ہم نے ان کی یاد میں دو سال قبل کشمیر یونیورسٹی میں دنیا کی پہلی مسند اقبال قائم کی ہے جس کے اولین ڈائریکٹر مشہور اقبال شناس پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہوئے ہیں... ہماری اقبال چیئر اب اقبال انسٹی ٹیوٹ بن گئی ہے۔ کشمیر یونیورسٹی لائبریری کا نام بھی ہم نے اقبال لائبریری رکھا ہے جس میں مشہور مصور ایم۔ ایف۔ حسین کی بنائی ہوئی اقبال کی ایک نادر تصویر بھی آویزاں ہے۔ نیز ہم نے اقبال کے نام سے ایک خوبصورت باغ کا بھی انتساب کیا ہے۔ یہ پہلے حضوری باغ کہلاتا تھا اور اب اقبال پارک۔" (۱۱)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مرتبہ مجموعہ مقالات "اقبال کا فن" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ اقبالیات کی جانب بھی پوری توجہ دی جا رہی ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑی کمی کی تلافی ہے جو آج ملک کے اکثر و بیشتر ادارے جن میں جامعہ بھی شامل ہے، کر رہے ہیں۔ یہاں میں اپنی اس خلش دل کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض نقادانِ فن اقبال پر قلم اٹھا کر اقبال اور برصغیر ہندو پاکستان کے ساتھ بے انصافی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اقبال کیا تھے اور اُن کا پیغام کیا تھا یہ تو شاید چند لفظوں میں بیان نہ ہو سکے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کو جب ہم چشم حقیقت نگر سے اِن کی نظم و نثر کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو اکثر و بیشتر غیر صحت مند نظریات سے، جو اُن کے کلام کے ساتھ وابستہ کر دیئے گئے ہیں، اِن کا قطعی کوئی تعلق نہیں آتا۔ اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

تقسیم ہند کے بعد جہاں پاکستان نے اقبال کو اپنا ملی ہیرو قرار دیا وہاں

ہندوستان نے ایک طرح اقبال سے بے اعتنائی برتی۔ یہ بے اعتنائی اُنہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی جو بعض پرستاران اقبال نے اقبال کے بارے میں پیدا کی ہیں اور ابھی تک جن کا سلسلہ جاری ہے۔ ابھی چند سطور قبل اسی بے اعتنائی کو میں نے کمی یا کوتاہی کہا ہے اور مقامِ مسرت ہے کہ اِس کوتاہی کا سلسلہ ملک بھر میں سنجیدگی سے شروع ہو چکا ہے۔

اقبال کو ساری دُنیا ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ وہ اپنے آہنگ، اپنے لب و لہجہ اور اپنی آواز کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اُن کے عقیدت مند اور نکتہ چیں دونوں ہی اِس بات پر متفق ہیں کہ اقبال اپنے فن اور اپنی فکر کے اعتبار سے ایک عہد آفریں شاعر اور مفکر تھے۔ اُن کی عزت، عظمت اور شہرت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں ساری دنیا کی میراث ہے۔ وہ تمام عالم انسانیت کے شاعر، ہمدرد اور بہی خواہ تھے اور اِس لئے اُن کی شاعری اور شخصیت کو جغرافیائی حدود میں محبوس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ساری دنیا کی میراث ہیں اور اِن پر ساری دنیا کا حق ہے لیکن مجھے اِس خود غرضی کے لئے معاف کیجئے کہ میں اُن کی شاعری اور فلسفے پر ساری دُنیا کا حق تسلیم کرنے کے باوجود اُن کی ذات پر کشمیر کے حق کو فائق، اول اور افضل سمجھتا ہوں۔ صرف اِس لئے نہیں کہ علامہ اقبال کے آباو اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا اور اُنہوں نے اپنے کشمیری نژاد ہونے پر فخر کیا ہے بلکہ اِس لئے کہ وہ کشمیر کے سچے عاشق اہل کشمیر کے سچے دوست اور ہمدرد، اُن کی آزادی کے بہت بڑے علمبردار، اُن کی غریبی اور غلامی کے ماتم گسار اور مطلق العنانیت کے خلاف ہماری جدوجہد میں ہمارے شریک کار تھے اور مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ ہندوستان بھر میں اقبال کو پھر سے اپنا جائز مقام دلوانے کے لئے بھی پہلی کوشش کشمیر ہی سے شروع ہوئی۔ خواہ وہ علامہ اقبال کے متعلق توسیعی لیکچروں کی صورت میں ہوئی ہو یا اقبال نمائش کی صورت میں، اور پھر کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے قیام کے سلسلے میں بھی کشمیر اِس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اِسے اِس ضمن میں بھی

اولیت کا شرف حاصل ہے۔[۲]

آگے چل کر اقبال اور کشمیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک کشمیر کے مسائل سے دلچسپی لیتے رہے اور اگر اُن کی صحت نے اجازت دی ہوتی تو وہ یہاں آ کر کئی مہینے قیام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اِن کی شاعری میں ساری دنیا کا دُکھ درد سمٹ آیا تھا لیکن کشمیر کی تباہی اور اہلِ کشمیر کی بے عملی اُنھیں خاص طور سے بے چین اور بے قرار رکھتی تھیں:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامہ تار تارے
ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

یہ اُسی مردِ مومن کی دعاؤں کا اعجاز تھا کہ ۱۹۳۱ء میں یہ بے دست و پا قوم مطلق العنانیت اور استبداد کی آہنی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرانے پر آمادہ ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آزادی کی شمع شہیدوں کے لہو سے کچھ اس طرح روشن ہونے لگی کہ صدیوں کا اندھیرا چھٹ گیا۔ اور ہم نے ۱۹۴۶ء میں اُس رسوائے زمانہ بیع نامہ امرتسر کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو چیلنج کیا جس پر کشمیر کے عاشق اور مدح خواں اقبال نے ۱۹۳۰ء میں یہ کہہ کے احتجاج کیا تھا:

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی
حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

میں اِس امر کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے اقبال کی شخصیت اور شاعری میں کشمیر سے اُن کے والہانہ عشق پر کچھ زیادہ توجہ صرف کی ہے لیکن مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۷۳ء میں اقبال نمائش سری نگر میں منعقد کی گئی تھی تو اس کے افتتاحیہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کچھ اس قسم کے الفاظ کہے تھے۔ "اس نمائش کے منتظمین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اقبال کی زندگی سے متعلق اتنا قیمتی مواد جمع کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس نمائش میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا اور اقبال کی زندگی، اِن کی شخصیت اور اِن کے فن کے ہر گوشے کی اِس نمائندگی ہو گی۔ اقبال کو پاکستان اور صرف مسلمانوں کا شاعر کہہ کر اقبال کے عقیدت مندوں اور اِن کے مخالفوں نے اِن کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اِس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ ہندوستان بھر میں اقبال صدی کی تقریبات منانے کا سلسلہ غالباً اِس کفارے کی پہلی قسط ہے، اور خداوند کریم کا شکر ہے کہ آج میرے اِس خواب کی تعبیر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

اقبال اور کشمیر کے باہمی تعلق کا ذکر کسی حد تک میں نے سطورِ بالا کیا ہے اور یہ بات وضاحت سے کہی ہے کہ تحریک آزادیِ کشمیر کے دنوں میں اقبال کی رہنمائی ہم لوگوں کو قدم قدم پر حاصل تھی۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے متعدد خطوط مجھے لکھے۔ افسوس کہ تحریک حریت کشمیر کے زمانے میں جب پولیس نے میرے گھر پر چھاپے مارے تو یہ تمام خطوط دوسرے اہم کاغذوں کے ساتھ پولیس اُٹھا کر لے گئی۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ اِن نادر خطوط میں سے صرف ایک خط محفوظ رہ گیا۔ یہ خط جو اقبال مرحوم نے مجھے ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لکھا۔ اقبال کے خطوط کا ذکر آ گیا ہے تو ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شیخ عطاء اللہ نے اپنی کتاب "اقبال نامہ" میں علامہ اقبال کے تین خطوط شائع کئے ہیں جن میں سے ایک پر ۳ ستمبر ۱۹۳۲ء کی تاریخ درج ہے دوسرے پر یکم ستمبر ۱۹۳۳ء کی اور تیسرا بغیر تاریخ درج ہے۔ اِن خطوط کی ابتدا میں شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

"نامعلوم مکتوب الیہ کے نام

یہ خط سید نعیم الحق صاحب کا عطیہ ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ شیخ محمد

عبداللہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ میری رائے ہے
کہ یہ کسی اور بزرگ کے نام لکھے ہوئے ہیں، کم از کم القاب و خطاب کے
پیش نظر میری رائے کی اشاعت کے بعد تصدیق ہو سکے گی۔ (مرتب)"

۱۹۷۳ء میں جب جگن ناتھ آزاد کشمیر یونیورسٹی کے لئے اقبال نمائش مرتب کر رہے تھے تو وہ یہ تینوں مطبوعہ خطوط لے کر میرے پاس پہنچے تھے۔ میں نے اِن خطوط کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا اور اُن سے کہا کہ "یہ خط میرے نام نہیں ہیں۔ میں اُس زمانے میں جیل میں تھا اور خطوط کے متن سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں خطوط ہم لوگوں کے مقدمے ہی سے متعلق ہیں لیکن میرے نام نہیں ہیں" یہاں یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت اِس لیے پیش آئی ہے کہ "اقبال نامہ" میں مندرج اِن تینوں خطوط کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ (۱۳) راقم کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خطوط مولوی محمد عبداللہ وکیل سرینگر کے نام لکھے گئے۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے۔

شیخ محمد عبداللہ بی۔ ایس۔ سی کے لئے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ لاہور آ کر حضرت علامہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اِس سلسلے میں وہ اپنی خود نوشت میں رقمطراز ہیں:

"میں اِن سے پہلی بار ۱۹۲۴ء میں ملا۔ جب میں لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ اِن کا دل کشمیر کے لئے تڑپتا تھا اور وہ اپنے سپرو ہونے پر ناز کرتے تھے۔ جب وہ کشمیر سے اپنی نسبت کا ذکر کرتے تھے تو مسرت سے اِن کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور اِن کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں نے تصور میں خاکہ بنایا تھا کہ اتنا بڑا آدمی بڑے ٹھاٹھ سے رہتا ہو گا لیکن جب اِن سے ملا تو پتہ چلا کہ وہ واقعی فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے اِس مصرعے کی تفسیر ہیں ؎

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

وہ چارپائی پر ایک سفید چادر پر بیٹھے ہوئے ہوتے اور کمرے میں ایک دو اور کرسیاں لگی ہوتیں۔ ہم آتے تو اپنے خاص خادم علی بخش کو کشمیری نمکین چائے لانے کے لئے کہتے۔ ہم کو غریب الوطنی میں اپنی اِس مرغوب چائے کی چاٹ پڑ گئی تھی اور ہم اِن کے پاس چائے پینے کے لئے اکثر جایا کرتے تھے۔ اِن کا جسم لاہور میں تھا اور روح کشمیر میں۔ تحریک کے آثار

چڑھاؤ میں ہم کو جو دقتیں پیش آتی تھیں، اِن کے سلسلے میں وہ ہمیں بڑے دانشمندانہ مشورے دیا کرتے تھے۔''[1]

اِس زمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

اُس وقت میں اسلامیہ کالج لاہور میں بی ایس سی کا طالب علم تھا اور میرے ذہن میں ابھی کشمیر کی آزادی اور مستقبل کا کوئی واضح تصور بھی نہیں تھا لیکن اقبال نے کشمیر کے درد کو محسوس کر کے اِس کی تقدیر بدل جانے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ کشمیری زبان کے مشہور شاعر غلام احمد مہجور کے نام اُن کا ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء کا لکھا ہوا ایک خط اِس قابل ہے کہ اِسے اِس دعوے کے ثبوت میں پیش کروں۔ علامہ اقبال مہجور صاحب کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھ رہے ہیں۔ میں کئی سال سے اِس کے لئے تحریک کر رہا ہوں، مگر افسوس کسی نے اِدھر توجہ نہ کی۔ اللہ آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ افسوس ہے کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اِس تباہی کا سبب زیادہ تر غیروں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی نیز مسلمانانِ کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ وادیِ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش و حفاظت کے لئے ایک سوسائٹی بنائیں''؟

اور خط کے آخر کی یہ سطور قابلِ غور ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عن قریب پلٹا کھانے والی ہے''

اِس خط کے ایک ایک لفظ سے کشمیر کے لئے اقبال کی دلسوزی، دردمندی اور محبت کا ایک شدید جذبہ نمایاں ہو رہا ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ۱۹۳۱ء میں، تحریکِ حریت کے آغاز میں، کلامِ اقبال سے بھرپور استفادہ کر کے ایک غلام قوم کا لہو گرمایا تھا۔ میں اپنی تقریروں میں اقبال کے حیات آفریں اور روح پرور اشعار کا بہ کثرت استعمال کرتا تھا اور غلامی کے اِس حوصلہ شکن اور مایوس کن دور میں سننے والوں کے دلوں میں آزادی اور انقلاب کی لہریں اُٹھتی تھیں۔ اس موقع پر کشمیر کی تاریخ اور تقدیر کے متعلق اقبال کے چند ایسے اشعار مجھے یاد آ رہے ہیں جن سے اُس زمانے میں ہم نے خوابیدہ

احساسات کو جگانے کا کام لیا:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

کہہ رہا ہے داستاں بیدردیِ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اُس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اقبال اِس سے براہِ راست وابستہ ہو گئے۔ کشمیر کمیٹی کے نام سے پنجاب میں اِس تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے جو کمیٹی بنی اقبال اِس کے سرگرم رُکن تھے۔ بعد میں وہ اس کمیٹی کے صدر بن گئے اور ہمارا اُن کے ساتھ گہرا رابطہ قائم ہوا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے، سیاست داں نہیں لیکن آزادی کی تحریک کو چلانے کے لئے اُنہوں نے ہماری صحیح رہنمائی کی اور وقتاً فوقتاً ہمیں مشورہ دیتے رہے۔" (۲)

حواشی

۱۔ آتش چنار ص ۳۰۔۳۱
۲۔ آتش چنار ص ۵۶
۳۔ آتش چنار ص۔ ۱۸۸
۴۔ اقبالنامہ ۱: ۳۹۶۔۳۹۷
۵۔ آتش چنار۔ ص ۲۷۰۔۲۷۱
۶۔ ایضاً۔ ص ۲۷۰
۸۔ آتش چنار۔ ص ۱۹۱۔ ۱۹۲
۹۔ اوراق گم گشتہ ۳۵۲۔ ۳۵۳
۱۰۔ اقبال کا فن ص ۱۵
۱۱۔ آتش چنار۔ ص ۲۲۶۔۲۲۹
۱۲۔ کشمکش ص ۱۸۹
۱۳۔ ایضاً ص ۲۱۵
۱۴۔ شیرازہ شیر کشمیر نمبر۲۶۔
۱۵۔ آتش چنار ص ۲۷۱
۱۶۔ اقبال کا فن ص ۱۲۔ ۱۳
۱۷۔ ایضاً ص۔۱۶۔۱۸

اقبالیات کا کشمیری مترجم

سید غلام قادر اندرابی

علامہ محمد اقبالؒ کے کلام کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے لیکن اِس عظیم فلسفی شاعر کا بیش بہا پیغام ابھی تک اِس کے ہم وطن کشمیریوں تک کماحقہ نہیں پہنچ سکا کیونکہ ان کی زبان اُردو اور فارسی سے الگ ہے۔ اگرچہ اِن کے کلام سے چیدہ چیدہ نظمیں جستہ جستہ ترجمہ ہو کر اخبارات، رسائل اور جرائد میں چھپتے رہتے ہیں لیکن وہ اتنے قلیل ہیں کہ اُن سے مفید نتائج کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

مقام مسرت ہے کہ جناب سید غلام قادر اندرابی نے یکے بعد دیگرے علامہ محمد اقبالؒ کے کلام کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ کر کے ریاست کے اُس پار علامہ کی کسی مکمل کتاب کا ترجمہ کرنے کا اعزاز اور فخر حاصل کیا ہے اور یہ کشمیریوں پر ایک احسان عظیم سے کم نہیں ہے۔ اُنہوں نے علامہ اقبالؒ کے اُردو شعری مجموعوں میں سے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم، فارسی مجموعوں سے پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ارمغانِ حجاز، جاوید نامہ، زبورِ عجم اور گلشنِ راز جدید کا کشمیری زبان میں منظوم مکمل کر دیا ہے۔ بالِ جبریل کے دو ایڈیشن اور پس چہ باید کرد کا پہلا ایڈیشن اندرابی صاحب نے خود دیئے ہیں۔ اقبال اکادمی لاہور سے بھی بالِ جبریل چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ ضربِ کلیم، جاوید نامہ، زبورِ عجم کی کتابت بھی ہو گئی ہے۔ غالباً "جاوید نامہ" طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

اِن کتابوں کے دیباچوں میں ڈاکٹر رشید نازؔ ریڈر شعبہ کشمیری کشمیر یونیورسٹی سرینگر

نے اندرابی صاحب کی انتھک کاوشوں کو سراہتے ہوئے انہیں ایک عظیم کارنامہ قرار دیا ہے۔ ترجمہ کو اصل کلام سے نزدیک تر اور کسی مجموعہ کا ترجمہ کرنے کی اسے پہلی کوشش تسلیم کیا ہے۔

ریاست کے ممتاز ادیب غلام نبی گوہر نے ترجمہ کی موزوں الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ایک اور کہنہ مشق عاشق اقبال مرزا غلام حسین بیگ عارف نے... اندرابی صاحب کی شان اور مصروفیات میں سے اِس ادبی کارنامہ کے لئے وقت نکالنے کا آنکھوں دیکھا حال درج کرتے ہوئے اُن کے استقلال۔ مزاج، ہمت مردانگی اور ترجمے کی مہارت پر داد دی ہے۔

"بالِ جبریل کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں اندرابی صاحب نے ابتدائی دور میں اپنا کلام مرزا عارف اور پروفیسر غلام محی الدین حاجنی کی نظر سے گزرنے کا جو تذکرہ کیا ہے۔ اِس کی تائید مرزا عارف کے پیش لفظ سے ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے اُردو اور فارسی کلام کو اُن کے ہم وطن بھائیوں تک اِن کی مادری زبان میں پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے اور بقول جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کہ اندرابی صاحب کے تراجم سے اقبالیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور اُن کا کلام قومی سطح پر حوصلہ افزائی کا مستحق ہے تاکہ یہاں لادینیت کی کشاکش میں کشمیری اپنا تشخص قائم رکھ سکیں۔

اِن تراجم سے نوجوان طبقہ فلمی دنیا کی فحش اور اخلاق سوز گیتوں سے نجات پاکر علامہ اقبال" کے درسِ خودی، خود اعتمادی، علمی جدوجہد، قرآن و حدیث کی روشنی میں دین کو پہنچانے، اور اپنے تشخص قائم رکھنے والے سبق آموز اشعار سے روشناس ہوگا۔

ترجمہ کی جو زبان اندرابی صاحب نے استعمال کی ہے وہ بقول عارف صاحب مناسب اور مروجہ ہے جس میں کسی قسم کا تصنع یا آورد نہیں ہے۔ رسم الخط جدید ہے اور اندرابی صاحب نے اپنی محنت اور قابلیت سے ترجمہ میں بھی علامہ اقبال" کے افکار و خیالات کی روح برقرار رکھی ہے اِس عظیم کارنامے پر اندرابی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

"بالِ جبریل" کے بارے میں خواجہ حمید ممتاز سیکریٹری تعلیمات آزاد کشمیر نے لکھا ہے کہ علامہ محمد اقبال" کے تراجم دنیا کے کئی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اِس کلام

کو کشمیری زبان میں ڈھالنے کا کام بتدریج ہوتا رہا ہے لیکن اب تک کتابی صورت میں صرف "اسرار خودی" کا مکمل ترجمہ شائع ہوا ہے اِس کے بعد اب سید غلام قادر اندرابی نے پانچ شعری مجموعوں کا منظوم ترجمہ کر کے اقبال شناسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اِن کے تراجم سے نہ صرف علامہ کے افکار و خیالات قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہو گی بلکہ اِن کی بدولت کشمیری زبان کی ترویج و ترقی کا ایک اور مرحلہ طے ہو گا۔

فاضل مترجم اندرابی صاحب نے اپنے تراجم میں نہ صرف اصل کلام کے مفہوم کو برقرار رکھا ہے بلکہ قافیہ اور ردیف کی موزونیت سے کلام اقبال کی نزاکت کو مناسب جلا بخشی ہے۔ اِس سے کشمیری زبان کی ہمہ گیر صلاحیت اور وسعت بھی اُجاگر ہوتی ہے۔ اکثر اشعار میں اصل اور ترجمہ میں مماثلث کسی حد تک کامیابی سے حاصل کی گئی ہے۔

عصر جدید میں جتنی اہمیت علامہ اقبالؒ کے فکر و فن کو حاصل ہوئی ہے اتنی کسی اور مفکر اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علامہ اقبالؒ کے افکار و اشعار نے پورے عالم انسانیت کو متاثر کیا ہے اور اِن کے نظریات سے اختلاف رکھنے والوں نے بھی اِن کے شاعرانہ محاسن اور فکر کی گہرائی کو سراہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلامِ اقبال جہاں انسان کو حسن و جمال، مناظر فطرت اور روحانی سکون سے نوازتا ہے، وہاں زیر دستوں اور محکومی و مقہوری سے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے مژدۂ جانفزا بھی ہے۔

عہد اقبال بلاشک و شبہ عالمی تحریکات، جنگ و جدل، آزادی کی طلب اور فکری و نظریاتی تحریکوں سے عبارت رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس دور کے بدلتے ہوئے ہر لحظہ سے باخبر رہے اور اُنھوں نے عہد رفتہ کی عظمتوں کو بھی پیش نظر رکھا اور آنے والے سنہرے دور کی نشاندہی بھی کی جس کی شہادت اِن کی نثری اور شعری تحروں سے مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں اقبالؒ نسل انسانی کے ایک مفکر ہی نہیں ایک مصلح اور نجات دہندہ کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جیسے کسی مسافر کو شجر سایہ دار مل جائے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کی عالمی مقبولیت بتاتی ہے کہ جب اُنھوں نے یہ کہا تھا کہ:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

تو غلط نہ کہا تھا بلکہ اپنی بین الاقوامی شخصیت کا اظہار کیا تھا۔ علامہ اقبال اِس اعتبار سے بے

حد خوش نصیب تھے کہ اِن کے کلام دلنواز کا ترجمہ اِن کی زندگی میں ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ انگریزی، فارسی، عربی اور جرمنی زبانوں کے تراجم کو تو اولیت رہی۔

قیامِ پاکستان کے بعد کلامِ اقبال" کے تراجم علاقائی زبانوں میں ہوئے۔ چنانچہ پشتو، سندھی، پنجابی اور بلوچی کے علاوہ ہندی اور تامل زبانوں میں بھی کلامِ اقبال" کے ترجمے ہوئے اور فکر و فنِ اقبال نے اِن زبانوں کی شاعری پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے۔

کلامِ اقبال" کا اب کشمیری زبان میں بھی ترجمہ کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اِس سلسلے میں اولیت کا سہرا جناب ناز کولگامی کے سر باندھنا چاہئے۔ جنہوں نے سب سے پہلے "اسرارِ خودی" کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا اور خوب کیا۔ ناز کولگامی ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ چنانچہ اِن کے کشمیری ترجمہ میں وہ روح موجود ہے جو اوریجنل کتاب میں موجزن ہے۔ "اسرارِ خودی" کا کشمیری ترجمہ کشمیری حلقوں میں بے حد مقبول ہوا اور اِسے بے حد سراہا گیا۔

دوسرے نمبر پر طاؤس بانہالی ہیں جو علامہ اقبال" کے کلام کو کشمیری زبان کے قلب میں ڈھالتے ہیں اور خود بھی اُردو اور کشمیری زبان کے مانے ہوئے شاعر ہیں۔

مقبوضہ کشمیر میں کلامِ اقبال کے کشمیری تراجم کا کام تیزی سے جاری ہے اور بہت سے شعرائے کرام نے علامہ اقبال" کی کتابوں کو کشمیری زبان میں ڈھالنے کا کام سنبھال رکھا ہے۔ اِس سلسلہ میں سید غلام قادر اندرابی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُنہوں نے بالِ جبریل کا مکمل منظوم کشمیری ترجمہ کیا ہے۔ اِس کتاب کو سرینگر میں محمد شفیع نے شائع کیا ہے۔ سرورق پر علامہ اقبال" کی تصویر ہے۔ پس منظر میں شاہین ہے اور علامہ اقبال کے ہاتھ میں قلم ہے۔ یہ کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فاضل مترجم کو داد دینی چاہئے کہ اُنہوں نے ترجمہ کے لئے علامہ اقبال کی وہ کتاب منتخب کی ہے جو بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

"... اِن کے اُردو کلام میں منفرد حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اُردو میں یہ تصنیف اِن کے فکر و فن کا بہترین نمونہ ہے۔"

بالِ جبریل کے کشمیری ترجمہ کو اہلِ کشمیر نے جن تحسین بھری نظروں سے دیکھا ہے اِس کا پتہ اِن آراء سے چلتا ہے جو کشمیری دانشوروں نے دیں۔ اِس ضمن میں شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے لکھا تھا:

"... علامہ اقبال کے نگینۂ دل پر کشمیر کا نام اِس قدر نقش تھا کہ اِس کی چوٹ اِن کے کلام ہی کیا، ساری زندگی پر پڑتی ہے۔ انہوں نے کشمیر کو پہلی بار اِس کے خوبصورت ماحول کے طفیل کی حیثیت سے نہیں بلکہ مظلوم انسانوں کی حیثیت سے دیکھا اور اِن کے حالات پر دردمندی اور دلسوزی سے اظہارِ خیال کیا۔ بالِ جبریل کے نغموں کی تخلیق کا زمانہ وہ ہے جب وہ کلام کے علاوہ عمل سے بھی کشمیر کی جدوجہد آزادی کے شعلوں کو بھڑکا رہے تھے۔ اِن کے نفس سے کشمیر میں آتشِ گل تیز تر ہوئی اور اِس آگ میں کشمیریوں کو پہنائی گئی زنجیریں پگھل کر رہ گئیں۔ یہ بہت مناسب بات ہے کہ بالِ جبریل کو کشمیری زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔"

اگرچہ اِس سے پہلے بھی اقبال کے کلام کو جستہ جستہ کشمیری زبان میں منتقل کیا جاتا رہا ہے، لیکن میری دانست میں یہ پہلی بار ہے کہ جب اِن کی کسی پوری تصنیف کو کشمیری زبان کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اِس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کشمیری زبان اب قدرتِ اظہار کی اِس منزل تک پہنچ گئی ہے جہاں اِس پیمانے میں اِن کے نفاستِ خیال اور نزاکتِ بیان کی صہبا انڈیلی اور سنبھالی جا سکتی ہے۔ ترجمے میں اصل فن پارے کی فضا اور کیفیت پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اِس کے باوجود مترجم سید غلام قادر اندرابی نے اپنا شوق قابلِ قدر انداز میں سنبھالا ہے۔ اِن کی یہ کوشش اقبالؒ کے مداحوں کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان کے قدر دانوں کے لئے ایک بہت دلنواز مداح کی حیثیت رکھتی ہے۔"

مرحوم شیخ محمد عبداللہ کو یہاں پر ایک مغالطہ ہوا ہے۔ وہ یہ کہ علامہ اقبالؒ کی کسی پوری تصنیف کو کشمیری زبان کا جامہ پہلی بار پہنایا گیا ہے جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ اِس سے پیشتر ناز کو لگامی "اسرارِ خودی" کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب پاکستان میں طبع ہوئی تھی اِس لئے مقبوضہ کشمیر کے عوام اِس سے آگاہی حاصل نہ کر سکے۔ بہرنوع یہ حقیقت ہے کہ سید غلام قادر اندرابی کے ترجمہ کو کشمیر میں بہت پسند کیا جا رہا ہے اور کشمیری خواں طبقہ میں یہ تصنیف مقبول ہو رہی ہے اِس سلسلہ میں غلام نبی گوچک نے

درست لکھا ہے کہ:

"... بال جبریل کا کشمیری میں منظوم ترجمہ کر کے قوم کی خاطر اقبالیاتی ادب میں اضافہ کر کے ادب نوازی اور عوام دوستی کا فرض سنبھالا ہے۔ علامہ اقبال کا فکر و فن آج تک صرف اردو خواں طبقہ تک ہی محدود رہا ہے۔ اِس ترجمہ سے یہ امید بندھ جاتی ہے کہ کشمیری زبان جاننے والے بلا امتیاز مذہب و ملت علامہ اقبال کے پیغام کو سمجھنے اور اِس پر عمل پیرا ہونے میں آسانی اور سہولت محسوس کریں گے۔"

اندرابی صاحب کے ترجمہ کو اشاعت سے قبل ممتاز کشمیری شاعر اور ادیب پروفیسر محی الدین حاجنی اور جناب عارف بیگ نے بھی دیکھا ہے، یعنی یہ ترجمہ اشاعت سے قبل دو مستند ادیبوں کی نظروں سے گزرا ہے جنھیں کشمیری زبان اور ادب پر اتھارٹی مانا جاتا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بال جبریل کا ترجمہ مقبوضہ کشمیر میں صرف کشمیری زبان میں ہی نہیں ہوا ہے بلکہ اِس عظیم کتاب کو سنسکرت زبان کے قالب میں ڈھالا جا چکا ہے۔ اِس سے پیشتر علامہ اقبال کے جستہ جستہ کلام کا پہلا سنسکرت ترجمہ "اقبال کا دیہ درشن" کے نام سے سرینگر میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مترجم ایک کشمیری پنڈت موتی لال پشکر ہیں اور بقول محمد یوسف ٹینگ سیکرٹری جموں و کشمیر کلچرل اکادمی —— "کہ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ اقبال پر بعض سنسکرت شعراء کا گہرا اثر تھا۔ اُنھوں نے وید مقدس کے گائیڈ متر کا منظوم اُردو ترجمہ کیا اور بالِ جبریل کے اندرونی ورق پر سنسکرت کے مشہور شاعر بھرتری ہری کا شعر ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال' کا یہ سنسکرت زبان میں پہلا ترجمہ ہے۔ اِس کتاب کے مقدمہ میں موتی لال پشکر نے لکھا ہے کہ:

"سنسکرت عروض اور بحروں میں اقبال کی اصل منظومات کی بحریں یوں سمو گئیں جیسے یہ اِن کے لئے بنائی گئی ہوں۔"

پنڈت موتی لال پشکر کا خیال ہے کہ اِس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اقبال سنسکرت کے صوتی نظام اور عروض سے واقف ہے اور ساری ہندی شاعری میں اقبال کے سے تنوع اور رنگارنگی کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ بال جبریل کے سنسکرت ترجمہ کا سرنامہ ڈاکٹر کرن سنگھ سابق والئی ریاست جموں و کشمیر نے لکھا ہے اور انہوں نے اقبال کو بیسویں صدی کے اعلیٰ ترین دانشوروں اور شاعروں میں شمار کیا ہے۔

کلامِ اقبال کے کشمیری اور دیگر زبانوں میں تراجم اِس دور میں بے حد ضروری ہیں کیونکہ علامہ اقبال نے کشمیری عوام کی جس مظلومی اور محکومی کے خلاف آواز بلند کی تھی وہ حالت آج بھی مقبوضہ کشمیر میں جاری ہے، اور جس آتش گل نے کشمیری عوام میں حرکت و توانائی پیدا کی اِس کو ابھی مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ آج بھی کشمیریوں کے لئے اقبال کا کلام حیاتِ تازہ سے کم نہیں ہے۔ کشمیر پر بھارت کا قبضہ ہے اور کشمیری ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی میں پھنس چکے ہیں اور ان کے حق خود ارادیت کا مسئلہ بین الاقوامی سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اِس لئے ضروری ہے کہ کشمیری اپنی خودی کو پہچانیں اور افغانوں کی طرح میدانِ کارزار میں اُتر آئیں اور غلامی کے اندھیروں کو ختم کر دیں۔ موجودہ حالات میں کشمیریوں کی نئی نسل کو آزادی اور حریت سے آشنا کرنے کے لئے کلامِ اقبال ایک بہت بڑا وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔

شعرائے مقبوضہ کشمیر کا علامہ اقبال کو خراج عقیدت

علامہ اقبال ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کا انداز فکر و نظر آفاقی اور عالمگیر تھا اور اِن کا پیغام پورے عالم انسانیت کے لئے تھا۔ یہ درست ہے کہ اِن کے مخاطب ملت بیضا کے افراد تھے مگر انہوں نے دیگر مذاہب و ادیان کے پیروکاروں کو بھی دعوت عمل دی اور اِن کے پیشواؤں اور بزرگوں کی روحانی خدمات کو سراہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کلام اقبال میں اگر سوامی رام تیرتھ کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے تو دوسری جانب گورو نانک دیو جی کو بھی نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے یعنی جہاں بھی کسی دوسرے مذہب کے رہنما کا ذکر آیا ہے علامہ اقبال نے اِس کو عزت و احترام بخشا ہے جو کہ علامہ اقبال کے صحیح الذہن اور بامروت مفکر ہونے کی ایک دلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کو ملت بیضا کے افراد کے علاوہ دیگر اقوام نے بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے اور عصر جدید کی کوئی قوم ایسی نہیں جس نے فکر اقبال سے خوشہ چینی نہ کی ہو۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ متمدن اور ترقی پذیر قسم کے ممالک میں علامہ اقبال یکساں طور پر ہردلعزیز ہیں تو مبالغہ نہ ہو گا۔ حال ہی میں سوویت یونین میں علامہ اقبال کے فکر و فن پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ حالانکہ فکر اقبال اور فکر مارکس میں گہرا بعد ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے زمانہ حال میں سب سے زیادہ پذیرائی اگر کسی مفکر اور شاعر کو حاصل ہے تو وہ صرف علامہ اقبال ہیں تو غلط نہ ہو گا۔

علامہ اقبال کے آباؤ اجداد خطہ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ خود علامہ اقبال کو اپنے کشمیری ہونے پر فخر و ناز تھا مگر اِس حب وطن کے باوجود علامہ اقبال نے عالمگیر اخوت اور

محبت کے گیت گائے اور پوری انسانیت کو مرکز توحید کی جانب پکارا اور سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی دعوت حق ان کی پر انوار شخصیت اور سیرت کا تابع بنانے کی تحریک کی اور اس عشق میں یہاں تک آگے بڑھے کہ خود خالق کائنات کی زبان سے یہ کہلوایا ۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

چنانچہ امت مسلمہ کا فرد جہاں کہیں بھی ہے اس کے فکر و عمل کا سرچشمہ قرآن حکیم اور آنحضرت ﷺ کی ذات مقدس ہے چونکہ اقبال اس سرچشمہ علم و عرفان کے مبلغ ہیں اس لئے جب فکر اقبال اور شعر اقبال کا تذکرہ آتا ہے تو ذہن و قلب خود بخود خدا تعالیٰ اور رسول عربیؐ کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔

علامہ اقبال کی دوسری حیثیت پسماندہ مقہور و مجبور اور آزادی و خوشحالی سے محروم انسانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ کی ہے اُنہوں نے نہ صرف اپنے کلام دلنواز میں ان دکھی انسانوں کی اذیتوں کا رونا رویا ہے بلکہ ان کو درس عمل بھی دیا ہے اور آزادی حاصل کرنے کے گر بھی بتائے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف ہندی مسلمانوں کی محکومی و مظلومی کے خلاف جہاد کرتے ہیں تو دوسری جانب دنیائے عرب کا اتحاد و اشتراک ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ رہا اُنہوں نے "او غافل افغان" بھی کہا اور کشمیریوں کو "محکوم و مجبور" بھی کہا۔ اِن کے کلام کا ایک حصہ اہل کشمیر کے لئے وقف ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ علامہ اقبال نے کشمیریوں کی غلامی کے خلاف تحریک جاری کی اور اس میں پیش پیش رہے مگر پون صدی گزر جانے کے باوجود کشمیری ابھی تک غلامی و محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ بجا کہ اِن کی جدوجہد سے ریاست کا ایک حصہ آزاد ہو چکا ہے اور وہاں آزاد کشمیر حکومت قائم ہے مگر ریاست کے ایک بڑے حصہ پر ہنوز اغیار کا قبضہ ہے اور اس قبضہ کو ختم کرنے کے لئے کشمیری عوام کوشاں ہیں۔

علامہ اقبال صرف آزاد کشمیر میں ہی ہرلعزیز نہیں، مقبوضہ کشمیر میں بھی اِن کا تذکرہ بڑی چاہت اور خوشی سے کیا جاتا ہے اور وہاں پر "اقبالیات" پر بہت کام بھی ہو رہا ہے یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہو گی۔ کہ علامہ اقبال کا فارسی کلام اُردو کلام کی نسبت

وادی کشمیر میں زیادہ مقبول ہے۔ اس کی ایک وجہ ایک تو یہ ہے کہ وہاں ابھی تک فارسی دان حضرات موجود ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ ذہنی سطح پر کشمیریوں کو اقبال کا فارسی کلام زیادہ پُرکشش معلوم ہوتا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں علامہ اقبال کے پیغام اور شخصیت پر کام جاری ہے۔ وہاں پر مقیم اُردو کے مشہور شاعر و محقق جگن ناتھ آزاد نے "اقبال اور کشمیر" کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اور اس میں اپنے نقطۂ نظر سے اقبال کو خراج تحسین کیا ہے اس کتاب کی اشاعت نے بحث و مباحث کے کئی در کھول دیئے ہیں جس سے اقبالیات کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی ایک رسالہ "شیرازہ" کے نام سے نکالتی ہے اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر اس رسالہ نے نہایت ہی دیدہ زیب نمبر نکالا جس میں اقبالیات کے موضوع پر اچھے مقالات تھے اور اقبال کے پیغام کو کشمیری فن کاروں نے موقلم سے کینوس پر بھی اُتارا ہے۔ ایک حصہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل تھا۔ زیر نظر مضمون میں "ہم شیرازہ کے اقبال نمبر" کی بعض ان نظموں کو درج کر رہے ہیں جو کشمیری شاعروں نے اقبال کے حضور لکھی ہیں۔

سب سے پہلے ہم میر غلام رسول نازکی کا کلام درج کریں گے۔ نازکی صاحب ریاست کے مشہور شاعر، ادیب اور محقق ہیں وہ فارسی، اردو اور کشمیری کے صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کا سماجی اور علمی و ادبی حلقوں میں بڑا نام ہے اکثر کشمیر اور بیرون کشمیر کے اخبارات میں لکھتے ہیں۔

اقبال کے تین اشعار پر "تضمین" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

میں جانتا تھا کہ ہے عرصہ حیات مصاف
ہر ایک ذرہ تھا شعلہ، سنگ رہا تھا مطاف
اسی سبب سے تھا پیر حرم بھی میرے خلاف
کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف
یہ اجنبی سے نہیں تجھ سے ہو رہا ہے خطاب

کہ اب اپنے عمل کا اسی جہاں میں حساب
یہی ہے جانِ تمنا یہی ہے کار ثواب
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

میر غلام رسول نازکی، علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح ہیں بلکہ انہوں نے علامہ اقبال کو کشمیری زبان کے قالب میں ڈھالا ہے اِسی شمارہ میں اِن کی ایک غزل اقبال کے تتبع میں شائع ہوئی ہے اور وہ یوں ہے۔

فسانہ ہے غم مجنوں و تیشہ فرہاد
جمال درست ہے رنگین ہے عشق کی روداد
لسان شعلہ نہ لپکے گا تو اگر تیری
مثال قطرہ شبنم سرشت ہے افتاد
میرا خلوص میری معصومیت میں شامل تھا
ہے تیرے زہد سے پاکیزہ تر مرا الحاد
وہ ایک نگاہ کرم اک ہوا کا جھونکا تھی
ذرا سی راکھ کی چٹکی تھی ہو گئی برباد
میں اِس قیامت کبریٰ کا ساتھ دے نہ سکا
کرم ہے کہ ستم تیری لذت ایجاد
غزل ہوتی ہے یہ اقبال کی لے میں
بڑی عظیم جسارت ہے پرچہ باد آباد

صوفی سہیل کشمیری بھی اُردو گو شاعر ہیں۔ عہد حاضر کے شاعروں میں بہت معروف ہیں کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اقبال کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

خواب میں تھی زندگی، سویا پڑا تھا ہر ضمیر
گھٹ چکی تھی چاندنی تھی تیرگی آفاق گیر

آدمی کا ذہن مرکوز مضمون فکر تھا
حق و بے باکی بھی تھی نظم فرنگی کی اسیر
ظلمت شب مٹ گئی آفاق روشن ہو گیا
نوع انسان کی ملی پھر سے حیات بے نظیر

نشاط کشتواڑی ریاست کے مشہور شاعر ہیں۔ اِن کا تعلق ریاست کے ایک دور افتادہ علاقہ سے ہے مگر اِن کا کلام اُردو خواں طبقوں میں خاصا ہر دلعزیز ہے۔ یہ بھی علامہ اقبال کے شیدائیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اِن کی نظم و خراج عقیدت کے چند شعر حاضر خدمت ہیں۔

آفریں علم و ادب ملک سخن کے تاجدار
آفریں اے حکمت و دانش وری کے شہریار
کیا کروں میں تیرے اوصاف حمیدہ کا بیان
کیا بتاؤں اہل عالم کو میں تیری خوبیاں
دل ترا بغض و تعصب سے ہمیشہ پاک تھا
تیرا سینہ درد انسانی سے ہر دم چاک تھا
تیرے مداحوں میں شامل ہے نشاط خوشنوا
اے مکین جنت الفردوس اے مہر ضیاء
وہ خودی کا فلسفہ اے شاعر مشرق ترا
تاج ہے انسانیت کا اے خودی کے ناخدا
آج یہ صد سالہ تقریبات تیری یاد میں
سب منائے جائیں گے اِس گلشن آباد میں

پروفیسر حامدی کشمیری اُردو کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ علامہ اقبال کے فکر و فن پر کئی مقالات رقم کر چکے ہیں۔ کشمیری، شاعروں اور افسانہ نگاروں میں اِن کا مقام بہت بلند ہے۔ اپنی غزل میں کہتے ہیں۔

نگل بھی لے کوئی موج بلا تو کیا غم ہے
ہے صرف ہوا یہ رقم مری روداد

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ علامہ اقبال کے کشمیری شاعروں اور ادیبوں سے گہرے تعلقات استوار تھے۔ کشمیری زبان کے مشہور شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور کی تو حضرت علامہ اقبال سے باقاعدگی خط و کتابت تھی۔

علامہ اقبال نے اِنہیں کشمیری شاعروں کا تذکرہ لکھنے کی تحریک کی تھی اور یہاں یہ بتانا بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ کشمیر میں جب سیاسی اجتماع ہوتے ہیں تو ان کا آغاز تلاوت قرآن کریم کے بعد کلام اقبال سے ہوتا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ تو اپنی ہر تقریر میں اقبال کے اشعار پڑھتے تھے۔ یعنی اقبال ہر دور اور ہر عہد میں کشمیری عوام کے محبوب ترین شاعر اور راہنما رہے ہیں اور رہیں گے۔

اقبال اکادمی پاکستان